# رشحاتِ ایّام

سیّد رسول پونپُر

نام : سید غلام رسول بن سید غیاث الدین احمد
قلمی نام : سید رسول پونپر
جائے ولادت: حسن پورہ بجبہاڑہ کشمیر ۲۴؍۱۹۲۱
سال ولادت: مارچ ۱۹۴۰ء
تعلیم : ایم۔اے فارسی، کامل کشمیری، ادیب کامل اور منشی فاضل۔

تصنیفات: بہٕ گبو کیٛتھ؟ میں کیسے گاؤں۔ شاعری۔۱۹۶۲ء ۔۲۔ سفید سنگر۔ سفید چوٹیاں۔ شاعری۔۱۹۸۳ء۔۳۔ باوتھ تہٕ علامتھ: ابلاغ اور علامت (تحقیق وتنقید) ۱۹۸۴ء سوویت لینڈ نہرو اوراڈ یافتہ: ۱۹۸۶ء۔۴۔ یتھ آدٕمی ونس منز: آدم کے اس جنگل میں۔ انشایئے ۱۹۸۶ء۔۵۔ ووٕنی کورگوژھ؟ اب کدھر جاؤں؟ افسانے ۱۹۸۶ء۔۶۔ پرانہٕ وار: ترجمہ راجندر سنگھ بیدی کے اُردو، ناول: ایک چادر میل سی کا ۱۹۸۵ء: ساہتیہ اکادمی ترجمہ انعام یافتہ ۱۹۹۱ء۔۷۔ ختہٕ: شاعری: ۱۹۸۸ء، ریاستی کلچرل اکیڈیمی انعام یافتہ: ۱۹۹۰ء۔۸۔ پرتو بچوں کے لئے نظمیں اور ترجمے ۱۹۸۹ء۔۹۔ کینہٕ نتہٕ کینہٕ۔ کچھ نہ کچھ۔ انشایئے۔ ساہتیہ اکادمی اوارڈ یافتہ۔ ۱۹۹۳ء۔۱۰۔ میزان۔ تحقیق وتنقید ۱۹۹۴ء ۔۱۱۔ کأشرس ادبس منز طنز تہٕ ظرافت: کشمیری ادب میں طنز اور ظرافت: گلدستۂ تخلیقات: برائے کشمیر یونیورسٹی ۱۹۹۸ء ۔۱۲۔ حضرت شیخ العالمؒ کے سید خلفاء ۱۹۷۸ء: اُردو تحقیق۔۱۳۔۱۷: برائے ساہتیہ اکادمی نئی دہلی۔

☆ اَزیک کأشُر ابسے : آجکا کشمیری انشائیہ ۱۹۹۶ء
☆ عبدالستار رنجور : مونوگراف ۱۹۹۶ء

کشمیر: کشمیری ادب وثقافت پر

تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ

# رشحاتِ ایّام

سید رسول پونپرؔ

55۔ سیکاپ روڈ۔ بجبہاڑہ کشمیر۔ 192124

©: جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب ............ رشحات ایام

مصنف ............ سیدرسول پونپرؔ

پہلا ایڈیشن ............ ۲۰۰۱ء

تعداد ............ ۵۰۰: پانچ سو

قیمت ............ ۱۸۳: ایک سو تریاسی روپے

سرورق ............ جی۔ احمد

کمپیوٹر کمپوزنگ ............ محمد یوسف میر (ولی دارالکتابت محمودآباد ٹینگن)

مطبع ............ جے۔ کے آفسٹ پرنٹرز دہلی۔ ۶

**اعتراف:۔**

یہ کتاب قومی اُردو، کونسل برائے فروغِ اُردو زبان
کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

کتاب ملنے کا پتہ:

☆ کتاب گھر۔ کلچرل اکیڈیمی۔ مولانا آزاد روڈ۔ سرینگر کشمیر ۱۹۰۰۰۱

☆ کتاب گھر۔ کلچرل اکیڈیمی۔ کنال روڈ جموں۔ ۱۸۰۰۰۱

☆ سیدرسول پونپر۔ ۵۵ سیکاپ روڈ۔ بجبہاڑہ کشمیر ۱۹۲۱۲۴

# ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ٥ | پیشِ کلام : محمد یوسف ٹینگ | ۵ - ۹ |
| ۱ | اپنی بات | ۵ |
| ۲ | کشمیر کی تاریخ کے ماخذ | ۹ |
| ۳ | کشمیری زبان: مختلف ادوار اور جہتیں | ۳۸ |
| ۴ | لل دید اور اُسکا زمانہ | ٦۸ |
| ۵ | لل دید: فلسفۂ حیات | ۸۰ |
| ٦ | لل دید اور روحِ عصر | ۹٦ |
| ۷ | لل دید اور عصرِ جدید | ۱۱۰ |
| ۸ | شیخ العالمؒ شیخ نور الدین ولیؒ: شخص وفن | ۱۲۴ |
| ۹ | ریشیت اور رہبانیت | ۱۵٦ |
| ۱۰ | راجہ میگھواہن | ۱٦٦ |
| ۱۱ | عبدالاحد آزاد | ۱۷٦ |
| ۱۲ | مکتوباتِ مہجور | ۲۰۲ |
| ۱۳ | مہجور کی شاعری اور عصری سیاست | ۲۲۲ |
| ۱۴ | اقبال اور کشمیری شاعری | ۲۳۳ |
| ۱۵ | شوریدہ کشمیری: ایک صاحب فکر شاعر | ۲۴۵ |

| | | |
|---|---|---|
| ۱۶ | کشمیری لوک گیت: ایک اجمالی جائزہ | ۲۶۹ |
| ۱۷ | کشمیر: اؤ کانگ کی نظر میں | ۲۷۶ |
| ۱۸ | مثنوی تاریخ الانبیاء | ۲۸۱ |
| ۱۹ | کشمیر کے میلے اور تیوہار | ۲۹۵ |
| ۲۰ | پروفیسر سری کنٹھ توشخانی | ۳۲۰ |
| ۲۱ | جہانگیر اور کشمیر | ۳۳۴ |
| ۲۲ | ہر گوپال خستہ | ۳۴۹ |
| ۲۳ | کُندن لال سہگل | ۳۶۶ |
| ۲۴ | مِس میلنسن | ۳۸۲ |
| ۲۵ | تعمیر: انتخاب نمبر | ۳۸۸ |

# پیش کلام

میرے عزیز دوست سید رسول پونپر کو اپنی مادری زبان کشمیری میں چند خاص امتیاز حاصل ہیں۔ وہ تادم تحریر اس زبان کے واحد ادیب ہیں جنہیں ساہتیہ اکادمی کے دو اوارڈ حاصل ہوئے ہیں۔ ایک تخلیقی ادب کے لئے اور دوسرا ایک مشاق مترجم کی حیثیت سے۔ وہ کشمیری کے شاعر بھی ہیں اور انشائیہ نگار بھی، محقق، مبصر اور تنقید نگار بھی۔ وہ اپنے زمانے میں کشمیری زبان کے مقتدر قلم کاروں کی پہلی صف میں مسند نشین ہیں اور اُن کی شایع شدہ کتابوں کی تعداد درجن بھر سے تجاوز کر گئی ہے۔ لیکن نہ اُن کے ذوق میں دھندلا پن آیا ہے اور نہ اُنکی جستجو مدھم ہوئی ہے۔ ان کی زیر نظر کتاب اگرچہ اُردو میں ہے لیکن یہ بھی اس ادبی ابن السّبیل کی تیز گامی کا ہی ایک پیرایہ ہے اس نسبتاً ضخیم کتاب میں شامل مقالات کے متن و میزان پر بات کرنے سے پہلے میں اپنا یہ تاثر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ان میں سے اکثر اگرچہ میری نظر سے پہلے بھی گذر چکے تھے۔ لیکن اُن کو ایک مسلسل جلد کے البم میں پیوست دیکھ کر مجھے خاصی خوشگوار حیرت ہوئی۔ پونپر صاحب کو اُردو زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ جسکا اندازہ اُس شستہ اور شائستہ طریقہ اظہار کو دیکھ کر ہوتا ہے جس میں وہ خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ بیانیہ قسم کے موضوعات کے علاوہ اُنہوں نے ایسے معاملات پر بھی خیال آرائی کی ہے۔ جو گہری فکر کے علاوہ اظہار کی زبان پر خاصا دباوٗ ڈالتے ہیں لیکن اُنہوں نے کہیں اپنی روانی اور برجستگی کو قربان نہیں کیا ہے

اور کسی زبان پر حاکمی کا اس سے منہ بولتا ہوا ثبوت اور کیا ہوگا۔ مجھے یہی بات یہ اُمید کرنے پر اُکساتی ہے کہ اس کتاب کو وسیع پذیرائی ملے گی اور یہ اپنے معانی و مفاہیم سے اپنے پڑھنے والوں کو سیراب و سرشار کرے گی۔

کشمیر اب ایک صدی سے خصوصاً لکھنے والوں کے مرغوب آماج گاہ اور کسی حد تک چراگاہ بن گیا ہے۔ اس کے ظاہری حُسن اور اِس کے سیاسی طلاطم نے اِسے مصنفین ،مؤرخین اور مرتبین کا بڑا سود مند موضوع بنایا ہے۔ لیکن یہ بات تعجب انگیز ہے کہ کشمیر کی آتما یعنی اس کے ادب، اسکی مستند فکری علامتوں اور اس کے لوک ادب کو یا تو کلیتاً نظر انداز کیا جاتا ہے یا اُنکو اُس سرسری انداز سے نپٹایا جاتا ہے کہ یہ مصرع ذہن میں ٹمٹمانے لگتا ہے۔

اہل ثروت جیسے دیتے ہوں غریبوں کو زکوٰۃ

مگر پونپر صاحب کشمیر کی صالح روایات کے خوردہ اور پروردہ ہیں۔ اس لئے وہ ان کی اصل خوشبو، یعنی اس کے باطن کے منظرنامے، کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں یہ امر واقعی بہت رنج دہ ہے کہ جہاں کنڑ جیسی زبان میں لل دید پر کوئی ایک درجن سے زیادہ تصنیفات شایع ہوچکی ہیں۔ جن میں وہاں کی عدالت عالیہ کے ایک سابق چیف جسٹس کی کتاب بھی شامل ہے۔ وہاں اُردو جیسی ہمدم و دمساز زبان میں ایک آدھ سے زیادہ کتاب ہی اس اہم موضوع پر دستیاب نہیں۔ پونپر صاحب کی اس کتاب کی اس سے بڑی افادیت کیا ہوگی کہ اگرچہ یہ لل دید پر ایک الگ تصنیف کی حیثیت نہیں رکھتی۔ لیکن اس میں اس موضوع پر چار سے زیادہ مضامین موجود ہیں۔ جو کشمیری زبان کی اس ہمالیائی چوٹی کا نظارہ اُردو قاری کے بہت کشادہ کرتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے کشمیر کی تاریخ

ادب ادبیاب کے جن دوسرے گوشوں کو آشکار کیا ہے ۔ اُنکی شناسائی اُردو میں نہ ہونے کے برابر تھی ۔ راجہ میگواہن ، کُندن لال بھگل ، جہانگیر اور کشمیر، ہرگوپال خستہ وغیرہ اسکے چند نمونے ہیں ۔ اُنہوں نے کشمیری لوک ادب اور کشمیر کی منفرد ریشی تحریک کے بارے میں مختصر مگر معنی خیز باتیں کی ہیں ۔ جن سے ان موضوعات کے متعلق زیادہ جاننے کی پیاس اور بڑھ جائے گی اور یہ کوئی چھوٹا کارنامہ نہیں ہے اِس مختصر سے تعارف میں اجمال کو تفصیل دینے کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ کہنے کے بغیر میں اُن کے ساتھ ناانصافی کا مرتکب ہوجاؤ نگا کہ اُنہوں نے بڑی خوش نظری اور خوش فکری سے بہت جرائت آموز باتیں کی ہیں ۔ اُن کا یہ بیان کہ لل دید کا کلام ہمارے لئے لوک ادب کا درجہ رکھتا ہے ۔ ایک تہہ دار انکشاف ہے ۔ لوک ادب اس لئے کہ یہ اس ادب کی خصوصیات کی طرح آج سینکڑوں سال سے ہماری زبانوں کے پتواروں سے ہمارے اجتماعی شعور کے چشمے میں رواں دواں ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اسکی مستند لفظیات پر وثوق سے ابھی تک حتمی بات نہیں کی جاسکی ہے ۔ اسی طرح اس بنیادی اہمیت کے موضوع پر اُنکا یہ کہنا کہ لل دید کے کلام کو اسلامی تصوف اور شیوازم ، کا حسین امتزاج قرار دینے کی بجائے بھگتی تحریک سے منسلک کرنا زیادہ صحیح ہے، بھی پامال دعوؤں پر کاری ضرب لگاتا ہے اور ہمارے لئے اس تہذیبی متاع کے کھنگالنے کی بہتر سمت متعین کرتا ہے اسی طرح کشمیر میں اسلام کے قبولِ عام کو حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کے کشمیری زبان سے بھی جوڑنا ہر لحاظ سے معقول اور مدلل ہے ۔ قاری کو اس کتاب کے الگ الگ مضامین میں ایسی بہت سی بصیرتیں ملیں گی ۔ جو بیانیہ کے بہاؤ میں اگرچہ برجستگی سے فراہم کی گئی ہیں ۔

لیکن گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہونے کے علاوہ عمیق تر مطالعے کے دروازے وا کرتی ہیں۔

رسول پونپر نے یہ مضامین بڑی عرق ریزی اور محنت سے لکھے ہیں۔ جسکی کچھ مثالیں قدیم کشمیری سکوں بڑا باریک بینی سے کیا گیا مطالعہ، جہانگیر کے سکوں کی مثالیں کشمیری تہواروں اور خاص طور کشمیری پنڈتوں کے رسوم ورواج کا تذکرہ ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں کچھ ایسے امور پر بھی نئی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے کچھ غلط العام مفروضوں کی قلعی کھُل گئی ہے۔ مثلاً اس وقت تک بہت سے مبصر اس بات پر چہ می گوئیاں کرتے رہتے تھے کہ مرحوم عبدالاحد آزاد کیوں ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد قائم ہونے والی ترقی پسند قومی کلچرل محاذ میں شامل نہیں ہوئے۔ پونپر اسکا بہت قابل فہم جواز دیتے ہیں۔ اول تو یہ کہ یہ محاذ ہی ۱۹۴۸ء کی ابتداء میں شروع کیا جاسکا۔ دوسرے اُس وقت آزاد بے حد بیمار اور ہسپتال میں داخل تھے۔ اُنہیں اس محاذ میں داخل ہونے کی دعوت تو دی گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنا عندیہ ظاہر کرتے اوائل اپریل ۱۹۴۸ء میں اُنکا انتقال ہوگیا۔

گدائے میکدہ کا شان بے نیازی دیکھ
پہونچ کے چشمۂ حیوان پہ توڑتا ہے سُبو

پونپر صاحب کے ان مقالات پر ایک نظر ڈالنے سے اُنکے قلم کی جولانی اور اُن کے موضوعات کی رنگارنگی کا ہی نہیں بلکہ اُن کے ظرف کی کشادگی اور اُن کی وفاداریوں کی پاکیزہ نہادی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اشخاص کے نام سے زیادہ اُن کے کام پر توجہ کرتے ہیں اور اس میں کسی بے جا شک کا شائبہ شامل نہیں کرتے۔ مجھے مس میلنسن پر اُنکا مضمون بصیرت افروز ہی نہیں عبرت آموز بھی لگا۔ ان یورپی محسنوں نے سارے جنوبی ایشیا میں علم وعمل کا نور پھیلا دیا۔ جہالت کے تالوں کے اندر بند ہماری ذہانتوں کے کواڑ کھول دیئے اور ہماری زائل شدہ انسانی عظمت کی تیمارداری کرتے رہے۔ کتنے رنج کی

بات ہے کہ آج انکو ہمارے ہی ہم وطن سنگسار کرنے میں بھی عار نہیں سمجھتے۔

پس از مُردن بھی دیوانہ زیارت گاہ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری سنگ باری کی

کشمیر پر مس میلنسن کے احسان کی شہادت پونپر صاحب نے شیخ محمد عبداللہ کی تحریر سے بازیافت کی ہے۔ لیکن ہے نا یہ احسان ناشناسی کی بات کہ اس عظیم کشمیر دوست خاتون پر ابھی سرینگر کی کوئی سڑک، کوئی پارک یا کوئی ادارہ منسوب نہیں کیا گیا۔ جب تک مس میلنسن جیسے بے لوث روحوں کی روشنی دوبارہ اُجاگر نہیں ہوتی۔ ہمارا پٹڑی سے اُترا ہوا نظام تعلیم کبھی ارفع سمتوں کی جانب سرگرم سفر نہیں ہوسکتا۔ رسول پونپر کی اس کتاب کو میں کشمیر پر آئے دن چھپنے والی کتابوں میں ایک ہیرے کی کنی جیسی پائدار شے تصور کرتا ہوں۔ جب تک کشمیر کے ظاہر کے ساتھ اس کے باطن پر نظر نہ رکھی جائے اُس وقت تک اس آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل ہے۔

آخر پر میں بڑے ادب سے کتاب میں شامل دو ایک معمولی تسامحات کی طرف اشارہ کرنا چاہونگا۔ ہارِہ پربت کا قلعہ اکبر بادشاہ کا نہیں بلکہ افغان صوبے دار عطا محمد خان کا تعمیر کردہ ہے۔ اکبر نے صرف اسکی نشیبی فصیل بنوادی تھی۔ اسی طرح ۱۳ر ستمبر ۱۹۳۴ء کو حضرت مہجور کو نمائش گاہ میں مشاعرہ پڑھنے کی دعوت جس سکریٹری مشاعرہ کمیٹی نے دی وہ خواجہ غلام محمد صادق نہ تھے۔ بلکہ ریاستی حکومت کے اب ایک گمنام سرکاری کارندے محمد صادق کی تھی۔ لیکن یہ بہت چھوٹی غلطیاں ہیں مجھے اُمید ہے کہ پونپر صاحب کی بھاری بھرکم ادبی شخصیت میں یہ کتاب اور زیادہ وقعت پیدا کریگی اور کشمیر شناسی کے عرفان کو بہتر بنانے میں اہم تر ثابت ہوگی۔

وزارت روڈ جموں
۲۱ر فروری ۲۰۰۱ء۔ شِوراتری دِوس

**محمد یوسف ٹینگ**

# اپنی بات

رشحات ایّام میرا، اُردو میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا ترتیب دیا ہوا پہلا مجموعہ ہے، جو میں بصد انکسار محترم قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔ اُردو زبان وادب سے میرا بچپن سے شغف رہا ہے گو کہ میری مادری زبان کشمیری ہے جو تخلیقی سطح پر شاعر وادیب کی حیثیت سے میری ترسیل وابلاغ کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں مسرت ہو رہی ہے کہ میں، ابتداء ہی سے کشمیری کے ساتھ ساتھ اُردو، میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہیں رہا کیونکہ میں نے مادری زبان ہی کو تخلیقی زبان کے طور، نثر ونظم اور نقد ونظر میں برتا۔ یہ بھی میری خوش بختی ہی سمجھ لیجئے کہ میں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۲ء تک ریاست جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی کے شعبۂ اُردو۔ کشمیری فرہنگ سے وابستہ رہا، جس کے دوران میرے لسانی اور ادبی باریکیوں کے ادراک کو وسعت ملی۔ اُردو میں بھی اسطرح بلاواسطہ میرا تدوین وترتیب کا سلسلہ جاری رہا۔ جسکا اندازہ میرے اس مجموعہ مضامین سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی اُردو زبان وادب کے نشو وارتقاء کیلئے مستحسن خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کشمیری زبان وادب کا کوئی بھی ذی ہوش طالب علم اُردو میں جاری وساری ادبی رُجحانات، میلانات اور تخلیقی تجربات سے استفادہ کرنے کے مسلسل عمل سے انحراف نہیں کرسکتا۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ کشمیری زبان

کا یہ فطری رشتہ فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو زبان وادب سے بھی برقرار رہا ہے اور آئندہ بھی رہیگا۔ میرؔ و غالبؔ، اقبالؔ و فیضؔ، انیسؔ و دبیرؔ، کرشن چندر و پریم چندؔ، شبلیؔ و سرورؔ اور احتشامؔ و فاروقیؔ کے تخلیقی و تنقیدی رشحات سے مستفید ہونا کشمیر کے اُردو اور کشمیری ادبی حلقوں کا ایک معمول ہے۔

ریاستی کلچرل کی ملازمت سے بحیثیت ایڈیٹر کشمیری اب بخیر سبکدوش ہونے کے بعد میرا تخلیقی او تحقیقی و تنقیدی کام اور زیادہ گہرائی و گیرائی سے جاری ہے، جسکے دوران میری نظر اپنے لکھے اُردو، مقالات کے اوراق پریشان پر پڑی جو میں نے پچھلی تین دہائیوں میں وقتاً فوقتاً لکھے اور جو ''ہمارا ادب'' (سالنامہ شیرازہ کلچرل اکیڈیمی، ریاست کے دوسرے مؤقر رسائل و جرائد اور دوسرے اداروں کے گلدستہ ہائے مقالات میں جگہ پاکر چھپ چکے ہیں۔ میری یہ حقیر کاوشیں میرے ہی وطن مالوف، ارضِ کشمیر کے ثقافتی، تاریخی، لسانی اور تمدنی ورثہ کو کسی نہ کسی صورت میں اُجاگر کرتی ہیں۔ یہ سلسلہ انشاءاللہ آئیندہ بھی جاری رہیگا۔

میں بجا طور قومی کونسل برائے فروغ اُردو نئی دہلی کے صائبُ الرائے. صاحب تدبیر اکابرین اور مشفق کارپردازوں کا شکر گذار ہوں کہ اُنہوں نے میرے اُردو مقالات کے مجموعہ ''رشحات ایام'' کو طباعت کیلئے مالی معاونت سے نوازا۔

اس بات کا یہاں اعادہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ زیر نظر مقالات کے مجموعہ میں شامل مقالوں کا ہندی، پنجابی اور ڈوگری میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ کے۔ ایل۔ سہگل پر میرا اُردو مقالہ پنجابی میں ''یوجنا'' پنجابی میں بھی شائع ہوا ہے۔ میری ان ناچیز کاوشوں کو کافی سراہا گیا ہے۔ جب میرا مقالہ ''کشمیر کی تاریخ کے ماخذ'' ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے سالنامے ''ہمارا ادب'' میں چھپا تو سب سے پہلے سراہنے

اور مبارکباد دینے والوں میں ریاست کے ممتاز کشمیری محقق، تہذیب شناس، عالم، اولین ڈراما نگار اور ادیب مرحوم پروفیسر محی الدین حاجنیؔ (وفات: ۱۹۹۳ء) صاحب پیش پیش تھے۔ دیکھا جائے تو اس مجموعہ میں شامل سبھی مقالات اہم ہیں لیکن کئی ایک کی اہمیت بہت زیادہ ہے کشمیری زبان وادب کے پہلے مؤرخ، نقاد، محقق اور جدید کشمیری شاعری کے پیشرو مرحوم عبدالاحد آزادؔ (وفات ۱۹۴۸ء) پر میرا مقالہ ابھی تک اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری مقالہ ہے۔

ریاست کے ممتاز تہذیب شناس، محقق اور کشمیری زبان وادب کے معتبر نقاد اور ادیب جناب محمد یوسف ٹینگ صاحب کا بھی تہہ دل سے شکریہ کہ انہوں نے "پیش کلام" میں "رشحات ایّام" پر اپنی گرانقدر آراء سے مجھے نوازا۔

ترتیب وتہذیب عین فطرت ہے۔ اس لئے میں اپنے بکھرے پڑے چھپے مضامین کو یکجا کر کے "رشحات ایام" کا نام دیکر اُردو، ادبی حلقوں میں مربوط ومنضبط طریقہ سے حاضر ہو رہا ہوں۔ توقع ہے کہ کشمیر اور کشمیری ثقافت، زبان وادب کو غیر کشمیری قارئین محترم میں متعارف کرنے کی میری یہ ادنیٰ سی کوشش مستحسن سمجھی جائیگی۔ تحقیق وتنقید میں بھی حرفِ آخر کوئی نہیں۔ اسلئے میں اپنی کوتاہیوں کے بارے میں بقول ظہوریؔ اتنا ہی عرض کرنے پر اکتفا کرونگا۔

کم از آنم کہ درِ معذرتم باید زد
بیش از آنی کہ دہی خجلتِ تقصیر مرا

سیّد رسول پونپورؔ

## اِنتساب!

اُن کشمیری الاصل شاعروں، ادیبوں،
صحافیوں، دانشوروں اور فنکاروں
کے نام
جنہوں نے مادرِ وطن کی کوکھ سے
جدُا ہو کے بھی دُور کے ڈیروں میں
اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور
اپنے وطنِ مالوف کا نام روشن کردیا۔

# کشمیر کی تاریخ کے ماخذ

قدیم ہندوستان کی مربوط تاریخ مرتب کرنے کیلئے ایک تاریخ شناس یا تاریخ کے طالب علم کو ہند کے عظیم اساطیری ادب جولوک ودیا، یالوک سائینس کی اہم شاخ ہے کے عظیم سرمائے کی طرف یا اُسے کھنگالنے کی کاوشوں کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ اپنی رنگارنگ تہذیب وتاریخ کے بنیادی خدوخال کو نمایاں کیا جاسکے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ہمارے یہاں ایسے مواد کی کوئی کمی نہیں جس سے تاریخ کا علمی اور سائینسی تانا بانا ہاتھ آسکتا ہے۔ وہ مذہبی اساطیری یا دیو مالائی ادب ہو یا کلاسیکی رزمیوں کی حق وباطل پر مبنی پُر اسرار اور سیمیائی، فضا لوک کتھاؤں کا گہرا ساگر ہو یا تخلقِ کائنات کا شِو۔ پاروتی کا ماورائی تصوّرِ عقیدت ...... بادشاہ ہوں، راجوں مہاراجوں کے جاری کردہ سکّے، مزارات کی یادگاری الواح، آثارِ قدیمہ، سلاطین کے فرامین، تاریخی عمارات، منادر، مساجد، قلعے، باغات ویادگاری محلات، آبی اور خشکی کے راستے، تہذیبی، مذہبی، ثقافتی اور تجارتی سیاحت، عظیم مفکّروں اور مبلغوں کے سفرنامے، آمدورفت کے قدیم ترین راستے (درّے) مسودات ومخطوطات، دیگر معتبر عمرانی، تمدنی ذرائع پر مستزاد زندگی سے قریب تر

ادبی اور شعری سرمائے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس ضمن میں خطۂ کشمیر بلاشبہ نیک بخت ہے۔ اسکی ہمہ جہت طریقہ پر اپنی ایک منضبط تاریخ ہے جو یہاں کی انسانی تہذیب کے دھندلکوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ نیل مت پوران (جسے بعض محققین و ماہرین اُپ پوران ہی سمجھتے اور مانتے ہیں) کو یورپی محقق بُہلر تاریخی و عمرانی اطلاعات کا خزینہ قرار دیتے ہیں، اُس سے قبل کا اساطیری ہندو مذہبی ادب جو مہاتم کے نام سے مقبول ہے، پوتر استھاپنوں وغیرہ کی دیو مالائی توضیح سے مملو ہے جو کئی تاریخی حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ نیل مت پوران کے سیمیائی جھروکے سے ہم اپنے پر اسرار و پُر پیچ ماضی کا مطالعہ محدود حد تک کر سکتے ہیں۔ نیل مت پوران سے ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کشمیری سماج میں عورت کو عزت و حرمت کا مقام حاصل تھا۔ اور اُسے خاندانی زندگی میں وقار و تمکنت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اپنی قدیم تہذیب کے مختلف پہلوؤں مثلاً مذہب، طرزِ فکر و فلسفہ، دیو مالا، اخلاقیات و اعتقادات، دوئت وادوئت واد، توہمات و رسوم عبادات سے ہماری جانکاری نیل مت پوران ہی سے ہوئی ہے جس کے پیش نظر اسے بجا طور پر بالخصوص ہندو مت کا قاموس قرار دیا جاتا سکتا ہے۔

## سنسکرت کے ماخذ

کلہن پنڈت کی راج ترنگنی، جو اُس نے ۴۲۲۴ لوکک مطابق ۵۰-۱۱۴۸ء کو قدیم مواخذ کو زیر نظر رکھکر ترتیب دی ہے بجا طور پر زمانہ قدیم سے اُس کے اپنے عہد کے راجوں مہاراجوں سے متعلق کارناموں و تاریخی محرکات اور واقعات کی اولین تاریخ ہے جسے اُس نے شعری جامہ پہنایا ہے اور جو اُس کے وجود میں چھپی تخلیقی صلاحیتوں کی غماز ہے۔ ایسی رزمیہ نظموں کی

مقامی اور ملکی روایات کا تتبع تو مسلم ہے ۔لیکن فردوسی کے شاہنامہ کی تقلید کو خارج ازامکان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ وسطہ ایشیا اور کشمیر کے ثقافتی روابط قدیم ہیں ۔لوک روایات وقصص کی جڑیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ اُن کی افسانوی حقیقت سے انکار ممکن نہیں ۔ اس لئے کلہن پنڈت نے اپنی شعری تاریخی کاوشوں کو اگر اساطیری رنگ دیا تو تو کوئی عجب نہیں ۔ ہر ملک وقوم کا اپنا مخصوص مزاج ہوتا ہے جو بہر رنگ راج ترنگنی میں جھلکتا ہے۔اس کے انگریزی اور اُردو وغیرہ میں بھی تراجم شایع ہو چکے ہیں جن میں شری آر۔ ایس۔ پنڈت اور مشہور مُستشرِق ایم۔ اے۔ سٹاین کی تحقیقی صلاحتیں ابھی تک زیادہ معتبر مانی جاتی ہیں ۔اس بات کا ذکر کرنا یہاں باعثِ دلچسپی ہوگا کہ کلہن کی راج ترنگنی کا کشمیری ترجمہ بھی کشمیری زبان کے شاعر و محقق شری موتی لال ساقی نے مزید ضروری حواشی کے ساتھ مکمل کرلیا ہے۔ گو کہ کہلن پنڈت کے والد راجہ ہرش کے دربار سے منسلک تھے لیکن خود اُسکی تخلیقی کاوشیں شاہی دربار کی مرہون منت نہیں۔

جون راج ۔ زین العابدین بڈشاہ کا درباری مؤرخ تھا جس نے عہد بڈشاہی سے متعلق حالات قلمبند کرتے ہوئے بڑی عقیدت کا مظاہر کیا ہے۔ اُس کی ''راج ترنگنی'' تاریخ میں کشمیر کے ۱۱۵۰ء سے ۱۴۵۹ء تک کے حالات درج ہیں ۔ یہ ہماری تاریخ کا سب سے اہم اور قدیم ماخذ ہے۔ اسمیں ۱۱۵۰ء سے لیکر شاہ میر کی تخت نشینی تک کے معاشرتی اور سیاسی حالات درج ہیں جو اگرچہ مختصر ہیں لیکن مفید ضرور ہیں ۔ اس میں بعض اہم تاریخی واقعات مثلاً شہزادہ رنچن کا مشرف بہ اسلام ہونے اور میر سید علی ہمدانیؒ کی آمد کا کوئی ذکر نہیں ۔ حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کا ذکر بھی مبہم طریقہ پر کیا گیا ہے۔ اپنے مربی زین العابدین بڈشاہ اور اُن کے والد سلطان سکندر کے ادوار سے متعلق حالات

۱۴۰۹ء۔۱۴۵۹ء تک تفصیل سے ملتے ہیں۔ جون راج کا انتقال ۱۴۵۹ء میں ہوتا ہے جس کے بعد اُس کے شاگرد شری ور نے اپنے اُستاد کے چھوڑے ہوئے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے ''جین راج ترنگنی'' نام کی کتاب تصنیف کی۔ وہ بڈشاہ کی وفات کے بعد سلطان حسن شاہ اور محمد شاہ کی ملازمت میں بھی رہا۔ وہ شاعر بھی تھا اور اعلیٰ پایہ کا موسیقی کا ماہر بھی۔ اُس نے فارسی زبان کی مقبول داستان یوُسف زلیخا کو ''کتھا کوتک'' کے نام سے سنسکرت کا جامہ پہنایا۔ ''جین راج ترنگنی'' میں ۱۴۵۹ء سے لیکر سلطان فتح شاہ کی تخت نشینی یعنی ۱۴۸۶ء تک تفصیلی واقعات ملتے ہیں گو کہ شری ور پنڈت کلہن کی اندھی تقلید کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنے عہد کی مکمل تاریخ ہونے کی بناء پر یہ تصنیف بہت ہی گراں قدر ہے۔

شری ور کے انتقال کے بعد پراجیہ بھٹ نے ''راجاولی تپاکا'' تحریر کی، جو ۱۴۸۶ء سے ۱۴۱۵ء تک پھیلی ہے۔ یہ تاریخ زیادہ وقیع نہیں۔ کیونکہ اس میں محمد شاہ اور فتح شاہ کے درمیان جانشینی کے تصادم کا ذکر بالکل معدوم ہے۔

اس سلسلہ کی آخری کڑی پراجیہ بھٹ کے شاگرد شک پنڈت کلہن کی تقلید میں لکھی ہوئی ''راج ترنگنی'' ہے جو ۱۵۱۷ء سے ۱۵۹۶ء تک کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ تصنیف بھی کچھ زیادہ مفید نہیں۔ کیونکہ اس میں بہت سے شہروں اور دوسرے مقامات سے متعلق غلط اطلاعات درج ہیں۔ اُس نے اکثر واقعات کے سنین بھی چھوڑے ہیں۔ اور ان کی ترتیب بھی غلط ہے۔ کشمیر پر مرزا حیدر کے دوسرے حملے اور فتح، عیدی رینا اور دولت چک کے درمیان اقتدار کی جنگ کا ذکر بھی اس میں کہیں نہیں۔ خاندانِ چک کے عہد حکومت اور مغلوں کے ہاتھو غلبہ کشمیر ۱۵۸۶ء کو بھی نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

کھیمندر ۱۱۰۰ء اور کئی دوسرے اشخاص کی تحریر کردہ لوک پرکاش جیسا کہ

(ایک حصہ کیمندر نے بھی لکھا تھا اور یہ جیسکی دوسری جلد میں شاہ جہاں کے ذکر سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے بعض حصے سترہویں صدی میں لکھے گئے ہیں۔ یہ ایک ''یاداشت'' سی ہے جس میں قسم قسم کی باتیں جمع کردی گئی ہیں اس کی زبان ملی جلی ہے۔ سنسکرت میں فارسی اور کشمیری زبان کی آمیزش ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے جن میں اور باتوں کے علاوہ کشمیر کی زندگی اور انتظامی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ اس کے مختلف ابواب کے تحریری کے وقت کا تعین کرنا مشکل ہے۔ مانکھا کی سری کنٹھا چرتا اور ودیاپتی ربلہن کی تالیف کردہ ۱۸۷۵ ء کی وکرمانکادیوا چرتا بھی اس ضمن میں قابل توجہ ہے۔

## فارسی ماخذ: کشمیر:-

اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ یہاں پر عربی کے پہلو بہ پہلو فارسی زبان کا بھی چلن ہوا جو بلا شبہ اسلامی مبلغین کی تبلیغی زبان تھی۔ اسلام کے سرعت سے یہاں پھیلنے میں مقامی سماجی، سیاسی اور مذہبی زندگی کے علاوہ اہم ترین رول یہاں کے رشیوں نے ادا کیا جن کے سرخیل حضرت شیخ نورالدین ولیؒ عرف نند ریشی تھے جنہوں نے اسلام کے نئے نظام حیات کو مقامی مادری اور مروجہ زبان میں لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرایا۔ چنانچہ چھ سو سال گزرنے کے بعد بھی اُن کا کلام عقیدتمند شائقین کو آج بھی زبانی یاد ہے وہ پہلی بلند قامت شخصیت ہے جس کا ذکر تواریخ میں آیا ہے۔

سید علی کی ''تاریخ کشمیر'' یوسف شاہ چک کے دور میں لکھی گئی تھی۔ کشمیر سے متعلق تمام تر فارسی تاریخیں مغلوں کی فتحِ کشمیر کے بعد مرتب کی گئیں۔ حالانکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ دورِ شاہ میری میں ہی فارسی کا رواج ہو چکا تھا

اورتالیف وتصنیف کا کام بھی اپنا پرچم گاڑ چکا تھا۔ یہ جملہ تاریخیں مؤرخوں کے ذاتی و دعینی مُشاہدات اور مستند ماخذوں سے استفادہ پر مبنی ہیں جواب نایاب ہیں۔ اور گردِش ایام کے دست برد کی شکار ہوچکی ہیں۔ سید علی کی ''تاریخ کشمیر'' سلطان یوسف شاہ چک کے دور تک کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ کے قلمی نسخے اب سوائے ایک نامکمل نسخے کے جو ریسرچ لائبیریری میں موجود ہے اب بالکل نایاب ہیں۔ کشمیر کی تاریخ پر یہی ایک معتبر اور مستند کتاب ہے۔

بہارستان شاہی (مصنف نامعلوم) رنچن (سلطان صدرالدین) کی تخت نشینی ۱۳۲۰ء سے لیکر ۱۶۱۸ء تک حاوی ہے۔ مصنف کے بارے میں صرف یہ معلوم ہوسکا ہے۔ کہ وہ شیعہ تھا اس کے ماخذ جون راج، شری ورکی تاریخوں کے ساتھ ساتھ مُلا احمد، مُلا نادری قاضی ابراہیم اور حسن قاری کی فارسی تاریخیں ہیں۔ اس کتاب میں سلطان یوسف شاہ یعقوب شاہ جلاوطنی اور موت کے حالات تفصیلاً بیان کئے گئے ہیں جس کے پیش نظر اور کئی نقائص کے باوجود یہ بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

تاریخ کشمیر حسن بن علی کشمیر کی اجمالی تاریخ ہے جس میں ابتدائی دور سے لیکر ۱۶۱۶ء تک کے واقعات درج ہیں۔ یہ جلال الدین ملک محمد ناجی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی جو اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کو محفوظ کرنے کا خواہاں تھا۔ حسن بن علی اور بہارستان شاہی کے ماخذ ایک ہیں۔ حسن بن علی نے عہد سلاطین کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس لئے یہ اپنے عہد کا گراں قدر ماخذ ہے۔

کشمیر کی سب سے زیادہ مشہور فارسی تاریخ حیدر ملک کی تصنیف ہے حیدر ملک کے والد کا نام حسن ملک تھا اور وہ چاڈورہ کا رہنے والا تھا۔ حیدر ملک

سہدیو کے سپہ سالار رام چندر کی نسل سے تھا اور اُس کے خاندان نے سلاطین کے عہد میں نمایاں کام انجام دئے جن کے پیش نظر جہاں گیر نے حیدر ملک کو چغتائی اور رئیس الملک کے خطابات سے نوازا۔ حیدر ملک نے تاریخ کشمیر ۱۶۱۸ء میں شروع کر کے ۲۱-۱۶۲۰ء میں مکمل کر لی اور اس میں اُس نے دستیاب ماخذوں کے علاوہ اُن روایات کو بھی قلمبند کیا ہے جو اُس کے خاندان میں سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں۔

## ہندوستان کی عام تاریخیں:

طبقات اکبری مصنفہ نظام الدین:- اس میں کشمیر کی قدیم تاریخ سے اکبر کی فتح کشمیر تک کے حالات پر بھی ایک جز وقف ہے مصنف نے تاریخ رشیدی'' مصنفہ مرزا حیدر اور تاریخ کشمیر کا استفادہ کیا ہے۔

**تاریخ فرشتہ** مصنف قاسم ہندو شاہ عرف فرشتہ:- اس تاریخ میں کشمیر پر بھی ایک باب ہے۔ اور اس میں طبقاتِ اکبری اور تاریخ رشیدی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

منتخب التواریخ مصنف عبدالقادر بدایونی۔ اسمیں کشمیر سے متعلق کوئی الگ باب نہیں۔ البتہ اکبر کے دورِ حکومت کے کشمیر کے صوفیائے کرام اور اربابِ علم و فضل کا کہیں کہیں ذکر آیا ہے۔

**مآثر رحیمی**: مصنفہ خواجہ عبدالباقی نہاوندی عبدالرحیم خانخانان کی سوانح حیات ہے جو ۱۶۱۶ء مکمل ہوئی تھی اور جس میں کشمیر پر بھی ایک باب ہے

**مجالس السلاطین**: مصنفہ محمد شریف النّجفی ۲۹-۱۶۲۸ء میں مکمل ہوئی۔ یہ ہندوستان کی مختصر تاریخ ہے اور اس میں شہزادہ رنچن کا سلطان

صدر الدین کے نام سے مشرف بہ اسلام ہونے کا ذکر آیا ہے۔

**ہفت اقلیم** : مصنف امین احمد رازی۔ یہ ایک جغرفیائی انسائیکلو پیڈیا ہے جو ۱۵۱۴ء میں مکمل ہوئی اس میں مرزا حیدر دوغلات کی فتحِ کشمیر کا حال درج ہے۔

## مغلوں کی تاریخیں :

اکبر نامہ و آئین اکبری ابو الفضل : شہنشاہ جہانگیر کی تصنیف ''تزکِ جہانگیری، تاریخ رشیدی، مرزا حیدر دوغلت، بابر کے خالہ زاد بھائی کی تحریر کردہ ۱۵۴۶ء میں بھی کشمیر کے انتظامی امور، جغرافیائی، تہذیبی اور تمدنی حالات کا ذکر آیا ہے ۔اس کے علاوہ سلاطین دہلی کی تاریخیں، تاریخ مبارک شاہی (یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی)، تاریخ داؤدی، تاریخ خان جہانی میں بھی کشمیر اور کشمیری شخصیات سے متعلق جزوی طور ذکر کیا گیا ہے۔

## بعد کی فارسی تاریخی کتب :

منتخب التواریخ: نرائن کول عاجز : اس میں ابتدائی دور سے لے کر تاریخ تصنیف ۱۷۱۰ء تک کے واقعات کو جگہ دی گئی ہے۔ یہ حیدر ملک چاڈورہ کی تاریخ کی تلخیص ہے۔

**نوادِرُ الاخبار**: رفیع الدین احمد: کشمیر کی یہ تاریخ ۱۷۲۳ء میں شاہجہاں آباد میں لکھی گئی۔ مصنف کے آباؤ اجداد بلخ سے آئے تھے۔ لیکن وہ خود پیدائشی کشمیری تھا۔ اس میں ہندوؤں کے عہد حکومت کے بارے میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اور سلاطین کے عہد پر تفصیلاً لکھا گیا ہے۔ بہارستانِ شاہی اور حیدر ملک کی تاریخ سے مصنف نے بہت حد تک استفادہ کیا ہے۔

**واقعات کشمیر** :محمد اعظم دیدہ مری۔ یہ تاریخ ۳۶-۱۷۳۵ء

میں لکھی گئی اور قبل کی تصانیف کی تلخیص ہے۔ سیاسی تاریخ کے علاوہ اس میں کشمیر کے صوفیائے کرام اور علمائے عظام کا بھی ذکر ہے۔

**گوہر عالم**: محمد اسلم منعمی[ا] (۱۷۸۶ء) اس کے مصنف نے نور نامہ حسن قاری، اور محمد اعظم کی تصانیف سے استفادہ کرنے کا دعویٰ کی ہے۔ اس کا طرز بیان مشکل اور پُر تکلف ہے۔

**حشمت کشمیر**: عبدالقادر خان۔ (۱۸۹۰ء) بنارس میں لکھی گئی ہے اس کے ماخذ کا تمام تر دارومدار گوہر عالم پر ہے۔ اور بھی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں جن میں تاریخ شائق منظوم ہے جس کے مصنف عبدالوہاب شائق ہیں اور افغان عہد میں ۶۳۔۱۷۵۴ء کے دوران لکھی گئی۔

**تاریخ کشمیر**: خلیل مرجان پوری ۱۷۔۱۷۷۰ء: اس مسودے کے کئی اوراق اُدیان دیو (۳۹۔۱۳۲۲ء) کے زمانے کے بعد سے آغازِ عہد بڈشاہی تک غائب ہیں۔

**تاریخ حسن**: (تکمیل ۱۸۸۵ء) یہ تاریخ چار حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں کشمیر کا جغرافیہ، عماراتِ قدیم، یہاں کے باشندوں، ذاتوں اور مذہبی فرقوں کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں کشمیر کے ابتدائی دور سے لیکر مصنف کے زمانہ تک کی تاریخ ہے۔ تیسرا حصہ کشمیر کے صوفیائے کرام کے تذکرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چوتھا اور آخری حصہ سلاطین اور مغل شہنشاہوں کے دور میں فارسی شعروادب کے فروغ سے متعلق ہے سیاسی تاریخ میں اُن ۳۵ راجاؤں کا بھی ذکر ہے جو کلہن سے چھوٹ گئے تھے۔ ان راجاؤں کا حال ملا احمد کی وقائع کشمیر سے ماخوذ ہے۔

---

[ا] ڈاکٹر محب الحسن نے اس کے مصنف کا نام بدیع الزمان ابوالقاسم لکھا ہے۔

**تاریخ کبیر**: چھاپ ۱۰۔۱۹۰۹ء مغلوں کے آخری عہد اور دیگر صوبوں کی تاریخ۔ صمصمام الدّولہ کی تصنیف مآثر الامراء کے سواء ایک بھی اہم نہیں۔ اس تاریخ میں مرزا حیدر اور ابولمعالی کے کشمیر پر حملے اور آخر میں اکبر کی فتح کی مختصر تاریخ ہے صوبوں کی تاریخوں کے سلسلہ میں صرف تین کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک ''احوال کشتواڑ'' ہے۔ جس کا سنہ تصنیف ۸۳۔۱۷۸۲ء ہے۔ دوسری تاریخ ''راجگان جموں یا راج درشنی'' ہے جو ۱۸۱۷ء میں لکھی گئی اور تیسری کتاب تاریخ راجوری ہے جو ۱۹۰۷ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

میر سعد اللہ شاہ آبادی کی منظوم تاریخ ''باغ سلیمان''، ملا نظام الدین کی ''وقائع نظامیہ'' و دیگر تاریخی کتب کا مطالعہ بھی کئی لحاظ سے اہم ہے۔

**تذکرہ ھائے صوفیائے کرام** (رشی نامے اور نور نامے):

وادی کشمیر اگلے وقتوں سے علم و آگہی کا گہوارہ رہی ہے اور رشیوں اور منیوں کا مسکن بھی۔ وہ شوسوتر ہوں یا اُپنشد، ترکا شاستر ہو یا شیومت کی تشکیل نو، بدھ مت کا عروج و زوال ہو یا اسلام کی عہد آفرین اشاعت۔ ریشیوں منیوں کا لامتناہی سلسلہ ہر دور میں بہر رنگ جاری رہا۔ جس کی روشن مثال لل دید اور علمدارِ کشمیرؒ کی عہد ساز اور بلند قامت شخصیات سے ملتی ہے جو ہماری قدیم مشترکہ تہذیب کے دو الگ الگ روشنی کے مینار رہیں اور ایک تہذیبی تجدید و آمیزش کے غماز بھی۔ اُن کا کلام بہت دیر تک سینہ بہ سینہ ہم تک آپہنچا اور لوگوں کے دلوں میں بلا تمیز مذہب و ملت جاگزیں رہا۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں رشیت کا سلسلہ ٹوٹا نہیں۔ اسلئے اُن کے بعد آنے والے خلفاء نے اپنے اولین مرشدوں کے حالات قلمبند کئے جس سے کہ ہمیں اپنی تاریخ کی ٹوٹی کڑیوں کو جوڑنے میں مدد ملتی ہے۔ ایسی عارفانہ، عالمانہ اور عقید تمندانہ خصوصی

اور عمومی تخلیقی کاوشوں کی تفصیل یوں ہے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ | مرات الاولیاء | ملا احمد علامہ | ۸۸۰ھ (تقریباً) |
| ۲ | نور نامہ | بابا اسماعیل زاہد | ۹۰۰ھ (تقریباً) |
| ۳۔ | نور نامہ | بابا نصیب الدین غازیؒ | ۱۰۳۰ھ |
| ۴۔ | منہاج الریشی (عربی) | بابا داوٗد مشکاتیؒ | ۱۰۶۰ھ |
| ۵۔ | ریاض الاسلام (منظوم) | عبدالوہاب شائق | ۱۱۷۰ھ |
| ۶۔ | نور نامہ | بابا محمد خلیل، چرار شریف | ۱۲۱۱ھ |
| ۷۔ | ریشی نامہ (منظوم) | مُلا بہاوٗالدین متو | ۱۲۳۳ھ |
| ۸۔ | نورالدین نامہ (نثر) | بابا کمال، چرار شریف | ۱۲۴۶ھ |
| ۹۔ | تذکرۃ الصالحین | محمد خلیل کھوسہ پوری | ۱۳۰۰ھ |
| ۱۰۔ | رسالہ مقامات | بابا حاجی ادہم | ۸۴۰ھ |
| ۱۱۔ | تذکرۃ الحضرات | امیر الدین | ۱۲۵۱ھ |
| ۱۲۔ | اسرار الابرار | بابا داوٗد مشکاتی | ۱۰۶۳ھ |
| ۱۳۔ | تذکرۂ مشائخان | شیخ عبدالغفور غازی | ۱۱۰۰ھ |
| ۱۴۔ | درجاتُ السّادات | خواجہ اسحاق ناوچو | ۱۱۰۵ھ |
| ۱۵۔ | خوارق السالکین | مُلا احمد ہادی | ۱۱۰۹ ہجری |
| ۱۶۔ | فتحات کبرویہ | شیخ عبدالوہاب نوری | ۱۱۶۳ھ |
| ۱۷۔ | اشجار الخلاء | خواجہ محمد اعظم دیدہ مری | ۱۱۷۰ھ |
| ۱۸۔ | ثمرۃ الاشجار | خواجہ محمد اعظم دیدہ مری | ۱۱۷۰ھ |
| ۱۹۔ | تذکرۃ الصادقین | صدرالدین وفائی | ۱۲۰۴ھ |
| ۲۰۔ | نُندہ ریشیؒ | آنند کول بامزے | |

۲۱۔ کشیر ڈاکٹر صوفی غلام محی الدین

۲۲۔ تاریخ اقوام کشمیر (۳ جلدیں)

۲۳۔ تاریخ اقوام کشمیر (۳ جلدیں) و دیگر متعدد تصانیف متعلق بہ کشمیر منشی محمد دین فوق

۲۴۔ خلاصۃ المناقب نورالدین جعفر بدخشی ۱۳۷۸ء

۲۵۔ تحفۃ الاحباب (سوانح میر شمس الدین عراقی) وسط ۱۵ویں صدی

۲۶۔ حلیۃ العارفین سوانح سلطان العارفین حضرت شیخ مخدوم حمزہؒ۔

خواجہ اسحاق قاری ۱۵۸۷ء

۲۷۔ تذکرۃ العارفین علی رینا ۱۵۸۷ء

۲۸۔ کشمیری زبان اور شاعری۔ عبدالاحد آزاد مطبوعہ جموں و کشمیر

اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز ۱۹۶۷ء

## لوک ادب

لوک ادب ۔لوک سائینس (Folk Lore) کی ایک اہم شاخ ہے جس کے آئینے میں کسی بھی قوم کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کا بھرپور عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ زندگی کے صبر آزما سفر میں سورج، چاند، تارے، چرندو، کیڑے مکوڑے، اُبلتے چشمے، پیڑ پودے، دریا اور سمندر وغیرہ انسان کے ساتھ رہے۔ اُس نے اساطیری کردار تخلیق کئے تاکہ وہ اپنے ذوق جمال کی تشفی کر سکے۔

شاید یہ کہنا بے محل نہیں ہوگا کہ کشمیر لوک کتھاؤں کا قدیم ماخذ رہا ہے۔ گناڈِ کی ''برہت کتھا'' اس سلسلہ کی اہم اور اولین کڑی ہے۔ سوم دیو کی ''کتھا سرت ساگر'' بھی ذکر ہے۔ ویشنو شرما کی پنچ تنتر کی صدائے بازگشت ساری دنیا میں سُنائی دیتی ہے۔ مشہور عیسائی مبلغ جی۔ ایچ نولز جس نے ۱۸۸۷ء میں سب سے پہلے کشمیری لوک کہانیوں کا انگریزی ترجمہ شایع کیا، رقمطراز ہے۔ ''

"دنیا کا کوئی ملک لوک ادب اور لوک گیتوں کے شعبہ میں زرخیری کے لحاظ سے کشمیری زبان پر سبقت نہیں لے گیا ہے" یورپی مستشرق اور تاریخ شناس ایم۔ اے۔ سٹائن لوک ادب ہی کی وساطت سے والہانہ طور سے کشمیری تاریخ طرف متوجہ ہوا۔ سر جارج گریرسن بھی کشمیری لوک ادب کی اجتماعی اور تاریخی فہم وفراست کا معترف ہے کشمیری زبان وادب اور بالخصوص "لڑی شاہ" کی لوک صنفِ شاعری کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

## آثار قدیمہ

زندگی تغیر مسلسل سے عبارت ہے۔ تہذیبوں کی شکست وریخت کا عمل کائنات کا عکاس بھی ہے اور امین بھی تہذیبیں مٹتی ہیں تو کھنڈرات اور آثار ہی باقی رہتے ہیں جو ہمارے ماضی کے دھندلکوں میں سے ہماری قدیم تہذیب کی نقاب کشائی کرتے ہیں اور انسانی تارریخ کے اوراق بھی اُلٹا کر ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑنے میں بہت حد تک مُمِد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ کشمیر کو اپنے درخشندہ ماضی پر فخر ہے جو تاریخ کے اوراق میں بھی محفوظ ہے اور آغوشِ ارضی میں بھی گویا ہے۔ بقولِ علامہ اقبالؒ

یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام ونشان ہمارا

ہارون کے آثار بعد کے ہیں، لیکن برزہامہ کے کھنڈرات ۵۰۰۰ پہلے کی کشمیری تہذیب وانسانی تاریخ کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ ایک وسیع موضوع ہے جو متنوع بھی ہے مشکل بھی۔ تاریخی آثار کا ذکر اجمالاً بھی کیا جائے تو بھی قصہ طولانی ہوگا۔ بودھ فن تعمیر کے آثار ہمیں ہارون، اُشکر اور پرہاسپور میں ملتے ہیں جو کشن دور سے متعلق ہیں اور ہندو فن تعمیر کے آثار آج بھی نویں اور گیارہویں

صدی کی یاداونتی سوامی اور سوریہ مندر کے روپ میں تازہ کرتے ہیں۔اس ضمن میں پاندرٹھن، لودھو، ملنگپورہ، پایر، نارستان، کوٹھیر، پٹن، بونیار، مانسبل اور اندرکوٹ کے آثار کی صورت ہماری بولتی تاریخ تیرہویں صدی عیسوی تک کی نشاندہی کرتے ہیں۔ہم فن سنگتراشی کے ذریعہ پتھروں کی زبانی یہاں کے قدیم باشندوں کی تخلیقی اُپج، عقائد کی ارفع واعلیٰ سطح اور ذوقِ جمال کی بلندیوں سے آشنا ہوتے ہیں۔آثار کی یہ کڑی کشمیر میں اشاعت اسلام سے پہلے اور اُس کے بعد بھی ٹوٹتی دکھائی نہیں دیتی۔کیونکہ متعدد مسلم خانقاہوں اور مساجد کی بنیاد چودھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد بودھ وہاروں اور ہندو استھاپنوں پر ہی رکھی گئی ہے۔شاہمیری دور میں اگر اضافہ ہوا تو یہاں کی آب وہوا کے موافق چوبی فن تعمیر اور چوبکاری کا۔جس کی واضح مثالیں خانقاہ معلیٰ، جامع مسجد (۱۳۹۸ء۔۱۴۰۲ء) مسجد مدین صاحب ودیگر مذہبی اسلامی تعمیرات سے ملتی ہیں جن میں دیودار اور سرو صنوبر کی بلند قامتی اور دشت وجبل کی وسعت مضمر ہے۔بڈشاہ کا فلک بوس ہشت پہلو بارہ منزلہ چوبیں شاہی محل (زینہ ڈب واقع نوشہرہ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔مرزا حیدر کاشغری نے وسعت اور بلندی کے اعتبار سے زینہ ڈب کا مقابلہ قصر شاہی تبریز ''ہشت بہشت'' اور سمرقند کی کوک اور نماق سرائے سے کیا ہے۔اس کے بعد ۱۵۸۶ء کے بعد کشمیر میں مغل شہنشاہوں کے ہاتھوں تجدید وتعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔ایرانی طرز تعمیر کی روایات یہاں رواج پاگئیں۔اس طرح ایک امتزاجی طرز تعمیر اور آرائش وتصوّرِ جنت ارضی کی کی پیروی میں باغات تشکیل پاگئے جو آج بھی اُن کے اعلیٰ ذوقِ جمال کے آئینہ دار ہیں۔

آگرہ، دہلی اور لاہور ایسی مساجد کی طرز پر سرینگر کی عہد جہانگیری کی

تعمیر شدہ پتھر مسجد ایک جُدا گانہ اور پائدار حیثیت رکھتی ہے۔ زین العابدین کا تعمیر کردہ اپنی والدہ محترمہ کا مقبرہ زینہ مٹھ اپنے امتزاجی فن تعمیر کے علاوہ اپنی انفرادیت قائیم رکھے ہوئے ہے۔ قلعہ ہاری پربت ۱۰۰۶ھ (تعمیر کردہ شہنشاہ اکبر) مسجدِ آخون مُلا شاہ یا مسجدِ داراشکوہ (۱۰۵۹ھ مطابق ۔ ۱۶۴۹ء) مسجد ومقبرہ مدین صاحب عہد بڈشاہی (۸۸۸ھ مطابق ۔ ۱۴۸۳ء چشمہ شاہی ۱۰۵۲ھ مطابق ۔ ۴۲۔۱۶۴۳ء۔ پری محل رصد گاہ۔ نشاط باغ (تعمیر کردآصف شاہ برادر نسبتی جہانگیر) شالیمار باغ ۱۰۴۲ھ مطابق ۔ ۱۶۱۵ء ویری ناگ (۳۷۔۱۰۲۹ھ)۔ اچھابل (۱۶۲۰ء) نسیم باغ (۱۰۴۵ھ مطابق ۔ ۱۶۳۵ء) باغ داراشکوہ بجبہاڑہ وغیرہ جریدہ عالم پر اپنے اِمٹ نقوش ثبت کئے ہوئے ہیں علم وہنر، زبان وادب صنعت وحرفت کاغذ سازی، پیپر ماشی، شالبافی، گبہ سازی، چوبکاری، اور سب سے بڑھکر مُصوِری کا اسلامی مبدّل فن خطاطی وخوشنویسی تاریخ کا تانا بانا تیار کرنے میں ہمہ جہت مواد فراہم کرتے ہیں جس کا جائزہ لئے بغیر ایک سائینسی تاریخ کا وجود پذیر ہونا ممکن نہیں۔

## سکے:

انسانی سماج کے ارتقاء میں روپیہ پیسہ تبادلے کا آسان اور سہل ترین ذریعہ رہا ہے جس سے پہلے جنس کے بدلے جنس کا چلن تھا۔ انسانی تاریخ کے مختلف ادوار سے گزر کر یہی سلسلہ ترقی یافتہ شکل میں سکوں (ضروب) کی صورت میں ظہور پذیر ہوا جو انسانی سماج کے اجتماعی تجربات کا لازمی نتیجہ تھا۔ آجکل یہ سکے ٹکسال باہر تو ہیں۔ لیکن تاریخ کے مختلف ادوار کے شناخت نماؤں کی حیثیت میں انکی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ کشمیری راجوں، مہاراجوں، سلاطین اور شہنشاہوں کے جاری کردہ سکوں کے مجموعے ملک کے عجائب

گھروں میں موجود ہیں۔ سب سے وقیع و وسیع مجموعہ لندن میوزیم کی زیب و زینت ہے۔ غنی کشمیری نے شاید اسی لئے کہا تھا۔

غنیؔ روزِ سیاہ پیرِ کنعاں راتماشا کُن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زُلیخا را

عام طور سکّوں کو بادشاہوں اور فرمانرواؤں کی ذاتی اور خاندانی علامتوں سے دیکھا اور پرکھا گیا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ اپنے زمانے کی خوشنویسی، طرز تحریر، طرز معاشرت، ثقافت اور سرکاری زبانوں کی یادگاریں بھی نظر آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سکّے اب ٹکسال سے باہر ہو کر قدرِ مُبادلہ (Exchange Value) سے محروم ہو چکے ہیں۔ لیکن ان پر ثبت کئے گئے خطوط کی رعنائی اور زیبائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس بارے میں کشمیر کے سکّوں کا مطالعہ ایک عجیب و غریب ٹائم مشین کی طرح ہمارے لئے ماضی کے کتنے ہی جھروکے کھول دیتا ہے۔ ان میں اُن گمنام یونانی حکمرانوں کے سِکّے بھی شامل ہیں جن کے وجود کی شہادت صرف یہی نگینے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ تاریخ کشمیر کے کتنے ہی اسرار و رموز کے عقدہ کشا بھی ہیں۔ ان پر اُبھارے گئے چہروں کے غد و خال اور حروف کی تراش خراش اس قدر خوبصورت، دیدہ زیب اور تر و تازہ ہے کہ دو ہزار سال گزرنے کے باوجود بھی ان کو نہ تو مات کیا جا چکا ہے اور نہ ہی وہ امتدادِ زمانہ سے ماند پڑ چکے ہیں۔ پھر فرمانروائے اعظم کنشک کے سِکّے ہیں۔ جن پر خروشطی میں عربی اور فارسی رسم الخط کی مانند دائیں سے بائیں ''شہنشاہو کنشانا شہرو'' کی تحریر درج ہے۔ سلاطین کے زمانہ تک آتے آتے گول اشرفیوں کے خد و خال چوکور ہو جاتے ہیں جس سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ سلاطین اپنے آپ کو اسلامی دنیا کے مرکز میں حکومت کرنے والے خلفاء

کا مطیع سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو نائب امیر المومنین قرار دیتے تھے۔ واقعاتی طور وہ کسی بھی پہلو سے خلیفۂ اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مگر مرکز اسلام کے ساتھ ہم آہنگی کا یہ اشارہ کر کے وہ اپنے وقت میں علامہ اقبالؒ کے اس شعر کا مفہوم ادا کرتے تھے۔ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کا شغر

سرینگر ایس پی ایس میوزیم کے مجموعہ میں اور ضروب کے علاوہ یہ سکّے بھی شامل ہیں۔

## عہد یونان:

یوتھی ڈیمس باختر (۲۲۰ ق م) یوکراٹائڈس باختر، ایزس (سیتھیائی) دونونس (سیتھیائی) ایزس لی سس (سیتھیائی) سپالر پسس (سیتھیائی) ابد غیشث (پارتھیائی)، اپولوڈاٹس، منانندر، انٹی مانیکاوس، ہپوٹراٹسؔ (۱۴۰ ق م)۔

عہد شاہاں ہنود، کشمیر و مغل: سپلاپتی دیو کا، سمنت دیو، مہاراجہ کنشک (۱۲۵ء) تورمان (۵۰۰ء) مہرکل (۵۵۰ء) دُرلبھ وردھن (۲۲۵ء) وِجرادت، وِنادتہ، سُکھ ورمن (۸۸۵ء) گوپال ورمن (۹۰۱ء) رانی سُگندھا (۹۰۳) رانی دِوا (۹۵۰ء) راجہ ہرش دیو (۱۰۸۹ء) جے سمہا (۱۱۲۸ء) سلطان شمس الدین (۱۳۳۹ء) سلطان سکندر (۱۳۹۰ء) سلطان زین العابدین (۱۴۲۴ء) یوسف شاہ چک (۱۵۷۹ء) اکبر اعظم (۱۵۸۶ء) شہنشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ء) شاہ جہاں (۱۶۲۷ء) اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء)۔ اس کے علاوہ پٹھان گورنر عطا محمد خان کا حضرت شیخ نورالدین ولیؒ اور حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کی یاد میں مشترکہ طور جاری کردہ سکہ قابل ذکر ہے جو شکوہ سلطنت کا فقرِ کشمیر کے سامنے سرخم ہونے کی غمازی کرتا ہے۔

شاید یہ کہنا بے محل نہیں ہوگا کہ ''ضرب کشمیر'' بقول محمد یوسف ٹینگ کشمیر کی انفرادیت[۱] کا پرچم بن گیا تھا۔

## دیگر ذرائع (ماخذ):

وادیٔ کشمیر کے قدیم سیاسی، انتظامی، عمرانی، معاشی، مذہبی وتمدنی حالات بہ کثرت مختلف ماخذ میں ملتے ہیں۔ یونانی، چینی، فرانسیسی، عربی، انگریزی ودیگر بڑی بڑی زبانوں میں کشمیر سے متعلق ذکر ملتا ہے۔ مہابھارت تو کشمیر کی اپنی ہی دھرتی کی کوکھ کا رزمیہ تھا۔ اسمیں اسکا ذکر کیسے نہیں آتا۔ ویشنو پوران، شیو پوران، مارکنڈ اپوران، بلہن کی شاعری، کتھا سرت ساگر، دامودر گپت، کٹنی مٹ، کوٹلیا کا ارتھ شاستر، (جسے ارسطو کی جمہوریت اور میکاؤلے کی ایسی سیاسی تصانیف کے ہم پلّہ قرار دیا گیا ہے) سومدیو کی واکھیہ مرتا اور سنسکرت زبان کی دوسری مذہبی اور ادبی کتب کو کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے۔

بطلیموس ۱۵۰ ق۔م: میں ہند کی سیاحت پر آیا۔ وہ کشمیر کے جغرافیہ کے بارے میں لکھتا ہے۔ کہ کشمیر ''بدسپس'' (وتستا) اور سندابل (چندر بھاگا) کے ماخذوں کے دامن میں وقع ہے۔ گو کہ اس کی کشمیر کے جغرافیہ کی توضیح مبالغہ آمیز ہے۔

ایک اور یونانی سیاح کشمیریوں کی سبک روی اور تیز گامی کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ انکی عسکری پیش قدمی کی صلاحتیں کوہستانی علاقہ میں رہنے کے ناتے ہندوستان کے دوسرے میدانی علاقوں کے باشندوں کی بہ نسبت بہتر ہیں۔

تبتی اور چینی ماخذوں میں بھی کشمیر کا بہ کثرت ذکر آیا ہے۔ ۵۴۱ء کے ایک قدیم حوالے سے پتہ چلتا ہے کہ چینیوں نے کس فراخدلی سے کشمیر کے

فطری حُسن کی داد دی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ کشمیر شمالی ہندوستان کے باب السلطنت کی حیثیت سے برف سے ڈھکی چوٹیوں میں لپٹے اور گھرے لعل وجواہر کی مانند ہے۔ کشمیر کے متعلق مستند شواہد چینی سیاح ہیون سانگ کے ہیں جو ۶۳۱ء میں کشمیر کی سیاحت پر آیا اور یہاں دو سال رہا۔ ہیون سانگ بارہمولہ کے راستے وارد کشمیر ہوا۔ حکومت وقت کی طرف سے اس کا سواگت کیا گیا۔ اُس نے بدھ مت کو روبہ ترقی دیکھا گو کہ اسے ایک حاوی عقیدہ کی حیثیت حاصل نہیں تھی ۔ اُسے بیس خطاطوں اور کاتبوں کی خدمات سے بھی نوازا گیا تاکہ وہ مقدس کتابوں اور شاستروں کی نقلیں تیار کرا سکے ۔ یہاں کی تہذیبی اور علمی زندگی کے بارے میں ہیون سانگ لکھتا ہے کہ کشمیر اگلے وقتوں سے تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔

دوسری اقوام کی ذہانت س مقابلہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ یہاں کے دانشوروں کی قوت ادراک اوران کا منطقی استدلال قابل رشک بھی ہے اور منفرد بھی ۔اس نے یہاں کے جغرافیہ، آب وہوا، لوگوں کے رہن سہن، اُن کے عقائد، کوتاہیوں اور کمزوریوں کے بارے میں تفصیلاً ذکر کیا ہے اُس کے بیان کے مطابق یہاں سو کے قریب بودھ وہار اور چار اشوک لاٹ موجود تھے۔

دوسرا چینی اؤ کانگ ہے جو ۷۵۹ء میں کشمیر آیا اور سنسکرت کے گہرے مطالعہ میں بھی مصروف رہا۔ اُس کے کہنے کے مطابق کشمیر میں تین سو سے زاید بودھ وہار موجود تھے ۔ جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اوکانگ کی سیاحت کشمیر کے وقت یہاں بدھ مت کافی عروج پر تھا۔

اس سے قبل چین کے ٹینگ خاندان کے ساتھ کشمیر کے ۷۱۳ء کے آس پاس سفارتی تاریخی تحریرات ودستاویزات سے بھی دلچسپ معلومات

فراہم ہوتی ہیں۔ جو چینی بادشاہ چن ٹولو پی لی اور اُس کے برادر جانشین موٹو پی سے متعلق ہیں جبکہ کلہن کی راج ترنگنی کے مطابق یہاں چندرا پیڈ، مکتا پیڈ اور للتادتیہ کی فرمانروائی ہوتی ہے۔ ہیون سانگ کے بیانات کے علاوہ ان تحریرات سے مہاپد ماکر (جھیل وُلر) اور وتستا (دریائے جہلم) کے بارے میں بھی حوالے ملتے ہیں جس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ شہر سرینگر اُس وقت جہلم کی دائیں جانب واقع تھا اور ابھی تک بائیں کنارے کی طرف اس کی توسیع نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے چینی سیاح چن ین، چی مانگ اور فاہیان بھی ہماری تاریخ سے متلعق شواہد بہم پہنچاتے ہیں۔

ممتاز عرب سیاح اور مورخ ابو ریحان البیرونی، جو محمود غزنوی (۱۰۳۱۔۹۹۶ء) کے عہد میں ہند کی سیاحت پر آیا، کشمیر کے بارے میں بہت بڑی حد تک اوروں سے زیادہ اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ اور کشمیریوں کی قوتِ مدافعت و مزاحمت کی داد دیتا ہے وہ اُشکر، گلگت، رجوری کے علاوہ یہاں کی مذہبی رسوم اور تیوہاروں کی تفصیلات دیتا ہے۔

ایک اور عرب سیاح ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق کے عہد میں (۵۱۔۱۳۱۵ء) ہندوستان آیا۔ اُس نے بھی یہاں کے حالات اپنے سفر نامے میں درج کئے ہیں۔

## یورپی ماخز:

۱۸۵۷ء کے غدر نے اگر چہ انگریزوں کی گرفت ہندوستان پر مضبوط کی لیکن جدید تہذیب کی برکتوں سے ہم اُس کے بعد ہی فیض یاب ہوئے۔ سیاسی برتری حاصل کرنے کے لئے کسی بھی بیرونی طاقت کو یہاں کی تہذیب وثقافت سے واقفیت ایک لازمی امر تھی۔ چنانچہ اسی جذبے کے تحت اردو زبان

کی طرف بھی توجہ کی گئی اور علم لسانیات کے پہلو بہ پہلو یہاں کے جغرافیہ، علوم وفنون، تاریخ وعمرانیات کے انگریز ماہروں نے اپنی تحقیقی کاوشیں اطمینان بخش حد تک جاری رکھیں۔ اُن کی دلچسپاں الگ الگ ہونے کی باوجود بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ اُن کی تصانیف، سفرناموں، تحریرات ودستاویزات میں وادی کشمیر سے متعلق کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً ذکر آیا ہے چونکہ لسانیات کا تعلق بھی انسانی تاریخ سے بہت گہرا ہے اس لئے اُن انگریز مفکروں کا ذکر کرنا ضروری ہے جنہوں نے کشمیری زبان وتہذیب پر کوئی نہ کوئی وقیع کام کیا ہے

**جارج ابراهیم گریرسن**: ڈبلن آئیر لینڈ کا رہنے والا تھا۔ ۷رجنوری ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوا۔ اور چیمبر لے انگلستان میں ۱۹۴۱ء میں انتقال کر گیا۔ اُسے بجا طور کشمیری زبان کا محسن اوّل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اُس نے ہندوستانی لسانیات پر کئی کتابیں لکھیں جن میں ایشر کول کے سنسکرت مسودے پر مبنی کشمیری انگریزی ڈکشنری بھی شامل ہے جو ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۲ء تک شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ اُس نے مندرجہ ذیل یادگار تالیفات بھی چھوڑیں۔

۱۔للہَ واکیانی ۔۲۔شِوپرِنے ۔۳۔رامائن (پرکاش بھٹ کوٗری گام) ۴۔کرشنہ اوتار چرت ۔۵۔مینول آف کشمیری لنگویج (۲ جلد۔ گرامر) ایم، پی ایجورتھ: (کشمیری گرامر: ۱۸۴۱ء)

**میجر لیچ**: کشمیری زبان ایک کتاب۔ یہ جرمنی کا باشندہ تھا۔

**ڈاکٹر امزلے**: ایک عیسائی مشنری تھا جو کشمیر ۱۸۶۵ء میں پہنچا۔ اور جس نے ایک غیر معتبر کتاب ۱۸۷۲ء میں کشمیری زبان کے محاورات پر لکھی۔ امزلے ۱۸۷۲ء ہی میں پنجاب جاتے ہوئے گجرات میں واصل بحق ہوا۔

**ڈاکٹر نیو**: عیسائی میڈیکل مشینری ۱۸۸۲ء میں کشمیر آیا۔ اُس

نے کشمیر اور کشمیری زبان سے متعلق چار یادگار کتابیں چھوڑی ہیں۔ اس نے دوسو درختوں اور جڑی بوٹیوں کے سائنسی نام بھی دئے ہیں انہیں اعلیٰ خدمات کے اعتراف کے طور ''قیصر ہند'' کا خطاب بھی ملا۔

**ٹی، رسل وڈے**: کشمیری زبان کا گرامر مطبوعہ ۱۸۸۸ء

**جے ہنٹن نوولز**: یہ عیسائی مشینری کشمیری لوک ادب سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے حاتم تیلی کی کشمیری لوک کہانیوں کا مجموعہ Hatams tales ۱۸۸۵ء میں چھاپا۔ یہ لوک کہانیاں اب کشمیری زبان میں بھی دستیاب ہیں۔ ایک اور کتاب جو کشمیری محاورات وضرب الامثال پر مشتمل ہے ترتیب دی ہے جو رائل ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال کی طرف سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی۔ رایل ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال بھی کشمیری تاریخ کے اہم ماخذوں میں گنی جاتی ہے۔

**فریڈرک ڈِرو**: ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۲ء تک لداخ کا گورنر رہا۔ جس کے دوران اُس نے جموں وکشمیر کے جغرافیہ سے متعلق کتاب The jammu & Kashmir territories لکھی جو لندن میں ۱۸۷۷ء کو چھپی اور جسے اب ساگر پبلکیشنز دہلی نے چھاپا ہے۔

**پروفیسر جارج بُہلر**: بمبئی کے محکمہ تعلیم سے وابستہ تھا۔ اور ۱۸۷۵ء کو سنسکرت مسودوں کی تلاش میں کشمیر پہنچا۔ دیوان کرپارام نے اُس کی بڑی مدد کی۔ اور نوسو مسودے لیکر یہاں سے چلا۔ ۱۸۹۸ء میں فوت ہوا۔ اُس کے مسودوں میں راج ترنگنی کے کشمیر میں تیار کیے گئے مسودے بھی تھے اُس نے یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچائی کہ سبھی دیوناگری مسودے ایک اصل شاردا مسودے کو بُنیاد بنا کر تیار کیے گئے ہیں۔ بُہلر کی رپورٹ رائل ایشیاٹک

سوسائیٹی نے ۱۸۷۷ء میں شائع کی۔ بعد کے محققوں نے بُہلر کی دریافتوں کو کشمیر کی لسانیات و تاریخ کی تحقیق میں برتا۔

**ایل، بی، بورنگ**: ایک انگریز تھا جس نے کشمیری محاورات وضرب الامثال سے متعلق ایک کتاب ترتیب دی، جو ۱۸۶۶ء میں چھپی۔

**ایڈلنگ جوھن کرسٹوف**: ایک جرمن تھا جس نے اور ہندوستانی زبانوں کے علاوہ کشمیری زبان پر بھی ایک مضمون لکھا جو برلن میں ۱۸۰۶ء میں چھپا۔

**ایچ، ایچ، گوڈون**: ۱۸۸۶ء میں کشمیر آیا۔ کشمیری اور بلتی کے محاورات وضرب الامثال کو ترتیب دیا۔

**برنھوڈ کارل فریڈرک**: جرمنی کا باشندہ تھا۔ ۱۸۸۷ء سے ۱۸۸۹ء تک متواتر کشمیری زبان پر مضامین لکھتا رہا۔ محمود گامی کی یوسف زلیخا کا جرمن ترجمہ ۱۸۹۵ء کے دوران شائع کرتا رہا۔

**جے، آر، فرتھن**: بھی ایک جرمن تھا جس نے کشمیری صوتیات کی تفسیر وتشریح کی۔

**ٹی، گواھم بیلی**: انگریز تھا اور اپنی والہانہ پُرخلوص کوششیں شمالی ہندوستان کی زبانوں کی صوتیات پر مرکوز کرتا رہا۔ اُس کی چار کتابیں اور رسالے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے دوران اشاعت کی منزلیں طے کرتے رہے۔

**جے، جے، آبرٹن**: نے سیاحت اور عجائبات Wanderings and wonderings کے نام سے کشمیر سے متعلق ایک مضمون تحریر کیا ہے جو ۱۸۹۲ء میں چھپا۔

**سر والٹر لارنس**: سُیسکس لندن میں ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوا۔ وہ ۱۸۸۹ء میں وارد کشمیر ہوا۔ اُس کے مبارک ہاتھوں میں مشہور :حال بندوبست اراضی کا تاریخی کام انجام پایا۔ جسے کشمیر میں لارنس صاحب کا بندوبست کہا جاتا ہے۔ یہ تاریخ ساز کام اُس نے چھ سال میں انجام دیا۔ ''دی ویلی آف کشمیر'' اُس کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ جسے کشمیر کا قاموس قرار دیا گیا ہے۔ لارنس نے پیر غلام حسن کھویہامی کے تاریخ سے بھرپور استفادہ کیا۔ کشمیری زبان سے متعلق جانکاری کے سلسلہ میں وہ غلام حسن کھویہامی کا مرہون منت تھا۔

کشمیر کے سیاسی، انتظامی اور سماجی حالات کا تذکرہ یورپی مصنفین نے اپنے سفرناموں میں کیا ہے جن کی اجمالی تفصیل یوں ہے۔

**بیرن چارلس ہگل**: یہ جرمن سیاح ۱۸۳۶ء میں وارد کشمیر ہوا۔ اور اُس نے جموں و کشمیر اور لداخ کے بارے میں نہایت ہی دلکش سفرنامہ لکھا۔ جس کا بعد میں کامیاب انگریزی ترجمہ بھی ہوا۔

**ڈاکٹر فرانسس برنیر**: فرانس کا بادشاہ تھا۔ اور اورنگ زیب کے عہد میں دوبار ۱۶۵۶ء اور ۱۶۶۸ء میں کشمیر کی سیاحت کو آیا۔ برنیر مغل دور ہی میں ۱۶۴۴ء میں وارد ہند ہوا۔ بقول ارل سٹاین یورپی محققین اور مورخین تک کشمیر کے صحیح تاریخی حالات اسی ممتاز تاریخ شناس کے ذریعہ پہنچے۔ اُس نے خود یہ کام راج ترنگنی کی مدد سے انجام کو پہنچایا۔ اُس کی کتاب Travels in Mughal Empire میں صفحہ ۳۹۳ سے ۴۶۰ تک کشمیر کا ذِکر آیا ہے

**سر الیکزنڈر کننگھم**: نے ۱۸۵۴ء میں کشمیر، لداخ اور اُس کے گردونواح کے جغرافیہ کے بارے میں لکھا ہے۔ اُس نے بالخصوص

بودھ عہد، سکندر کے حملہ اور ہیون سانگ کی سیاحت کو موضوع بحث بنایا۔ اس کے علاوہ اُس نے ہندوستانی راجوں مہاراجوں اور شہنشاہوں کے جاری کردہ سکوں پر دو کتابیں تحریر کیں جو ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۴ء لندن میں شائع ہوئیں۔ یہ تصنیفات قدیم ہند سے شروع ہو کر مسلمانوں کی فتوحات تک کی مدت کا احاطہ کرتی ہیں۔ آریائی منادر کے فن تعمیر پر بھی کننگھم کا مقالہ رائل ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال کے رسالہ میں ف ۱۸۴۸ء میں چھپا۔

بلیک وُڈس میگزین ایڈن برگ میں ہمالہ پربت کے سفر کا حال ''برف کی سرزمین'' (Abode of Snow) کے عنوان سے ۱۸۷۴ء میں کچھ شماروں میں شائع ہو چکا ہے۔

**ولیم مور کرافٹ اور جارج ٹربیک**: جو ۱۸۱۹ء سے ۱۸۲۵ء تک پشاور، کابل، بخارا، پنجاب، لداخ اور کشمیر کی سیاحت کرتے رہے، نے تفصیلاً ان علاقوں کی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں اِظہار خیال کیا ہے یہ سفرنامہ سب سے پہلے ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا۔ اور اب ساگر پبلکیشنز کی جانب سے دو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

**جی، ٹی، ونے**: (G.T.VGNE) نے ۱۸۳۲۔۱۸۳۸ء تک کے کشمیر، لداخ اور اسکردو کے سفر کا حال اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

**ولیم ویکفیلڈ**: ۱۸۷۵ء میں کشمیر کی سیاحت پر آیا۔ اُس نے اپنی سیاحت کی تین کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ کشمیریوں کی تردستی و تردماغی کا معترف ہے۔ اُس کا انداز بیان دلکش اور حقیقت پسندانہ ہے۔

**سر فرانس ینگ ہسبنڈ**: ۱۸۸۴ء۔۱۸۹۴ء کے

دوران کشمیر اور اس کے گردو نواح مقامات کی سیاحت کر کے اپنے سفر نامہ The heart of the continent میں کشمیر کے بارے میں بھی تصویری وضاحتوں کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

**جارج فورسٹر:** نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معتمد رکن کی حیثیت سے بنگال سے انگلستان پھر شمالی ہند، کشمیر، افغانستان، ایران اور روس کی سیر کی۔ اس طویل سفر کے حالات میں کشمیر کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہ سفر نامہ لندن میں ۱۸۰۰ء میں طبع ہوا۔

**رُت گبلپ آرم سٹرانگ** نے the Sisters under sari نام کی کتاب لکھی جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔

بیرن ارنوف (۱۸۷۷ء[1]) بادو پال (۱۹۳۸ء) فادر جیرم زاویر ۱۸۸۸ء بیلے والیو لا (۱۹۵۶ء)، ایچ، ایچ، بلیو (۱۸۷۳ء ۱۸۷۴ء اور ۱۸۷۵ء) میری ہیلن بولنس (۱۹۲۳ء تا ۱۹۲۵ء) بورن شپھر کانوے بیٹریس (۱۹۲۲ء) سرولیم مارٹن (۱۹۲۰ء)، والٹر ڈیلمر (۱۹۰۶ء)، ڈیلس فریڈرک وارڈر (۱۹۱۵ء) ڈوچھٹی میرین (۱۹۰۲ء) رابرٹ ایڈیسن فُلٹن (۱۹۳۹ء)، جروِس پیرس (۱۹۵۴ء) سی، ایف، گلبرٹ (۱۸۸۷ء) پیٹرک گلی برین (۱۹۵۹ء)، جون مارٹن، ہاینبر جَر (۱۹۰۵ء)، ای، ایف نائٹ (۱۸۹۳ء) ولیم ہنری نائٹ (۱۸۶۳ء) جان مرے (۱۸۳۳ء) ہریٹ جارمیریا (۱۸۷۹ء) نظرویا ویل سیٹیا نووچ (۱۹۳۵ء)، آرتھر نیو (۱۸۹۹ء ۱۹۱۲ء ۱۹۱۳ء)، ایف ارنسٹ نیور (۱۹۳۱ء) ٹینڈل بسکو سیسل ارل (۱۹۲۲ء) رابرٹ تھورپ (وفات ۱۸۶۸ء) تصنیف کشمیر مِس گورنمنٹ، بیٹس گزیٹر (۱۸۸۳ء) ہنری

[1] سال اشاعت، اسی طرح دوسرے ناموں کے ساتھ قوسین میں دیا گیا ہے سنوں کو انہی معنوں میں لیا جائے۔

ہارڈی کول ( کشمیر کی قدیم عمارات مصوّر (۱۸۶۹ء) ڈبلیو۔ جی کووی ( کشمیر کے قدیم منادر۔ ۱۸۶۸ء) سیموئیل بیل، (سی، یو، کی مغربی دنیا کی بودھ دستاویزات چینی سے ترجمہ جلد اول ودوئم ) ودیگر متعدد یورپی سیاحوں، محققوں اور تہذیب شناسوں کی تالیفات وتصنیفات کو تاریخ کشمیر کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لئے زیر نظر رکھنا ہوگا۔

جغرافیائی حالات کسی بھی ملک کی تاریخ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وادی کشمیر کے فلک بوس پہاڑوں، آبشاروں، ندیوں اور آب وہوا نے یہاں کے لوگوں کی زندگی کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالنے میں بہت ہی اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ سبھی چیزیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ لیکن وادی کشمیر ہر طرف سے پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ سر بفلک بر فیلے پہاڑ جو اس کی فصیل کی حیثیت سے عظیم نگہبان کا کام دیتے آئے ہیں، ہماری مدنی اور تہذیبی زندگی پر بھی بارش، سیلاب اور قحط سالی وغیرہ آفتیں ہر دور میں اثر انداز ہوئی ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو جغرافیہ کو کسی بھی ملک کی تہذیب کے زوال وارتقاء میں ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ جموں وکشمیر اور لداخ کی دشوار گُزار گھاٹیاں اس ریاست کو میدان حرب ہونے کے ناتے بہت ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ کشمیر سے بین الاقوامی دلچسپیاں اسکی جغرافیہ کی مرہون منت ہیں۔ کشمیر کے تین خاص پہاڑی سلسلے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم سلسلہ پیر پنچال ہے جو ۵۰ سے ۶۰ میل تک چوڑا ہے اور جو کشمیر کی جنوب اور جنوب مشرقی سرحد ہے۔ درہ بانہال کو پہلے بھی اہمیت حاصل تھی اور آج بھی ہے۔ جواہر ٹنل سے وادی کشمیر بقیہ ہند سے ملی ہوئی ہے۔ جموں۔ سرینگر تقریباً تین سو کلومیٹر مسافت قومی شاہراہ ہر لحاظ سے ہماری زندگی میں شہہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہمالہ پہاڑ کا درمیانی سلسلہ وادی کشمیر کی شمال مشرقی حد ہے۔ اور یہی

پہاڑ دریائے جہلم اور دریائے سندھ کو ایک دوسرے الگ کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ کا اہم درہ، درہ زوجیلا ہے جو لداخ اور کشمیر کو ملاتا ہے۔

زوجیلا ہی سے کشمیر کی شمال مغربی سرحد شروع ہوتی ہے جو کاجی ناگ چوٹی پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ دریائے جہلم کے بائیں طرف درہ حاجی پیر ہے جو کشمیر کو پونچھ سے ملاتا ہے۔

درہ مَربل کشمیر کو کشتواڑ سے ملاتا ہے۔ درہ توس میدان پہلے بھی اور آج بھی پونچھ جانے کا سب سے اہم اور قریبی راستہ ہے۔ درہ دوری کن کشمیر کو گلگت سے اور درہ برجی اسکردو سے درۂ پیر پنچال جوراجوری اور پونچھ کو ہیر پورہ (ہر پورہ شوپیان سے ہوتے ہوئے) جاتا ہے۔ قوانین فطرت کی ہم آہنگی بھی دیکھئے کہ دریاؤں (آبی راستوں) کے ساتھ ساتھ خشکی کے راستے بھی دریاؤں کے کنارے کنارے جاتے ہیں۔ شاید اقبالؒ کو اسی لئے کہنا پڑا۔

کوہ و دریا و غروب آفتاب
من خدارا دیدم آنجا بے حجاب

یہ امر شاید تشریح کا محتاج نہیں کہ انہی دروں سے یہاں کی تاریخ وتہذیب کی تجدید وتغیر کا عمل ابھی تک جاری ہے اور یہ راہیں ہماری قدیم قومی اور بین الاقوامی تاریخی روابطہ کی شناخت نُما ہیں۔ ہماری تہذیب کے ترکیبی عناصر میں مزاحمت ومدافعت کے عنصر کو جو بُنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کو انہی سر بلند آہن پا اور صف شکن پہاڑوں نے تقویت بخشی ہے۔

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں جس کی ہزاروں ندیاں
گُلشن ہے جسکے دم سے رشک جناں ہمارا

## کتابیات:


ا۔ کشیر انڈر سلطانز ۔ ڈاکٹر محب الحسن

۲۔ راج ترنگنی: کلہن (ترجمہ۔ آر۔ ایس۔ پنڈت مطبوعہ ساہتیہ اکادمی)

۳۔ اینشنٹ مانومینٹس آف کشمیر: آر، سی، کاک

۴۔ لل دید: پروفیسر جے، ایل، کون واین، ایل، طالب (مطبوعہ کلچرل اکادمی)

۵۔ شیریں قلم۔ جلد اول و دوئم (مطبوعہ کلچرل اکادمی)

۶۔ سون ادب (کشمیر نمبر) مطبوعہ کلچرل اکادمی

۷۔ نیل مت پوران، جلد اول و دوئم (مطبوعہ کلچرل اکادمی)

۸۔ نۆر آگر۔ مطبوعہ مراز ادبی سنگم کشمیر

۹ تاریخ حسن: پیر غلام حسن کھویہامی

۱۰۔ ہمارا ادب۔ جموں و کشمیر نمبر۔۳۔۸۲۔۱۹۸۱ء ترتیب: محمد احمد اندرابی مطبوعہ: کلچرل اکیڈیمی سرینگر۔ ص۔۳۴۔۱۰۶


٥

# کشمیری زبان: مختلف ادوار اور جہتیں

## پہلی بات

اس مختصر سے جائزے میں کشمیری زبان و ادب کے ادوار اور جہتوں کا تعین کرنا ظاہر ہے بہت مشکل ہے اس لئے میری کوشش یہی رہے گی کہ میں اس موضوع کے تعلق سے اس پر ایک چھچھلتی لیکن جامع طریقہ پر نظر ڈالوں۔ لسانی اعتبار سے کشمیری زبان ہند آریائی درد گروپ سے ہے جو ناگوں اور پشاچوں کے یہاں پر ارتباط و مسکن کا خوش آیند ثمرہ ہے جس کا خاکہ یوں کھینچا جا سکتا ہے:

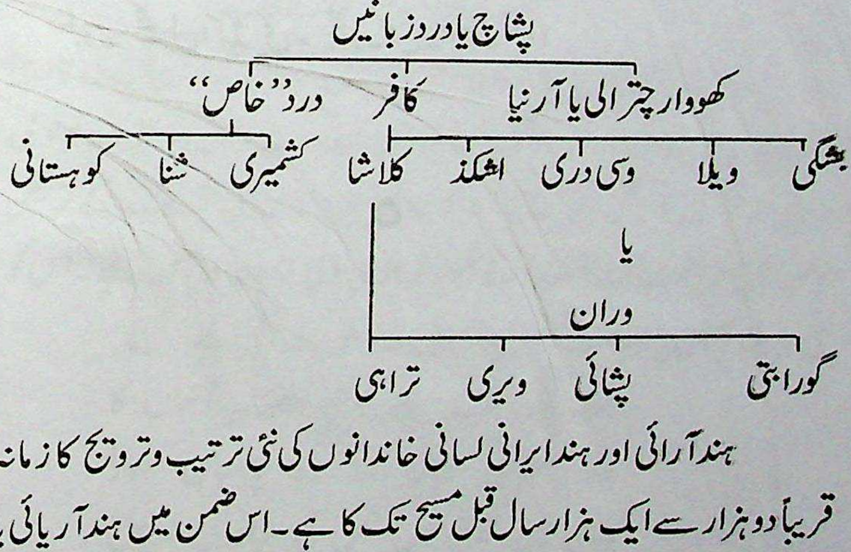


ہند آرائی اور ہند ایرانی لسانی خاندانوں کی نئی ترتیب و ترویج کا زمانہ قریباً دو ہزار سے ایک ہزار سال قبل مسیح تک کا ہے۔ اس ضمن میں ہند آریائی یا ایرانی زبانوں کے پراکرت اور اپ بھرمش مزاج و امتزاج کے مطالعہ سے

بہت حد تک مدد مل سکتی ہے، پراکرت یا اَپ بھرمش دور کو ان زبانوں کی ترقی اور انقلاب کے دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کشمیری زبان کو عبرانی زبان کے لسانی خاندان سے کوئی تعلق نہیں، کیوں کہ عبرانی زبان سامی سے منسلک ہے، اتنا تو ضرور ہوسکتا ہے کہ عبرانی کے کچھ الفاظ کشمیری میں در آئے ہوں۔ جس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ کشمیری زبان عبرانی سے نکلی ہے۔ زبانوں کا لین دین ایک مسلسل غیر مربوط اور غیر مرئی عمل ہے۔ ہاں! تو بات چلی تھی ہند آریائی زبانوں کے اپہ بھرمش اور ارتقائی دور کی جس کے دوران یہ زبانیں برہمیت اور کٹرپن کی وجہ سے عوام کے قریب آنے کے لئے اپنا مزاج زمانے کے تقاضوں کے عین مطابق ڈھالنے کی طرف راغب ہوئیں تاکہ زندہ رہ سکیں۔

کشمیری میں پراکرت کی وہ صورت نظر نہیں آتی جو ہندوستان کی دیگر زبانوں پر حاوی تھی، سر جارج گریرسن (۱۸۵۱۔۱۹۴۱ء) اس معاملہ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:۔

> ''پشاچ اصل میں (سچے معنوں میں) پراکرت نہیں تھی۔ یہ بہت قدیم زبان تھی، اس زبان کی بہن تھی نہ کہ دختر، جو بعد میں اپنا لہجہ، بدلتے بدلتے ادبی سنسکرت بنی، جب ہم اس کا مقابلہ سنسکرت سے کرتے ہیں تو اس کی نُمایاں اور اصولی خصوصیت یہی سامنے آتی ہے کہ یہاں آکر نرم آوازیں سخت آوازوں میں بدلتی ہیں'' [1]

اپنے تاریخی سفر میں یہی پشاچی ہندوستان کی ہند آریائی زبانوں سے اتنی قریب تر ہوتی گئی کہ اس کی شاخ ثمر بار کشمیری کا مطالعہ سنسکرت سے بالکل

---

[1] Linguistic Survey of India

علیٰحدہ کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ گناڈہ کی ''برکتھا'' پشاچی زبان میں تھی جس کی تائید سنسکرت کے زبان دان اور علماء بھی کرتے ہیں۔

''شتی کنٹھ'' کی ''مہانے پرکاش'' بھی اسی سلسلہ کی ایک اور اہم کڑی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خالص کشمیری کی اولین کتاب ہے جسکے برعکس عبدالاحد آزاد نے لکھا ہے کہ ''اس طرز کی عبادت کو جیتی جاگتی کشمیری نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ اُس دور کی کشمیری وہی رہی ہو جو ''مہانے پرکاش'' میں ملتی ہے۔ پروفیسر پرتھوی ناتھ پشپ نے اس زبان کو آپہ بھرنشن مانا ہے۔ اور یہ کشمیری اپ بھرنش اُن کے قول کے مطابق شتی کنٹھ (تیرہویں صدی) کے دور میں سو برس پرانی ہو چکی تھی۔ لیکن اپ بھرنش ہونے کے باوجود یہ عوامی زبان کا نمونہ نہیں ہے کیونکہ جس سنجیدہ فلسفیانہ موضوع پر[1] ''مہانے پرکاش'' لکھی گئی ہے۔ اُس میں سنسکرت اثرات کا قوی اور نمایاں ہونا لازمی تھا اگر عبدالاحد آزاد اسے جیتی جاگتی کشمیری نہیں سمجھے تو اسی لئے کہ یہ عالمانہ ثقل کی حامل ہے پروفیسر پُشپ کا کہنا ہے کہ شتی کنٹھ نے مہانے پرکاش میں سروگوچر دیش کے جو نمونے دیٔے ہیں وہ پراکرت کے مقابلہ میں اپ بھرنش سے قریب ہوتے ہوئے بھی لل دید کی کشمیری سے کچھ زیادہ دور نہیں ہیں[2]۔

شری اوتار کرشن رہبر اس کی زبان کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ آج کی زبان سے بالکل مختلف ہے۔ کئی الفاظ سمجھنے کے باوصف ''مہانے پرکاش'' کے ''واک'' کے اصلی معانی ذہن نشین نہیں ہوتے[3]۔

---

[1] عرفان ذات کا تانترک عملی فلسفہ [2] کشمیری زبان اور شاعری: جلد دوم: صفحہ ۴۹۔ عبدالاحد آزاد مطبوعہ کلچرل اکادمی طبع دوم ۱۹۸۲ء [3] کاشُر ادبچ تاریخ۔ صفحہ ۱۳۷۔ مطبوعہ ۱۹۶۵ء۔ اوتار کرشن رہبر۔

یوں تو ایران اور کشمیر کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات بہت قدیم تھے لیکن اشاعت اسلام کا باضابطہ سلسلہ چودہویں صدی عیسوی میں شروع ہوا جب جناب عبدالرحمٰن سید شرف الدین بُلبل کے ہاتھوں تبتّی شہزادہ رینچن سلطان صدرالدین کے نام سے مشرف بہ اسلام ہوا اور یہاں کا پہلا نومسلم راجہ بنا۔ وہ ۱۳۲۰ سے ۱۳۲۳ء تک کشمیر کا حکمران رہا۔ اس کے بعد پھر سولہ سال تک ہندو راجاؤں کی فرمانروائی رہی جسکے دوران انتشار و پراگندگی کا دور دورہی رہا اور لوگوں کو امن وسکون کی زندگی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ آخر ۱۳۳۹ء میں شمس الدین شاہمیری خاندان کی سلطنت کی بنیاد ڈالتا ہے۔ شاہمیری دور کی حکومت ۱۳۳۹ءؔ سے ۱۵۵۵ء تک برابر قائم رہی۔

**دوسرا دور** لل دید (۱۳۳۵۔۱۴۰۰ء) نے اپنے واکوں کے ذریعہ کشمیر شیومت کی رو سے عرفانِ ذات وعرفانِ حقیقت مطلق کے رازہائے سربستہ افشا کیئے۔ کشمیر شیومت کی سب سے بڑی دین ہندوستانی شیومت کو یہی ہے کہ اس نے عبادات کو رسوم وقیود سے آزاد کیا۔ اونچ نیچ اور ذات پات کے غیر فطری بندھنوں کو توڑ کر ادویت واد کی تعلیم دی۔ وحدت الوجود کا یہ فلسفہ بعد میں یہاں اشاعت اسلام کے لئے زمین ہموار کرنے کا ضامن رہا۔ لل دید بنیادی طور شو یوگنی تھی جس نے بلالحاظ مذہب وملت انسانی وحدت کے گُن گا گا کر کشمیر شیوازم کی ترجمانی کی۔ یہی وہ صحت مند آفاقی قدریں ہیں جنہیں ہم آج بھی دُکھتی انسانیت کے مداوا کے طور سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ کشمیری شاعری کی ابتداء بھی عارفانہ کلام سے ہوتی ہیں۔ لل دید انگریزی زبان کے شاعر چاسر کی ہم عصر ہے دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح کشمیری زبان وادب کی شروعات بھی شاعری سے ہوئی ہے۔ لل دید کی عارفانہ

شخصیت کی بے انتہا عوامی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اسے مسلمانوں للہ عارفہ اور ہندو للہ ایشوری کے نام سے بھی پُکارتے ہیں وہ بجبہاڑہ میں وفات پاتی ہیں اور اُن کے جسد خاکی کو چتا میں جلائے جانے کی بجائے مٹی کے دو کھانے کے برتنوں (ٹوک) کے درمیان میں سے غائب ہو جانے کا ذکر بھی تاریخ میں نہیں ملتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لل دید کا مدفن جامع مسجد بجبہاڑہ کی شمال کی جانب عین دیوار کے درمیان واقع ہے۔ اُن کا یہ مقبرہ مرجع خاص و عام ہے۔ ریشی نامہ میں للہ عارفہ کی وفات کا واقعہ یوں درج ہوا ہے:۔

"چوں آں عارفہ یگانہ خواست کہ در شبستان محبوب بہ کاشانہ رود دو تفارہ آورد یکے زیر پائے گذاشت دوم بالائے سر، گفتندش چہ مے کنی، گفت! خود را از نامحرماں ، پوشیدہ دارم، ایں بگفت و دست بر دست زد۔ تفارہ بر تفارہ نشست۔ بینندگان، حیران شدند، تفارہ از تفارہ برداشتند ۔ دران ہیچ ندیدند۔ ایں قصہ در قصبۂ بجبہاڑہ پرگنہ اسلام آباد متصل مقبرہ سید محمد قریشی واقع شدہ مردمان انجا زیارت کنند"

لل دید کی مستند تاریخ وفات سے متعلق تاریخیں عام طور خاموش ہیں۔ اسی لئے آزاد بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں مگر لل دید کا ولادتِ حضرتِ شیخ نور الدین (۷۷۹ھ) کے وقت زندہ ہونا ثابت ہے[۱]۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ لل دید کا کلام ہمارے لئے لوک ادب کا درجہ

---

[۱] کشمیری زبان اور شاعری ج ۲۔ مصنفہ عبدالاحد آزاد ۔ مرتبہ محمد یوسف ٹینگ صفحہ ۱۴۷

رکھتا ہے جو گذشتہ چھ صدیوں سے سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا۔ ورنہ موجودہ صدی کے ربیع اول تک واکوں کا کوئی مستند مجموعہ چھپ کر سامنے نہیں آیا تھا۔ لل دید کی ازدواجی زندگی نہایت ہی تلخ رہی۔ اس نے علائق دنیوی سے ناطہ توڑ کر شو سے اپنا رشتہ جوڑا۔

لل بوژ ایس سومنہٕ باغس وُچھم شوِس شکت میلتھ تہٕ واہ
تتہِ لے گرہس امربتہٕ سرس زندے مرس تہٕ مےٚ کرِ کیا

ترجمہ: میں لل اپنے آتمارو پی باغ میں داخل ہوئی مجھے سرور حاصل ہوا میں نے وہاں شِو اور شکتی کو ایک دیکھا اور وہیں میں نے اپنے وجود کو امرت جھیل میں پایا۔ میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے میں جیتے مری ہوں۔ میں علائق دینوی سے پاک ہوں۔

آتما کی ابدیت اور دائمیت کو یوں زبان دی گئی۔

أسی أسی تہٕ أسی آسو أسی دور کری پتہٕ وتھ
شِوس سورنہٕ زنہٕ وٚن تہٕ مرُن رَوِس سورِنہٕ اَتہٕ گتھ

ترجمہ: ہم ہی تھے اور ہم ہی ہوں گے اور ہم ہی گردش دوراں میں شامل رہے۔ شِو کے جنم مرن کا کبھی انت نہیں ہوگا، اور سورج کا سفر تا ابد جاری رہے گا۔

وہ روحانی برتری اور آتم گیان حاصل کرنے کے لئے تزکیہٕ نفس کو ازبس ضروری تصور کرتی ہیں۔ کام (شہوت) کرودھ (غصہ) لوبھ (ہوس) اور اہنکار (غرور) کو قابو میں رکھنا اطمینان قلب حاصل کرنے کی خاطر لازم ہے۔ اعتدال وتوازن کو ہاتھ سے جانے دینا راہِ عرفان میں مایوسی کا باعث ہوسکتا ہے۔ حقیقت مطلق سے جاملنے کے لئے دیکھئے وہ کس درجہ مضطرب بھی ہے اور مستعد بھی۔

آمہٕ پنہٕ سٔدرس ناوِ چھس لمان کتہٕ بوزِ دے میون میتہٕ دیہٕ تار
آمین ٹاکین پوٚنی زن شمان دِل چھم برمان گرٕ گژھہٕ ہا !

ترجمہ: میں کچے دھاگے سے سمندر میں ناو کھیتی ہوں، کاش ایسا ہو کہ ایشور میرا بیڑا پار کرے۔ وصل کی شدّتِ احساس سے میری حالت ایسی ہے جیسے کچے برتن سے پانی رستا چلا جائے۔ میرا دل اپنے گھر لوٹنا چاہتا ہے۔

الغرض لل دید آج بھی اپنے فن کارانہ تجربات میں منفرد ہے۔ عبدالاحد آزاد اُن کا شاعرانہ مرتبہ متعین کرتے وقت کہتے ہیں "یہ شاہکار، موجودہ شاعری کا سنگ بنیاد نہیں، کشمیر کے صحیفہ ادب کا آخری باب ہیں" البتہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ لل دید کا کلام اسلامی تصوف اور شیوازم کا حسین امتزاج ہے۔ لل دید کا کلام جاگیردارانہ سماجی قدروں کے خلاف ایک مؤثر اور خاموش بغاوت کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ یہاں پر بھکتی تحریک کی نمائندہ معلوم ہوتی ہے۔ جس کے مبارک ہاتھوں سے نہ صرف واک کی صنف کو تقدیس اور سربلندی نصیب ہوئی بلکہ ہماری مشترکہ آفاقی تہذیبی قدریں بھی محفوظ رہیں[1]۔

حضرت شیخ العالمؒ لل دید کے جواں ہمعصر تھے جو ۷۷۹ھ میں سئدرموج کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اُن کے والد شیخ سالار دین تھے جو سید حسین سمنانیؒ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت شیخ کی ولادت کھی جوگی پورہ میں ہوئی۔ روایت ہے کہ حضرت شیخ نے جنم لینے کے بعد اپنی ماں کا دودھ نہیں پیا تو لل دید کا گزر وہاں سے ہوا جس نے ننھے شیخ کو اپنی چھاتی سے لگاتے ہوئے دودھ پینے کو کہا "پی لے پیارے، پی لے! یہاں آتے ہوئے شرم نہیں آئی تو (دودھ) پینے کو کیوں شرماتا ہے۔ کہتے ہیں کہ لل دید کی چھاتیاں دودھ سے بھر آئیں۔ اور حضرت شیخ نے جی بھر کر دودھ پیا۔ عبدالوہاب شائق

---

[1] لل دید پدم پور، آج کے قصبہ پانپور میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ اُن کا خاندانی گورو سدھ مول تھا۔ لل دید کے نام سے آج بھی ایک چشمہ "لل تراگ" کے نام سے مشہور و منسوب ہے۔ یہ سوتا اب خشک ہو چکا ہے۔ اور ہماری توجہ کا طلبگار ہے تاکہ محفوظ رہ سکے۔

نے اپنی منظوم تاریخ میں یہ واقعہ نظم کیا ہے۔

بطفلی ز شیخ آمدہ کارِ پیر زِ پستان مادر ننوشید شیر

بانگشت شیرش بداداے شگفت للہَ عارفہ درکنارش گرفت

لبن درِ بگوش آردن آمدہ دوانگشت بی بی دوپستان شدہ

حضرت شیخ ۱۹ سال کی عمر میں ترک علائق کر کے کیموہ میں غارنشین ہوئے۔ بارہ سال کی ریاضت کے بعد انہوں نے عارفانہ سیاحت کا آغاز کیا۔ اُن کی قرار گاہیں زیارتوں کی صورت میں آج بھی ژِمَر، دِرے گام روپہ وَن، موکھتہ پوکھری و دیگر مقامات پر عقیدت مندوں کے سکون قلب کا باعث ہیں۔ وہ ۸۴۲ھ میں روپہ وَن کے مقام پر واصل بحق ہوئے۔ ان کی آخری آرام گاہ چرار شریف میں واقع ہے جہاں ہر سال بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ روایت ہے کہ زین العابدین بڈشاہ بھی اُن کے جنازے میں شریک ہوئے۔ ان کی ولادت کے بعد حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی ۷۸۶ھ تک دو دفعہ وارد کشمیر اس سے پہلے وہ ۷۷۴ھ میں پہلی بار کشمیر آئے تھے۔ ان کے فرزند ارجمند جناب میر محمد ہمدانیؒ نے حضرت شیخ کو ۸۱۴ھ میں خطہ ارشاد عطا فرمایا۔ یہ تاریخی دستاویز آج بھی دباغت کئے ہوئے باریک پوست پر خطِ نسخ میں خانقاہ معلیٰ کی نوادرات مقدسہ میں شامل بھی ہے اور محفوظ بھی۔ علمدار کشمیر کی تاریخی شخصیت کے اعتراف میں پٹھان گورنر عطا محمد خان نے ۱۲۲۶ھ میں حضرت شیخ نور الدینؒ اور محبوب العالم حضرت شیخ حمزہؒ کے نام مشترکہ سکہ جاری کیا۔ سکّے کی پیشانی کی عبارت یوں ہے:

سکہّ شد روشن زشاہ نوالدین

رائج از مخدوم قطب العارفین ۲۶ ھ

پشت پر "ضرب خطہ کشمیر" کندہ ہے۔

علمدار کشمیر کے کلام کو بجا طور پر لوگ کشمیری قرآن کہتے ہیں۔ حضرت شیخ اور للِ دید کی شش صد سالہ تقریبات کے سال ۷۸-۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۹ء میں الگ الگ منائے گئے۔ دونوں بزرگ شعراء کی زندگی رُن کی شاعری اور ان کے فن شیانِ شان طریقہ پر کام کیا گیا، تا کہ ہمارا یہ ثقافتی اور ادبی ورثہ محفوظ رہ سکے۔ حضرت شیخ کی قرار گاہوں پر یادگاری کتبے نصب کئے گئے[1]۔ انہیں لوگ احترام و محبت سے نندرشی اور سہر انند بھی کہتے ہیں۔ شیخ نور الدین ولیؒ کے خاندان کا مدفن کیموہ میں ہے جوان کی والدہ سدر موج کے نام سے منسوب ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت شیخؒ نے لوگوں کو اُن کی مادری زبان میں اسلامی تعلیمات کا درس دیا تو بے جا نہیں ہوگا۔ کیوں کہ باہر سے آئے ہوئے مبلغین کی زبان یا تو فارسی تھی یا عربی۔ اگر مادری زبان اس تاریخی مشن میں شامل نہیں ہوتی تو اشاعت اسلام کا کام اتنی سرعت سے اور بغیر کسی مزاحمت انجام نہیں پاتا۔ حضرت شیخ نے یہاں کے مشترکہ تہذیب کی آبیاری اپنے کلام کے ذریعہ کی۔ انہوں نے انسانی برادری، آفاقیت، رواداری، طہارت و پاکیزگی نفس کے نغمے گائے اور یہاں کشمیری رشیت کی بنیاد ڈالی۔ کیوں کہ اسلام پرہیز گاری کو قرب ربِ جلیل کے لئے مقدم سمجھتا ہے، نہ ترک لذات کو ترک علائق یا رہبانیت کی خاطر اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ انسان کی یگانگت اور عظمت کے گیت وہ یوں گاتے ہیں۔[1]

شِو چھے تھلہِ تھلہِ رَوزان موزان ہیوٗ ندتہٕ مُسلمان

تُرکھے چھُکھ پٔنن پان پرزان سوٗے چھے صاحبس زآنی زان

---

[1] یہ سارا مستحسن کام تزک واحتشام سے ریاستی کلچرل اکادمی کے اہتمام سے ہوا۔ این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ترجمہ: سورج کی کرنیں جس طرح کائنات کے ذرے ذرے کو منور کرتی ہیں اسی طرح شو کا جلوہ ساری دنیا میں جاری وساری ہے۔ ہندو اور مسلمان الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو روُپ ہیں۔تو اگر عقلمند ہے تو بھانپ لے کہ تمہارا یہ جسم بھی کسی اور کی امانت ہے۔اس راز کو پانا ہی حق تک رسائی پانے برابر ہے۔

ایک اور شلوک میں انہوں نے زندگی کے جہد مسلسل کی عکاسی اپنے عارفانہ انداز میں کی ہے۔

آیاے یوٚ ت تہٕ گژھو کۄتو  زۄنم نہٕ منٛز ماووۄت پیے
تس کیا کرو اُسی للہٕ پوٚتو  پکان! پکانٛ پکان گۓ !

ترجمہ: ہم یہاں آنے کو تو آئے ،لیکن یہ نہ جانا کہ بیچ میں دوراہا آئے گا، ہماری بساط ہی کیا، ہم جونگوڑے ٹھہرے! ہم چلے! چلے اور بس چلتے بنے!

حضرت شیخ کی شاعری کے موضوعات عرفان الٰہی اور اُسے حاصل کرنے کے ذرائع تقویٰ ، اعتدال ، ترکِ لذات وہوا وحرص ، قرآنی تعلیم ، دنیا کی بے ثباتی، عشق اور موت ہیں۔ دیکھا جائے تو موت کا تصور اُنکے یہاں بہت ہی گہرا اور گھناونا ہے شاید اسلئے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ دُنیا آنی جانی ہے، خدا کا خوف دل کے دامن سے نہ چھوٹے اُن کے عشق کا تصور ارفع واعلیٰ ہے، جو مشیت ایزدی کے تابع ہے۔

قرآن پران کونو مۄدُکھ  قرآن پران دۄ دمنصوٗر
قرآن پران زندٕ کو رۄدُکھ  قرآن پران کوہن گوسوٗر

ترجمہ: قرآن پڑھ کے تو زندہ کیسے رہا، قرآن پڑھ کے منصور جل کے راکھ ہوا۔قرآن پڑھتے دشت وجبل اُڑ کے چکنا چور ہوئے۔

شیخ نورالدین ولیؒ کی ضیا بار شخصیت ہماری مشترک کی زندہ وجاوید علامت ہے۔ وہ کشمیر زبان وادب کے دور کے دوسرے عظیم شاعر ہیں۔ اس پہلی صف میں لل دیدان کے ہم دوش ہے۔ لل دید اور نند ریشی دونوں نے کشمیری شاعری میں عرفان وآگہی کے سوتے جاری کر کے ادب عالیہ کی روایت بھی قائم کی جو تاابد جاری رہیگی۔

دورِ بڈشاہی میں جہاں علم وفن کو بہت فروغ ملا، وہاں کشمیر زبان کو بھی عرؤج حاصل ہوا۔ فارسی، سنسکرت اور کشمیر زبانوں میں تراجم کا کام ہاتھ میں لیا گیا۔

بڈشاہی دور کے کشمیری علماء شعراوا کابرین میں ملا احمد کشمیری، شری ور، یودھ بھٹ اور بھٹ اوتار قابل ذکر ہیں۔ بھٹ اوتار نے ''باناسرودھ کتھا'' کے نام سے اوشا اور انورادھا کی منظوم عشقیہ داستان قلمبند کی۔ ڈاکٹر ششی شیکھر توشخانی کو ''باناسردوھ کتھا'' کا تفصیلی مطالعہ کرنے پر کشمیر یونیورسٹی ی جانب سے ڈی لٹ کی ڈگری چند سال قبل عطا ہوئی۔ سنسکرت کتب کے چند ایک فارسی تراجم اب بھی کشمیر کی ریسرچ لائبیریری میں محفوظ ہیں لیکن کشمیری مخطوطات زمانہ کے دستبرو سے بچ نہیں سکے ہیں، اس لئے ان کے بارے اور زیادہ وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے علاوہ گنگا پرشسٹ کی کتاب ''دکھ چرتم'' بھی شاہمیری دور کی یادگار ہے، جس میں خوش حال زندگی کا فلسفہ سمویا گیا ہے۔ لل دید کے بارے میں بڈشاہ کا درباری مؤرخ جونراج بھی خاموش ہے اور اُس نے علمدارِ کشمیرؒ کا بھی سرسری ذکر کیا ہے۔

حادثات کبھی تاریخ کا رخ موڑ دیتے ہیں ''وہی کشمیری تہذیب'' ثقافت اور زبان کے ساتھ ہوا۔ اگر چودھویں صدی سے سیاسی اور سماجی تبدیلی کے جلو میں فارسی زبان کی بالادستی قائم نہیں ہوتی تو ضرور کوئی ایسا رسم الخط وجود میں آیا ہوتا جو شاردا کی ترقی یافتہ شکل میں وجوٗد پذیر ہوتا۔ اور جو دیوناگری رسم الخط سے بہت حد

تک مماثلت رکھتا جس کے نتیجہ میں شاید کشمیری بہت سی لسانی پیچیدگیوں سے دوچار نہیں ہوتی۔

**کشمیری زبان وادب کا تیسرا دور:** چک خاندان کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے۔ چک خاندان کی حکومت (۱۵۸۶ء سے ۱۵۵۵ء) تک قائم رہتی ہے۔ اس کی بنیاد غمازی چک کے ہاتھوں پڑتی ہے۔ دادِ شجاعت دینے کے ساتھ ساتھ چک بادشاہ دادِ عیش بھی دیتے تھے، انہیں موسیقی، رقص وسرؤد اور فنون لطیفہ سے کافی لگاؤ تھا۔ بالخصوص یوسف شاہ چک کو جس نے پانپور کے قریب چندہار نامی گاؤں کی ایک خاتون (زوُن) جو بعد میں حبہ خاتون کہلائی، سے شادی کی اور جس نے بقول پروفیسر حاجنی کشمیری شاعری میں عشقیہ اور غنائیہ رنگ کی اولین طرح ڈالی، جس کی بناء پر حبہ خاتون ہی سے کشمیری رومانوی شاعری کی ابتداء تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ یہ حیات آفرین کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے بڑی عیاری سے یوسف شاہ چک کو ۱۵۸۶ء میں پٹنہ لے جا کر قید کیا جہاں کشمیر کا یہ خودمختار بادشاہ جلائے وطنی کے دوران جگن ناتھ پوری میں بیمار ہوا اور ۲۲ ستمبر ۱۵۹۲ء میں انتقال کر گیا۔ کسی شاعر نے تاریخ وفات کہی ''یوسف شاہ مرد، فریاد'' بسوک میں آسودہ ہے جہاں کلچرل اکادمی نے ۱۹۷۶ء میں یادگاری لوح نصب کی، جس کے لئے ثقافتی وفد کی سربراہی اُسوقت کے ریاستی وزیراعلیٰ شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے انجام دی۔

ظاہر ہے کہ حبہ خاتون کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ حبہ خاتون نے صنف نازک ہونے کے ناتے فطری طور لوک مزاج اور مقبولِ عام رنگ کو اپنانا۔ اُس نے کشمیری میں نہ صرف نئے نئے شعری اوزان کی بنیاد ڈالی بلکہ لوک ورثہ کو بھی محفوظ رکھا۔ حبہ خاتون کے کلام میں ہجر کی کسک، سوز وگداز، جذبات کا سادہ و بے تکلفانہ اظہار اور سب سے بڑھ کر دیہات کی پرسوز

اور فطری سلے بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت برہا کے نشتر جگر میں چُبھتے محسوس ہوتے ہیں۔ سنگھاسن پر فارسی زبان براجمان ہو اور اس کی لونڈی کشمیری گیت گائے یہ کشمیری کے لئے فال نیک تھا آیئے ذرا حبہ خاتون کے دردِ فراق میں ہم بھی شریک ہو جائیں :-

| | |
|---|---|
| ژِ کمیوٚ سونہٕ میٲنہٕ برٛم دِتھ نیونکھو | تجھے میری کس سوکن نے فریب دے کر بہلایا |
| ژےٚ کوو گی میٲنۍ ڈِ ے | تم مجھ سے کیوں نفرت کرنے لگے میرے محبوب |
| نیصف راٗژن برٛوٚ تھی تھاوٕدِ مے | میں نے تمہارے لئے آدھی رات کو دروازے کُھلے چھوڑ دئے |
| ساتھاہ یکھنا ژِ ے | کیا تم گھڑی بھر کے لئے نہیں آؤ گے |
| شراون شین زن بوگلان آیس | میں ساون کی تیز دھوپ میں برف کی مانند پگھل رہی ہوں |
| باغس پھوٚ جس بہٕ ہی | میں باغ میں جوہی کے پھول کی طرح کھلی ہوں۔ |
| چونے باغ تے ژِے دلو چھاوان | آ! کہ تیرا ہی چمن ہے اس سے لطف اندوز تو ہو |
| ژےٚ کوو گیہِ میٲنۍ ڈِ ے | مجھ سے نفرت کیوں ، میرے محبوب؟ |
| اوٚش چھس تراوان بہٕ ہاژالہ ژالے | میں آنسو کے جھرنے بہار ہی ہوں |
| مےٚ ہابالہٕ گوٚ ژھ ہم ژِ ے ! | مجھے بس تیری ہی آرزو ہے |
| ژِ کوو وتہٕ میٲنہٕ آکھ مشراوان | تم میری راہوں کو کیوں بھول گئے |
| ژےٚ کوو گیہِ میٲنۍ ڈِ ے | مجھ سے نفرت کیوں میرے محبوب؟ |

حبہ خاتون (۱۵۵۳ء سے ۱۶۰۵ء) سے یوسف شاہ ژک کی مفارقت برداشت نہ ہو سکی اور وہ تارک الدنیا ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ وہ اس کے بعد سترہ سال تک زندہ رہنے کے بعد وفات پا گئی۔ اُسے پانتہ چھوک کے مزار شعراء سپرد خاک کیا گیا جہاں ۱۹ ہویں رکواپریل ۱۹۵۲ کو آبائی قبرستان متری گام سے نکال کر پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ دوبارہ دفنایا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حبہ خاتون بسوک (بہار) میں

یوسف شاہ ژک کے پہلو میں آسودہ ہے۔ بقول غالبؔ

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

ارنی مال (۱۷۳۸۔۱۷۷۸ء) کا میکہ پلہ ہالن پٹن میں تھا۔ زمانے کے دستور کے مطابق اس کی شادی بھی بچپن ہی میں بھوانی داس کاچرو (نیکو) جو پٹھان دربار (۱۷۵۲ء سے ۱۷۷۵ء) سے وابستہ تھا سے ہوئی تھی، جب وہ سن بلوغ کو پہنچی وہ جی جان سے اپنے پتی کو چاہنے لگی۔ لیکن بسیار کوششوں کے باوجود وہ اس کا دِل نہ جیت سکی۔ کیونکہ اس کا مزاج دربار کے رنگ میں ڈھل چکا تھا۔

ارنی مال نے اپنے آپ کو درباری رنگ میں ڈھالنے کی پوری کوشش کی۔ اس نے موسیقی بھی سیکھی لیکن اپنے اور اپنے شوہر کے درمیان پیدا شدہ خلیج کو وہ پاٹ نہ سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھوانی داس نے اُسے اپنے رشتہ ازدواج سے خارج کر دیا اور وہ واپس اپنے میکے پلہالن چلی۔ بقول شاد عظیم آبادی ؎
نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے۔

کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

ارنی مال کی شاعری کی اثر آفرینی اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ محمود گامی جیسا ہمہ جہت اور قد آور شاعر بھی اس کے جادو کے اثر سے نہ بچ سکا یہ ۲ دو اشعار ارنی مال کی برہا ماری زندگی کی پوری عکاسی کرتے ہیں۔ وہ غم کی چتا میں جلتی تو ہے لیکن لب پر اپنے محبوب کا شکوہ نہیں لاتی ؎

لکی لاہ اُسُس تھراول ییران — میں کوئل تنکے جوڑ کر اپنا آشیانہ بنا رہی تھی
سونتنہِ وُزملہِ گنڈنم ربہہ — کہ بہار کی بجلی کڑکی اور آشیانہ جل کر خاک ہوا۔

کرِ کیارؤڈم سُہ وٕنِنے پھیران سوران چھُم نو آدنک سرِ بہہ

کیا کروں وہ صیاد جنگلوں میں گھومتا رہا اور گھومتا ہی رہا، لیکن مجھ سے بالی عمریا کی محبت بھلائی ہیں جاسکتی، اس لئے برہا کی آگ میں جل رہی ہوں

**چوتھا دور**: مغل شہنشاہ ہوں (۱۵۸۶ء سے ۱۷۵۳ء) کی یہاں فرمانبروائی میں کشمیری زبان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئے اس لئے اگر دوسوسال کے قریب عرصہ کو کشمیری زبان وادب کیلئے بے ثمر ہی قرار دیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ فارسی زبان میں بہت کام ہوا۔ اسے مغل دربار کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ شاید اسلئے کشمیری زبان کی طرف راغب ہونیکی رندانہ جرأت کسی سے نہیں ہوئی۔ فارسی کا ایک جُھرمٹ وجود میں آیا جس میں ملا احمد شیخ یعقوب صرفیؒ، شیخ داوٗد خاکیؒ، مرزا اکمل الدین بدخشی، خواجہ حبیب اللہ نوشہری، مُلا بہاؤالدین متو بہا، ملاحمید اللہ شاہ آبادی، مُلاّ محسن فانؔی، غنی کشمیری، پچھمن درسرور، چندر بھان برہمن، بھوانی داس کاچرؔو نیکو، اور عبدالوہاب شائق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

فطرت اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اس کی مخفی دیو پیکر قوتوں سے کون انکار کرسکتا ہے۔ کشمیر کی آزادی ۱۵۸۶ء میں اکبر اعظم کے ہاتھوں سلب ہوئی تو کشمیریوں کی زبان بھی دب گئی۔ لیکن پھر ایک بار ارنی مال کے نالہ ہائے فراق کے ساتھ اُبھری اور اس کے نغموں کے سوتے آج تک اُبلتے ہی چلے آرہے ہیں۔ اس دوران خواجہ حبیب اللہ نوشہری (۱۶۱۸۔۱۷۵۵ء) بھی حبہ خاتون اور ارنی مال کے رنگ میں نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ وہ فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں کشمیری زبان ہیتی اِعتبار سے ایک نئی کروٹ لیتی ہے، جب فارسی زبان کے زیر اثر غزل اور مثنوی کی مقبولِ عام

صنفیں محمود گامی (وفات ۱۸۵۵ء) کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں۔محمود گامی نے نہ صرف یہ کہ حبہ خاتون اور ارنی مال کا لوک آہنگ جاری رکھا بلکہ اس نے فارسی تتبع میں غزل کی۔نئی روایت قائم کی محمود گامی کی بیشتر مثنویاں فارسی الاصل ہیں جنہیں وہ کشمیری جامہ پہناتا ہے یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنون، شیرین فرہاد، ہارون رشید، قصہ محمود غزنوی، قصہ شیخ صنعان، بہارنامہ، چوپان نامہ، یک حکایت، وفات نامہ وغیرہ جیسی مثنویاں لکھ کر محمود گامی نے بزمیہ مثنوی کی بنیاد ڈالی۔محمود کی مثنوی یوسف زلیخا کو ایک جرمن مُستشرق انیسوی صدی میں اپنے ساتھ لے گئے اور اس پر ایک تاریخی رسالہ میں ۱۸۹۵ء میں جرمنی زبان میں ایک مضمون لکھا۔محمود نے کشمیری زبان میں موضوعی نظمیں لکھنے کی روایت کو آگے بڑھایا۔محمود گامی کے دوسرے ہم عصر شعرائمیں مقبول شاہ کرالہ واری (۱۸۷۷ء۔۱۸۲۰ء) لکھمن کول بلبل ناگامی (۸۴۔۱۸۱۲ء) ولی اللہ متو (وفات : ۱۸۵۸ء) پرکاش بٹ کریگامی (وفات : ۱۸۵۸ء) عبدالاحد ناظم (وفات ۱۸۵۱ء) قابل ذکر ہیں۔مقبول شاہ کرالہ واری کی ''گلریز'' (مثنوی) فارسی الاصل ہونے کے باوجود ہمارے لئے زندگی کی ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے اور بلا شبہ شہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ لکھمن کول بلبل کی مثنویاں ''سامنامہ'' نل ودمن، آدم نامہ، ادم نامہ چائے نامہ، پڑھ کر اس کی بے پناہ خلاقانہ صلاحتیوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔اختصار وایجاز اس کا سب سے بڑا اعجاز ہے۔ولی اللہ متو نے کشمیر کی روایتی تاریخی داستان ''ہی مال نآگر رائے'' کو بڑی کامیابی سے نظم کا جامہ پہنا کر اسے دوام بخشا۔عبدالاحد ناظم کی دو مثنویاں ''زین العرب'' اور ''منصور نامہ'' قابل ذکر ہیں۔محمود گامی کے ایک اور جواں سال ہم عصر رسول میر شاہ آبادی بقول عبدالاحد آزاد، تغزل کیلئے بہترین دل و دماغ لیکر

آئے تھے، انہوں نے محمود گامی کے بعد کشمیری غزل کو غیر معمولی ترقی دی اور جذباتی سحر کاری نے اس میں ایسا سماں باندھا کہ دورِ حاضر کے بلند پایہ غزل گو حضرت مہجور اُنکی تقلید پر فخر کرتے ہیں۔ رسول میر (وفات: ۱۸۸۹ تا ۱۸۹۲ء[۱]) کشمیری غزل کو نیا رومانوی اور ارضی آہنگ دے کر نئی وسعت عطا کرتا ہے۔ میر کی غزل میں عورت محبوب کے روپ میں در آتی ہے۔ اس سے پہلے کشمیری شاعری عورت عاشق تھی اور مرد معشوق یا یوں کہیے کہ واردات قلبی کو موثر طریقہ پر بیان کرنے کیلئے عورت کی زبانی ہجر و سال کے مضامین ادا کئے جاتے تھے[۲]۔ نعت گوئی اور طنز و ظرافت کی بنیاد بھی اسی دور میں پڑتی ہے۔ مقبول کرالہ واری کی دو طبعزاد مثنویاں ''گریس نامہ'' اور ''ملہ نامہ'' زبان زد عوام و خواص ہیں۔ ناظم و محمود کی نعتیں آج بھی بہت مقبول ہیں۔

رزمیہ مثنوی کا آغاز پرکاش کُرَی گامی (وفات ۱۸۵۸ء) ''کوشُر راماین'' سے کرتے ہیں۔ پرکاش بھٹ کی دوسری مثنوی ''اِکہ نندن'' ہے جو تزکیۂ نفس کے ضمن میں کشمیر کی روایتی اور اساطیری داستان ہے اور راہ حق میں قربانی اور ایثار کے جذبہ سے مملو ہے۔ پرکاش بھٹ کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے۔ کہ اس نے مقامی رنگ سے اس رزمیہ کو جاندار اور لافانی بنایا ہے۔ انتخاب الفاظ روانی جذبات نگاری و واقعہ نگاری ان تخلیقات عالیہ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ رزمیہ نگاروں میں وہاب پرے

---

۱ کلیات رسول میر'' مرتبہ محمد یوسف ٹینگ۔ مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی (۱۹۸۴ء) ۲ اس سے قبل رسول میر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ۱۸۶۵ء میں فوت ہوئے ہیں۔ ہندوستانی عورت کی وفاشعاری مثالی تھی جو اپنے شوہر کی موت پر جلتی چتا میں کود کرتی ہوتی تھی۔ یہ رسم اب ٹوٹتی جارہی ہے۔ کشمیر کی تاریخ میں اس کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں

(۱۹۱۴ء۔۱۸۴۶ء) امیر شاہ (۱۳۵۶ء۔۱۲۵۶ء) غلام محمد حنفی (۱۹۲۷ء۔۱۸۶۸ء) محمد اسماعیل نامی (۱۹۴۳ء۔۱۸۸۲ء) مولوی صدیق اللہ (۱۹۰۰ء۔۱۸۳۲ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں جنہوں نے شاہنامہ، اکبرنامہ، سامنامہ، جنگ امیر حمزہ، جنگ احد، مغازی النبیؐ، ظفرنامہ، خاورنامہ، جنگ علقمہ سکندرنامہ، تخلیق کر کے کشمیریوں کی ٹھنڈی اور لمبی راتوں کو، کوتاہ کر کے اُن کی رگوں میں دوڑتے لہو کو گرمایا۔ اس سے کم سے کم صدیوں کی غلامی کے احساس کو شاید کم ہونے میں مدد ملی۔ اس کے علاوہ جنگ عراق (پیر عزیز اللہ حقانی۔ (۱۹۲۸ء۔۱۸۵۴ء) سید مظفر شاہ کریری (۱۹۳۷ء۔۱۸۶۷ء) کا جنگ مختار، جنگ موتہ (عبد الغنی ٹھوکر، ولادت۔۱۹۲۰ء) دیگر جنگ نامے بھی اپنی اپنی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔

کشمیری زبان میں مثنوی نگاری پر اپنی رائے دیتے ہوئے عبدالاحد آزادؔ لکھتے ہیں کہ ''کشمیری میں مثنویاں اکثر عشقیہ ہیں یا رزمیہ اور قریب قریب سب کی سب فارسی اور اُردو، رزمیہ اور عشقیہ داستانوں کے ترجمے ہیں فارسی شعرأ کی طرح کشمیری شاعر بھی عشقیہ مثنویوں میں سراپا، شادی، وصل و ہجر اور غم و شادمانی کے واقعات لکھتے وقت طبیعتوں پر خوب زور لگاتے ہیں۔ فارسی استاد عشقیہ مثنویوں میں وصل و زفاف کے واقعات کے مرقعے جن الفاظ میں کھینچتے ہیں۔ کشمیری شاعر ہجو بات میں بھی ویسی باتیں زبان پر نہیں لاسکتے''۔

جناب علی جواد زیدی ''کشمیری زبان اور شاعری'' (جلد دوم) کے مقدمہ میں کشمیری زبان میں مختلف اصناف سخن کے وجود پذیر ہونے سے متعلق بجا طور فرماتے ہیں۔ ''افغانوں کے زمانے میں کشمیری کے احیاء اور

کشمیری کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کا ادبی سٹیج پر جلوہ گر ہو جانا کشمیری ادب کے بلوغ کی علامت ہے۔ اس دور میں تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی ہوئی ہے جن میں مثنوی، قصیدہ، غزل نعت مرثیہ، شہر آشوب، ہجو، قطعہ، نظم اور رباعی وغیرہ سبھی شامل ہیں"۔ سچ پوچھئے تو مثنوی کی صِنف کو اب کوئی پوچھتا بھی نہیں حالانکہ بیانیہ شاعری کے لئے یہ موثر ترین صنف سخن ہے[1]۔

اسی دور کے نعت گو شعراء میں حبیب اللہ نوشہری (وفات۔۱۰۲۷ھ) قطب الدین واعظ (وفات:۱۲۷۴ھ) میر ثناء اللہ کریری مقبول کرالہ واری عزیز اللہ حقانی، عبدالاحد ناظم، غلام قادر سائل (۱۹۵۴ء-۱۸۸۹ء) مولوی صدیق اللہ، محمود گامی وغیرہ شامل ہیں۔ عبدالاحد نادمؔ اس میدان میں سب سے آگے ہیں۔ ان کا درجہ کشمیری زبان میں نعت گو کی حیثیت سے ممتاز ہے۔ ان کی نعتوں میں مولانا جامیؒ کی سی اثر آفرینی اور سحر کاری ہے نیازمندی میں بھی وہ اُن سے پیچھے نہیں۔

دھارمک ادب اور لیلاؔ میں لکھنے کی ابتداء اگر دیکھا جائے تو لل دید سے ہوئی لیکن روپہ بھوانی (۱۷۲۱ء-۱۶۲۵ء) بھی واکوں کی صورت میں اس صنف کو آگے لے جاتی ہیں پر کاش کری گامی، پرمانند (۱۸۷۹ء-۱۷۹۲ء) لکھمن کول بلبل، کرشن رازدان (وفات ۱۹۲۶) مانہ جو عطار، ٹھوکر منوٹی، وغیرہ بھی دھارمک ادب کا قابل قدر ورثہ چھوڑ چکے ہیں۔ شاہ غفور، شمس فقیر، شاہ قلندر اور صمد میرؔ اور دوسرے شعراء نے بقول موتی لال ساقیؔ ایسے وژن لکھے ہیں جو براہ راست لیلاؤں کے زُمرے میں آسکتے ہیں۔

---

[1] اس سلسلہ کی آخری کڑی احد زرگر کی مثنوی ''گل صنوبر'' مانی جاتی ہے۔ جو ۱۹۷۰ء کے بعد کی تخلیق ہے۔ حالیہ برسوں میں چند ایک قابل توجہ کوششیں کیگئی ہیں

شامہ بی بی نے حضرت شیخ نوالدین رشیؒ کے انتقال پر مرثیہ لکھ کر اس صنف کی کشمیری میں ابتدا کی ہے لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ پٹھانوں کے دور رہی سے یہ صنف آگے بڑھنا شروع ہوتی ہے۔ مرثیہ نگاروں میں منشی محمد یوسف (۱۷۸۹ء۔۱۸۸۳ء) منشی محمد علی (۱۸۲۹ء۔۱۹۰۲ء) منشی عباس (۱۸۸۹ء۔۱۹۴۴ء) منشی محمد صادق (۱۸۹۷ء۔۱۹۷۰ء) منشی صفدر (وفات: ۱۸۹۶ء) منشی حسین علی (وفات ۱۸۵۳ء) منشی احمد علی غازی (۱۸۵۳ء۔۱۹۲۳ء) مرزا ابوالقاسم (وفات: ۱۸۹۶ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں جنہوں نے اس اہم صنف سخن سے کشمیری شاعری کو یہ فطری جہت بھی عطا کی جس کے بارے میں عبدالاحد آزاد یوں رقطراز ہے:۔

''شاعر جو نظم، غم اور ماتم کی حالت میں لکھتا ہے اس کو مرثیہ اور نوحہ کہتے ہیں کیونکہ یہ جذبات دوسرے جذبات سے پر جوش اور پر خلوص ہوتے ہیں اس لئے مرثیہ کو اہم ترین صنف سخن اور حقیقی شاعری کہا جاتا ہے''۔ کشمیری میں مراثی کا بیشتر حصہ شہدائے کربلا کے ماتم میں لکھے گئے ہیں۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں جدید دور کا آغاز ہونے کے ساتھ ساتھ لسانی سطح پر بھی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ تحقیق و تراجم کے ذریعہ تہذیبی ورثہ کا تحفظ بھی ممکن ہوا اور اس کی توسیع بھی۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہیں ہوگا کہ ہندوستانی لسانیات اور تہذیب سے متعلق تحقیق و تدوین کا بیشتر اور مستند کام عیسائی مشنریوں، یورپی مصنفین سیاحوں، تاریخ دانوں اور ماہرین السنہ نے کیا ہے یہی بات کشمیری زبان پر بھی صادق آتی ہے۔ ڈاکٹر بہلر (۱۸۳۷ء۔۱۸۹۸ء) سر جارج گریرسن (۱۸۵۱۔۱۹۴۱ء) سر ارل سٹائن (۱۸۶۲ء۔۱۹۴۳ء) سر والٹر لارنس، سر رچرڈ ٹمپل، ہنٹن نولز، کے نام سرفہرست ہیں جنہوں نے تحقیق، لسانیات الفت نویسی، تاریخ شناسی، دیگر شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دئے۔ کشمیر کے

جید سنسکرت عالم ایشر کول (۱۸۳۳ء۔۱۸۹۴ء) کی تیار کردہ کشمیری زبان کی سنسکرت لغت[1] کی بنیاد پر ہی گریرسن کی کشمیری لغت تیار ہوئی۔ کشمیری زبان کا پہلا گرامر ''شبدامرت'' بھی ایشر کول ہی کی تحقیقی اور عالمانہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اسکے یہ دو کارنامے اپنی ناگزیر ہیت کے باوصف لسانی اور تاریخی اہمیت برقرار رکھیں گے۔

انیسویں صدی کشمیری زبان کیلئے بھی بڑی زرخیز ثابت ہوئی۔ ایک طرف جہاں کشمیری غزل کو ارضیت، رفعت ملی، دوسری اصناف سخن سے اس کا دامن مالا مال ہوا تو دوسری طرف عالم بالا کی طرف بھی پرواز جاری رہی اور ہمارے شعراء نے لل دید اور حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کی قائم کردہ عرفانِ ذات وکائنات کی ابدی روایت کو آگے بڑھایا، مابعد طبعیاتی دنیا کی سیر کی گئی۔ انسان کی داخلی دنیا کے اندرون کو کھنگال کران گنت سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کی سعی ہوئی۔ ہمہ اوست، ہمہ از دست، وحدت الوجود، پر کبھی رندانہ اور کبھی عارفانہ نگاہ ڈالی گئی۔ دنیا کی بے ثباتی، خدائے برتر کی قیومیت وابدیت، حیرت وارفتگی جیسے موضوعات کو بڑے دل نشین انداز میں بیان کیا گیا۔ کشمیری شعراٗ کے تصوف کو نہ ہم خالصتاً اسلامی تصوف کہہ سکتے ہیں اور نا ہی شاستر۔ یہ ایک امتزاج ہے جسکے پیچھے یہاں کی روایات جو ہمارے لاشعور پہ چھائی ہیں، کا بڑا عمل دخل ہے۔ یہاں رشیت ہے جو راہبانہ زندگی کے ساتھ ساتھ انسانی سماج کی آفاقی قدروں کی آبیاری کرتی ہے۔ یہاں ریشیوں منیوں کا اگلے وقتوں سے چلا آیا ادویت واد ہے، ترکا شاستر ہے، شیو شکتی کا تصور ہے، بدھ مت اور شیو مت کی اعلیٰ قدریں ہیں جو سب کی سب ہماری صوفیانہ شاعری

---

[1] اس کا نام ''کشمیری سنسکرت کوش'' تھا

کی اثاث بھی ہیں اور زینت بھی ۔ یہاں اللہ تعالیٰ کا لاشخصی تصور توحید کا راسخ عقیدہ ہے۔ جو وحدت انسانیت کی تعلیم دیتا ہے اور اسلام کا بنیادی رکن بھی ہے ان سبھی تصورات کو کہیں مجازی رنگ میں اور کہیں تمثیلی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ بات ایک ہے، چاہے جس طرح بھی کہی جائے ۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

منزل ایک ہے راہیں الگ الگ۔ صوفی شعراء میں رحمان ڈار (وفات: ۱۸۹۷ء۔) روپہ دید (وفات ۔۱۷۲۴ء) شمس فقیر (۱۸۳۹ء۔ ۱۹۰۳ء) سوچھِ کرال (وفات ۔ ۱۱۷۱ھ مطابق ۱۷۵۴ء) رحیم صاٗب (وفات ۔ ۱۸۷۰ء) صمد میر (۱۸۹۴۔ ۱۹۵۹ء) اور عبدالاحد زرگر (۱۹۰۵۔ ۱۹۸۴ء) سرفہرست ہیں۔ اسد میر (۱۸۷۷۔ ۱۹۲۸ء)، اسد پرے (وفات ۔ ۱۹۲۰ء) بہودر گنئے، شاہ غفور، شاہ قلندر (وفات ۔ ۱۷۵۰ء)، نعمہ صاٗب سری نگر (۱۸۰۵ء۔ ۱۸۸۰ء) نعمہ صاٗب صفاپوری (۱۸۶۳ء۔ ۱۹۶۳ء)، کرم بلند (۱۷۶۵ء۔ ۱۸۵۵ء) اور وازہ محمود کے نام بھی اس ضمن میں قابل ذکر ہیں جنہوں نے عشق کی رہ نوردی میں ابدی نشانات چھوڑے ہیں۔ ''اکہ ننذن'' یہاں تزکیۂ نفس کی علامت ہے جس پر کئی شعراٗ نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس روایتی داستان کو اشاعت اسلام کے بعد بھی اس لئے مقبولیت حاصل رہی کیوں کہ قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے اپنے فرزندار جمند حضرت اسماعیلؑ کو اللہ کی رضا کیلئے قربان کرنے کا ذکر آیا ہے حضرت ابراہیمؑ اس آزمائش میں پورے اُترے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے ایک مینڈھا ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اس روایت کے تسلسل میں حج کے موقعہ پر مسلمانوںؑ کی طرؔف سے ہر سال عید الاضحیٰ کی مقدس تقریب پر بھیڑ، بکرے و دیگر چوپایوں کی قربانی دی جاتی ہے۔ جو تزکیۂ نفس کی علامت ہے

انیسویں صدی کی سب سے اہم اور مضبوط کڑی کشمیری زبان کے برگزیدہ اور موجودہ دور کے ممتاز صوفی شاعر احد زرگر کی ذات کے روپ میں بیسویں صدی سے جڑ جاتی ہے، جو کشمیر کی مشترکہ اور امتزاجی تہذیب کی آئینہ دار بھی ہے اور امین بھی۔ احد زرگر کی آواز بے شک منفرد بھی ہے اور ایک قابل قدر روایت کی انتہا بھی۔

**دورِ جدید**: موجودہ صدی کی تیسری دہائی سے دورِ جدید کی شروعات مہجورؔ کی شاعری سے ہوتی ہیں جب وہ نہ صرف حبہ خاتون، رسول میر کی قائم کردہ روایات محفوظ ہی رکھتا ہے۔ بلکہ انہیں زمانے کے تقاضوں کے مطابق وسعت بھی عطا کرتا ہے، یہ مہجورؔ کی خوش بختی ہے۔ کہ اُسے ایسا پرآشوب دور نصیب ہوا جب سارے برصغیر میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور یہاں کے عوام شخصی راج کے خلاف لڑنے کے لئے سینہ سپر تھے، تحریک و انقلاب کی صدائے بازگشت اس کی شاعری میں صاف سنائی دیتی ہے، گوکہ وہ فطرت سے ایک حسن شناس اور رومانوی مزاج لے کر پیدا ہوا تھا لیکن کسی بھی قوم کی زندگی میں بحرانی کیفیت سے کوئی بھی شاعر، ادیب یا فن کار دامن نہیں بچا سکتا۔ مہجورؔ کو کشمیری زبان وادب کی تاریخ میں کئی لحاظ سے اولیت حاصل ہے۔ اس کا کلام گراموفون ریکارڈوں کے روپ میں صدا بند ہوا۔ اُسے محمودؔ شہری جیسا خوش گلو فن کار ہاتھ آیا جس کی وجہ سے اس کی شہرت میں وسعت و سرعت آئی۔ وہ پہلا کشمیری شاعر ہے جو سرکاری اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔ مہجورؔ کی زندگی اور کارناموں پر پہلی بار اردو اور کشمیری میں فلم تیار کی گئی جس میں اس کا رول فلمی دنیا کے صف اول کے فن کار بلراج ساہنی نے ادا کیا۔ اُسے قومی شاعر کے خطاب سے نوازا گیا۔ یہی وہ وقت ہے جب کشمیری ادب کو

نور محمد (وفات: ۱۹۶۵ء) جیسا محسن اول نصیب ہوا، جس کی مساعی جمیلہ سے کتابچوں کی صورت میں مہجور (وفات ۱۹۵۲ء) اور آزاد (وفات: ۱۹۴۸ء) اور دوسرے شعراء کی تخلیقات چھپ کر منظر عام پر آئیں۔ وہ بلا شک کشمیری زبان کی خاطر نول کشور کا درجہ رکھتے ہیں۔ عبدالقدوس رسا (۱۸۰۷-۱۹۷۹ء) جاوِدانی نے بھی کشمیری زبان کی شعری روایات کو پیر پنچال کے پار کشمیر صغیر بھدرواہ میں اپنا منفرد اور تخلیقی آہنگ عطا کر کے نئی جہتوں سے ہمکنار کیا۔

حادثات زمانہ کے اثرات کسی دور کے سبھی ہمعصر شعراء پر یکساں نہیں پڑتے۔ اس بات کا ثبوت عبدالاحد آزاد ہے، جو مہجور کے حاوی رومانوی مزاج کے برعکس کشمیری شاعری کو طبقاتی شعور عطا کرتا ہے، وہ کشمیری شاعری کو نیا آہنگ دینے میں پیش پیش ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب ملک گیر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر یہاں بھی ادبی اور ثقافتی تحریکیں زور پکڑنا شروع کرتی ہیں۔ مواد و ہیت دونوں لحاظ سے یہاں کے شعراء نے اثرات لئے۔ ماسٹر زندہ کول (۱۸۸۴ء-۱۹۶۶ء) کی شاعری پر ٹیگور کے اثرات کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دور کے بعد کے دوسرے ممتاز شعراء اور ادباء میں دینا ناتھ نادم (۸۸ - ۱۹۱۶ء)، میر غلام رسول نازکی (۹۸-۱۹۱۰ء) رحمان راہی (ولادت-۱۹۲۵ء) امین کامل (ولادت: ۱۹۲۴ء)، پروفیسر محی الدین حاجنی (۹۲ - ۱۹۱۷ء) غلام احمد فاضل (ولادت: ۱۹۱۶ء) ہیں۔ عبدالجبار خاموش کریری (۷۳ - ۱۹۱۷ء) اور ارجن دیو مجبور (ولادت: ۱۹۲۳ء) ہیں جنہوں نے روح عصر کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی اور نئے کامیاب فنی تجربے کئے۔ دینا ناتھ نادم، مرزا عارف، رحمان راہی، وغیرہ نئی کشمیری نظم کو اپنا منفرد آہنگ عطا کرتے ہیں۔ امین کامل و دیگر شعراء حضرات غزل کی نئی طرح ڈالتے ہیں۔

ان کی طنز کے تیرونشتر کبھی رائیگاں نہیں جاتے ۔مرزا عارف ، میر غلام رسول نازکی اور خاموش کریری کی رباعیاں اپنی مثال آپ ہیں جن میں فکر کی آنچ بھی ہے اور درد کی چاشنی بھی ۔نادمؔ بھرپور انداز میں اوپیرا کو مستحکم بنیاد فراہم کرتے ہیں ۔اگست ۴۷ء میں آزادی کے بعد ہندوستان کی تہذیب ایک نئی کروٹ لیتی ہے جس کے ساتھ ساتھ اظہار و ابلاغ کے وسائل و ذرائع کو بھی وسعت ملتی ہے، اختر محی الدین (ولادت ۔۱۹۲۸ء) کشمیری زبان کا پہلا افسانہ نگار ہے جس نے افسانے کو زندگی کے نہایت قریب لاکر اس کی ترقی کے امکانات کو روشن کیا، اور آج بھی جدید سے جدید تر کی جستجو میں ہے ۔بنسی نردوشؔ ، ہری کشن کول ، رتن لال شانتؔ ، اوتار کرشن رہبرؔ وغیرہ کشمیری افسانے کو نئی جہتیں عطا کرنے کی کامیاب کوششوں میں مصروف ہیں ۔صوفی غلام محمد کے افسانے اور خاکے بھی اپنی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں ۔ ناول کی طرف ہمارے ادیب زیادہ توجہ نہیں دیتے ۔علی محمد لون کے ''ہم بھی انسان[۱]'' اور اختر محی الدین کے ''دوۂ دگ'' ،بنسی نردوش کے ''ایک دور'' ناولوں کے بعد اب غلام نبی گوہرؔ کے ناول ''مجرم مئیل (وصل)، پُن اور پاپ[۲]'' ہی ہمارا سرمایہ افتخار ہیں ۔ناول اور افسانہ کے مقابلہ میں ڈرامہ تہذیب و زبان کے تقاضوں کا ساتھ دے رہا ہے، شاید اس کے پیچھے ریڈیو، دوردرشن کے علاوہ سٹیج کے موثر دستیاب ذرائع کا ہاتھ ہے ۔ ہمارے کامیاب ڈرامہ نگاروں میں علی محمد لون ، موتی لال کیمو، سومناتھ سادھو (وفات :۱۹۸۲ء)، پشکر بھان ، محمد سبحان بھگت اور سجود سیلانی ہیں جنہوں نے کئی نئے کرداروں کو جنم دیا اور کہیں لوک روایت کا بھرپور تخلیقی استعمال کر کے سماجی زندگی کے مختلف

---

۱۔ اَسہِ تہٕ چھہِ انسان'' ۲۔ یہ ناول دو سال سے زائد عرصہ کیلئے ریڈیو کشمیر سے سلسلہ وار نشر ہوا اور اب ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ہے۔

پہلوؤں کو بے نقاب کیا۔ جواں تر نا ٹک کاروں میں فاروق مسعودی، شمس الدین شمیم، بشیر دادا وغیرہ پر ہماری نظریں لگی ہوئی ہیں۔

۱۹۵۸ء میں کلچرل اکادمی کا قیام ریاست کی تہذیب وثقافت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے کشمیری زبان کی باضابطہ تنظیم وتدوین کا مستحق کام شروع ہوا جو آج بھی جاری ہے۔ کشمیری زبان وادب کے بانی کاروں لل دید، شیخ العالمؒ، وہاب پرے، امیر شاہ کریری، پرکاش کری گامی، کرشن جوراز دان، پرمانند، عبدالاحد آزاد عبدالاحد نادمؔ، غلام نبی عارفؔ، شمس فقیر، صمد میر، مقبول شاہ کرالہ واری، مہجورؔ اور رسول میر کی تخلیقات کو یکجا کر کے شائع کی گیا ہے۔

اکادمی کی ہمہ جہت کوششوں کا تفصیلی جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں لیکن یہ بات بلا تردد کے کہی جاسکتی ہے کہ اس کا وجود ریاست جموں وکشمیر کے ثقافتی اَحیاء کا ضامن ہے اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو کشمیر کا قیام بھی یہاں کی تمدنی زندگی میں ایک انقلاب سے کم نہیں۔ اس سے کشمیری زبان کے سامعین کا وسیع حلقہ ایک ہی رشتہ میں جڑ گیا۔ زبان، موسیقی ڈرامہ اور دوسرے ثقافتی شعبوں میں اس کا رول بھی اہم رہا ہے جو یہ ادارہ کئی کوتاہیوں کے باوصف، بڑی خوبی سے نبھا رہا ہے۔ دوردرشن اور نظامت اطلاعات جموں کشمیر کی زبان وادب اور ثقافت کے فروغ کے ضمن میں جاری مستحسن کوششوں کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی میں شعبہ کشمیری کا وجود میں آنا کشمیری زبان وادب کے ارکان ثلاثہ کی تکمیل ہے یہاں کشمیری میں ایم، اے پڑھانے کے علاوہ پی، ایچ، ڈی کی ڈگری بھی دی جاتی ہے۔ کشمیری زبان مین دوسری زبانوں کی طرح طالبؔ، ماہرؔ اور کاملؔ کے امتحانات بھی لئے جاتے ہیں اور اب

کالج سطح پر کشمیری ایک الیکٹو سبجیکٹ کے طور مرحلہ وار رائج کرنے کے اقدامات بھی کیئے جا رہے ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی کا شعبہ کشمیری بنیادی کتابیں چھاپنے کا اہم ادارہ بن رہا ہے[1]۔

**ایک بات اور**: اس صدی کی چھٹی دہائی میں سیاسی مقصدیت کا جادو ٹوٹ جاتا ہے۔ فریب شکستی کے نتیجہ میں داخلی تجربات کی دنیا اور بھی گہری اور گھناؤنی ہو جاتی ہے۔ ترقی پسندیت کا زور بھی گھٹ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو ایسی نئی شاعری بیشتر صورتوں میں نقالی سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ کیوں کہ ہمارے یہاں ابھی تک نئی ترقی پذیر دنیا کی بھر پور صنعتی پرچھائیاں پڑنا باقی ہیں اور طبقاتی سماج کا وجود بہت دور کی بات دکھائی دیتی ہے۔ شاید یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ ہمارے یہاں غیر طبقاتی سماج کا بول بالا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دورِ جدید کی نعمتوں اور زحمتوں سے ابھی ہم نا آشنا ہی ہیں عمل اور ردعمل کے ان مراحل سے گزرتے ہوئے کشمیری زبان اپنی اصلی دھرتی پر قدم جما کر آفاقیت کی سرحدیں چھو رہی ہے۔ اس میں مقامیت آگئی ہے، اصلیت و واقعیت سما گئی ہے، نئی پیکر تراشی، شبیہہ کاری، دروں بینی اور کرب آگہی، تازکاری اور زبان سازی نے جنم لیا ہے۔ شاعر اور ادیب محدود، اور کھوکھلی سیاست کا غلام نہیں۔ نئی پیڑھی کے شاعروں اور ادیبوں میں غلام نبی خیال، مظفر عازم، ڈاکٹر مرغوب، موتی لال ساقی، مشعل سلطانپوری، رشید نازکی، غلام احمد گاش، ناجی منور، محمد ایوب بیتاب غلام نبی ناظر، چمن لال چمن، محی الدین گوہر شفیع شوق،

---

[1] تحقیق و تنقید کے میدان میں منظم کام کی شروعات ہو چکی ہیں عبدالاحد آزاد کے بعد اس دور میں پروفیسر رحمان راہی جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب موتی لال ساقی، جناب حامدی کشمیری، جناب مشعل سلطانپوری، جناب امین کامل و دیگر صاحب نظر حضرات کی کاوشیں قابل توجہ ہیں۔

رفیق رازؔ، بشیر اختر، شمس الدین شمیمؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کے ساتھ کشمیری ادب کے نئے امکانات بجا طور وابستہ ہیں۔

نہ ہو نومید اے اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

اس طرح کشمیری غزل، نظم، افسانہ، ناول ایسے ودیگر صنفوں کی اگلی روایات کو توسیع دینے کے ساتھ ساتھ تخیل و تخلیق کی اتھا گہرائیوں اور اچھوتی بلندیوں تک رسائی حاصل کرنے کا تخلیقی سفر جاری ہے۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

''کشیر'' (کشمیر) کے وجود میں آنے کی اساطیری تاویل کے تعلق سے کاشُر (کشمیری باشندہ) اور ''کاشُر'' (کشمیری زبان) پر الگ سے بحث ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کشمیری زبان کو آج تک کبھی سرکاری یا درباری زبان کا درجہ حاصل نہیں رہا۔ تاریخی حادثات نے اسے ایسی پیچیدگیوں میں مبتلا کر دیا کہ جن سے مستقبل قریب میں چھٹکارا پانا ناممکن ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں یہاں عوامی حکومت قائم ہونے کے بعد یہ امید بندھی تھی کہ اب کے اس کا ستارہ مہ کامل بن جائے گا۔ لیکن آج تک سبھی حکمران مصلحتوں کے شکار رہے، اور کشمیری زبان کو وہ درجہ نہ دلا سکے جو اسے آئین ہند میں حاصل ہے۔ کشمیری زبان وادی کشمیر، بانہال، رام بن، ضلع ڈوڈہ، پونچھ اور راجوری کے دور افتادہ علاقوں میں مادری زبان کی حیثیت بولی جاتی ہے اور ریاست کی ساٹھ لاکھ آبادی میں سے تقریباً تیس سے چالیس لاکھ لوگ اسے بولتے ہیں۔ اس میں بھدرواہی، کشتواڑی اور سراجی بولیوں کے علاوہ علاقہ گریز کی مقامی بولی شنا بھی شامل کی جاسکتی ہے۔ ہماچل پردیش کے

کئی دیہات میں اب بھی کشمیری بولی جاتی ہے۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو کالج پر Elective Subject کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اور کشمیر یونیورسٹی میں بھی اس کیلئے ایک الگ شعبہ موجود ہے جہاں ہماری نوجوان نسل ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لیتی ہے۔ یہ سب کچھ تسلیم ،لیکن کشمیری زبان پڑھنے والے ہی کتنے ہیں؟ کتنے ادیب خرید کر کتاب پڑھنے کے عادی ہیں؟ کیا کسی کتاب کی اشاعت پانچسو سے زائد ہے؟ شیخ العالمؒ اور لل دید سے متعلق کتابوں کے بغیر کوئی کتاب دیمک کی عنایات سے بچ سکتی ہے۔؟ مختصر یہ کہ کشمیری زبان میں ابھی تک اساتذہ کی چند اسامیوں سے زائد روزگاری وسائل ناپید ہیں اور اس کے پڑھنے والے بہت ہی محدود ہیں۔نو دولتیے گھروں میں اردو، ہندی یا انگریزی بولتے ہیں کشمیری زبان کا موجودہ کشمیری رسم الخط جس کی بنیاد خط نستعلیق پر ہے، بھی ایک وسیع حلقے کو اس لئے منظور نہیں کیوں کہ اس میں اپنی مخصوص صوتیات کے پیش نظر چند ایک لازمی اعراب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ان کے نزدیک کشمیری زبان کا فروغ اُردو کے لئے مضرت رساں ہے۔اردو ڈوگرہ دور سے ریاست جموں وکشمیر کی دفتری اور سرکاری زبان ہے۔ کشمیری ، کشمیریوں کی مادری زبان ہے جس کا راستہ ملک کے سہ لسانی فارمولہ نے مسدود کر رکھا ہے۔اس فارمولہ کے تحت تین زبانوں میں تعلیم دی جاسکتی ہے، زبانیں ہیں ہندی، انگریزی اور مادری زبان۔ ریاست جموں وکشمیر ایک کثیر لسانی ریاست ہے جہاں کشمیری ،ڈوگری اور لداخی وبلتی کے علاوہ پنجابی ، پہاڑی گوجری اور ہندی زبانیں بھی ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔اسلئے نظر ٹکے تو کہاں اور قدم جمے تو کدھر؟ ایک اور مایوس کن پہلو یہ ہے کہ کشمیری زبان میں باقاعدہ کوئی ہفتہ وار یا روزنامہ نہیں۔اخبار ''گاش'' کے بعد کلچرل کانگریس کے

''پمپوش'' اور ''گلریز'' غلام نبی خیال کے ''وطن'' فیلڈ سروے کے ''چمن'' اور کشمیر کلچرل آرگنائیزیشن کے'' کاشر اخبار'' کا بے قاعدہ اجراء کوئی صحت مند روایت نہ بن سکے۔ '' کاشر ادب'' غلام رسول سنتوش اور امین کامل کے ''نیب'' کے سوائے کشمیر زبان رسالے کے ضمن میں یتیم ہی رہی۔ ہاں کلچرل اکادمی کا دو ماہی شیرازہ محدؤ د حد تک یہ خلاء پورا کر رہا ہے۔ کشمیری بولنے والوں کی وفاداریاں محدود خانوں میں بٹی ہوئی ہیں اور ہماری نظریں اپنی اصل کی بجائے کہیں اور لگی ہیں۔ کشمیری زبان کی ادبی اور ثقافتی تنظیمیں اس کے فروغ اور ارتقاء کے لئے سازگار ماحول پید کرسکتی ہیں، لیکن انہیں بھی ذاتی مفادات اور شخصی مصلحت پسندی نے عضو معطل بنا رکھا ہے۔ اللہ کرے کہ ہمیں اپنی شناخت کی واحد ضامن مادری زبان کی اہمیت بروقت محسوس ہو جائے کیوں کہ یہ نہیں تو ہم بھی نہیں۔ بقول اقبالؒ ؎

کشیر ی کہ بابند گی خو، گرفتہ — بتے می تراشد زِسنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندی — خودی ناشناسے زخود شرمسارے
نہ دردیدہٗ او فروغِ نگاہے — نہ درسینہ اودِلِ بے قرارے
ازاں مئے فشاں قطرہ ئ برکشیری — کہ خاکسترش آفریند شرارے

○

# لل دید اور اُس کا زمانہ

ادب وشاعری تاریخ سے زیادہ زندگی کے قریب ہے تاریخ واقعات و واردات، راجوں مہاراجوں کے عروج وزوال کی کھتونی ہونے کی بناء پر حیات بو قلموں کی یک رخی تصویر ہے اور شعر وادب ہمہ جہت زندگی کا آئینہ دار ہے، شاید اس لئے کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے یا ادب زندگی تنقید ہے۔ کیونکہ اجتماعی لاشعور کی جلوہ گری بلا واسطہ ادب وشعر میں ہوتی ہے، روحِ عصر کے بغیر تخلیقی کاوشیں ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے مترادف ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ شعر و ادب میں عمومی عصری حقیقتوں کا بالواسطہ اظہار ہو، کیونکہ ابلاغ کے ایسے برتاؤ سے تخلیقی قوتیں بھرپور انداز میں بروئے کار نہیں آسکتیں۔ اور اُن کے نتیجہ میں تخلیق ہونے والے ادب وشعر میں ہماری ابدی مسرتوں کا بہت کم ساماں ہوگا۔ اسے حُسنِ اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ زبانوں کی آبیاری عارفانہ کلام سے ہوتی آئی ہے۔ اور اس کی ابتداء شعر سے ہوئی نثر سے نہیں۔ تزکیۂ نفس کے جملہ مدراج طے کرنے اور ابدی مسرتوں سے رنجیدہ وپیچیدہ حیات انسانی کا دامن بھرنے کے سلسلہ میں تخلیق شعر کو اوّلیت حاصل ہے یہ راہیں کبھی بھی خطِ مستقیم پر نہیں چلی ہیں، اگر ایک داخلیت میں گم ہے تو دوسرا خارجیت کی گرفت سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔ اس بات کا بین ثبوت حضرت شیخ نور الدین نورانیؒ عرف نندہ ریشی اور لل دید کا دستیاب کلام ہے، جو جہاں موضوعیت کا ہم قدم ہے اور معروضیت کی پر اسرار دنیا بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہی معروضیت

لل دید کو ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ جسطرح قریب ترین وعصری مؤرخوں نے لل دید کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ اُسی طرح لل دید کے کلام میں تاریخی حوادث وواقعات کے اثر ونفوذ کو ڈھونڈنا بے معنی ہوگا۔ لل دید کا ذکر تو ضمناً آسکتا تھا۔ جونراج نے بانیٔ مسلمانی حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ یا اُن کے فرزند بلند اختر میر محمد ہمدانیؒ بھی کو قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے حالانکہ نئی تہذیب کے خدوخال کا تعین کرنے کے لئے اُنکا ذکر ناگزیر تھا۔ لل دید کے عصری واقعات جن میں ذولچو کا، سفاکانہ ورُود اور رینچن کا مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد سلطان صدرالدین کے نام سے کشمیر کی شاہی گدی پر براجمان ہونا، آفات سماوی، مسلسل قحطوں کے نتیجہ میں کشمیریوں کی عسرت زدہ زندگی بھی کا شامل ہے بالواسطہ اظہار اُنکے کلام میں موجود نہیں۔ لل دید نے چودھویں صدی عیسوی کے ربع اول میں آنکھ کھولی اور اس کے اختتام کے قریب قریب اپنے طبعی انجام کو پہنچی۔ چودھویں صدی بلاشبہ کشمیر کی تمدنی اور تہذیبی تاریخ میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ عہد آفرین صدی ہے جب جنت ارضی پر سید شرف الدین بُلبل، حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ اور اُن کے فرزندارجمند میر محمد ہمدانیؒ کی مجتہدانہ وعارفانہ کوششوں کی وساطت سے ضیاباریاں ہوتی ہیں۔ گوکہ لل دید کے زمانے سے متعلق ہمہ جہت شہادتوں کی نشاندہی کرنا اس مقالے کا موضوع ہے لیکن یہاں کی سیاسی زندگی کا سرسری جائزہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

۱۳۰۱ سے ۱۳۲۰ء تک کشمیر پر راجہ سہدیو حکومت کرتا تھا۔ یہ راجہ بڑا فراخدل تھا اُنکے عہد حکومت میں، اطراف واکناف سے لوگ واردِ کشمیر ہوئے جن کا یہاں سواگت کیا گیا۔ شاہ میر اپنے خاندان کے جملہ اقارب ساتھ لیکر آیا۔ اُس کی فوج میں بھرتی ہوا رفتہ رفتہ بادشاہ کا درباری اور مصاحب بن بیٹھا۔

سید شرف الدین بُلبل تین ہزار پیروؤں کی معیت میں ترکستان سے منگول چیرہ دستیوں کے نتیجہ میں قدم رنج ہوئے۔ شہزادہ رنچن تبت لداخ سے اپنی جان بچانے کے لئے آیا۔ راجہ سہدیو نے اُسے گگن گیر پرگنہ کا نیلاش گاؤں رہایش کے لئے جاگیر کے طور عطا فرمایا[1]۔

ذولچو کے حملہ کا ذکر پہلے ہی ہوچکا ہے۔ راجہ سہدیو رعایا کو کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ کر ذولچو کے بہیمانہ برتاؤ سے بچنے کے لئے کشتواڑ کی راہ لیتا ہے۔ ازاں بعد رنچن نے تین سال حکومت کی۔ شاہ میر نے ۱۳۳۹ء میں سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔ اس طرح شاہ میری خاندان کی بنیاد پڑی۔ اس نے تین سال حکومت کی۔

اُس کے بعد شاہ میر کا بیٹا جمشید ۴۴۔۱۳۴۲ء، علی شیر عرف علاؤ الدین ۵۵۔۱۳۴۴ء سلطان شہاب الدین ، ۷۳۔۱۳۵۵ء، سلطان قطب الدین ، ۷۹۔۱۳۷۳ء، اور بیٹا سلطان سکندر عرف (بت شکن) ۱۴۱۳۔۱۳۷۹ء یکے بعد دیگرے کشمیر پر حکومت کرتے رہے۔ یہی لل دید کے جنم، بچپن، شباب وشیب عرفان ذات اور آخری سفر کا زمانہ ہے لل دید کے کلام میں ظاہر ہے کہ ان واقعات کا بلا واسطہ ذکر بھی موجود نہیں۔ ہوتا بھی کیسے جب کہ وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر خود آگہی وخودنگری میں محو تھی، اُس نے اپنی خاندانی وخانہ گی زندگی کو بھی تج دیا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ شاہی درباروں کی سیاسی اُتھل پتھل سے متاثر ہوتی۔ دنیائے دوں کی ساری بوقلمونی اُسکے دروں بینی وباطن طلبی کے آگے ہیچ تھی۔

کشمیر کی وادی مینونظیر اگلے وقتوں سے عرفان وآگہی کا مسکن رہی ہے۔ بدھ مت ہو یا شیومت یہاں ہر مکتبہ فکر کو نئی جہتیں عطا ہوئیں، بدھ مت کشمیر سے چین وجاپان میں دور دور تک پھیلا، شیومت کو یہاں کے حقیقت پسند وصداقت

---

[1] راج ترنگنی۔ جونراج صفحہ ۶۲۔۶۳۔ ایس۔ کے۔ کول

طلب ذہن نے بے جا رسوم وقیود اور ذات پات سے آزاد کر دیا گو کہ ابھی تک ہمارا سماج اِن سے مکمل طور چھٹکارا پانے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ لل دید بنیادی طور شیو یوگنی تھیں۔ اس بات کا ثبوت اُس کے واکوں سے جا بجا ملتا ہے۔ دھارمک رسوم کی پابندی اور رسم پرست دکھاوے کی پوجا کرنے والے ہندؤں کی خبر وہ یوں لیتی ہے۔

لز کاسی شیتھ نواری
ترٖن زل کری آہار
یہ کمو وہ پدیش کوٗرے بٹا
أژیتین وٹس سُوتین دیُن آہار

ترجمہ: یہ (بھیڑ) تمہاری شرم وحیا کو بنائے اور تیری وجود کو سردی سے بچائے رکھے۔ یہ گھاس کھا کھا کر پانی پی پی کر زندہ ہے، اسلئے پنڈت تو کس کے کہے پر بے حس وحرکت بت کے آگے ایک جاندار کا چڑھاوا رکھے ہوئے ہے۔

دیہو وٹا، دِور وٹا پیٹھ بون چھے یکے واٹھ
پوٗزکس کرکھ ہوٗتہٕ بٹا کرمنس تہٕ پونس سنگاٹھ

ترجمہ: ''دیوتا کی مورتی کے پتھر اور مندر کے پتھر میں یکسانیت پائی جاتی ہے، نشیب وفراز کو وہ منسلک کئے ہوئے ہے۔ ارے او! مورکھ پنڈت تو کس کی پوجا کریگا، من اور پون کو ایک رشتہ میں باندھ، انہیں جدا نہ ہونے دے۔''

گٔش پوشن، تیل دِیپھ دل ناگٕوشے سِدھ باوٕ گوڈٕ کتھ لیس منہٕ ہیٔیے
شمبھو ہس سورِ نتی پنہٕ یڑھے سُے ڈٔلِی زے سہزا کرٕیے

ترجمہ: ''پوٗجا کیلئے دیپ، تل، جل یا کشائے گھاس کی ضرورت ہی کیا۔ وہ اُس کیلئے جو گرو کی بات پر جی جان سے چلے اور جو شمبھو کی یاد میں ہمہ تن محو

رہے۔ یہی وہ سچی ریاضت و عبادت ہے جس سے ابدی سکون حاصل ہوتا ہے۔"

مَن پُش تے پڑھ پُشانی — من ہے مالی شوق مالن پوُجا میں گلہائے عقیدت
باوِ کُسُم لاگ زبس پوُزے — اُسکے آگے لا کے رکھدے۔ چاند کے رس کی
شیشہِ رسہِ گوڈ زبس زلچہ دانی — گنگا سے پھر تازہ تازہ پانی لیکر اُسکو تو اشنان
ژھوپہ منتر شنکرِ سو اتمہِ وزے — کرالے۔ جپ لے منتر ہوگا آتم تیرا
یعنی شنکر۔ پائیگا تو اپنے من میں[1]

گگن ژِ ے بھوتل ژِ ے — ژِ ے دِن پون تہِ راتھ
ارگ ژندن پوش پونی ژِ ے — ژِ ے چھکھ سورے تہِ لاگ زِ کیاتھ

ترجمہ: "تو آسمان زمین میں سمایا ہوا ہے، تو ہی دن پون اور رات بھی ہے، تو ارگ (پوجا کے چاول) چندن، پھول اور جل ہے، تو ہی سب کچھ ہے حیران ہوں کہ کیا تیری نذر کروں، کونسا چڑھاوا پیش کروں۔

اسکے لئے ضروری ہے کہ اندروں کو پاک و صاف کیا جائے اور ہوا وہوس سے اپنے وجود کو دور رکھا جائے۔ جبھی تو ممکن ہے کہ گیان وعرفان ذات کے اعلیٰ مدارج طے ہو سکیں۔ لل دید نے خود بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مل ووند گولم جگر مورم
تیلی لل ناو درام
ییلی
ڈلی تر آوی منس تتی

[1] یہاں رسمی پرستش کے خلاف روحانیت کی برتری کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ چاند سے مراد وہ پراسرار چاند ہے جو کاسہ سُر میں ممکن ہے اور اُس کے رس سے وہ امرت مراد ہے جو عابد یا تلاش حقیقت مطلق میں مگن، انسان کے روحانی جسم میں داخل ہوتا ہے۔ اور جو اُسے اپنے وجود کا مالک ہونے کے قابل بنالیا ہے۔ منتر سے مطلب سکوت کا عمل ہے۔ جسمیں ریاضت گذار بغیر کسی آواز کے فقط سانس کے اُتار چڑھاؤ سے کام لیتا ہے۔ (لل دید۔ مرتبہ جیالال کول، نندلال طالب ص۔ ۱۱۱)

تانتر پوُجا کی گرفت لوگوں پر اتنی مضبوط ہو چلی تھی کہ دھیان گیان اور مذہب رسوم کے بے جان مجموعہ کے بغیر کچھ نہ سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ لکڑی کی گائے سے دودھ لینا روحانیت کی معراج سمجھی جاتی تھی۔ جادو ٹونے اور مذہب کے درمیان فرق ہی مٹ چکا تھا۔ لل دید سے یہ کیسے برداشت ہو سکتا تھا۔ وہ پکار اُٹھی ؎

زل تھمہٕ وُن ہتواہ ترناوُن ۔۔۔ وُڈ دوا گمن پیرو ژرِتھ
کاٹھہٕ دینہٕ دود شرماوُن ۔۔۔ انتہٕ سکوُل کپٹہٕ ژرِتھ

روک لینا آئے گر جوئے رواں ۔۔۔ یا بجھانی آئے نارِ شعلہ زن
چلنا آئے گر تجھے بالائے چرخ ۔۔۔ او لینا گائے سے لکڑی کی دودھ
شعبدہ بازی فقط ہے یہ تمام[1]

صحرائے عشق و جنوں میں کئی مقام ایسے آتے ہیں، جہاں عام روش سے ہٹ کر من کی دنیا آباد کرنا پڑتی ہے۔ لل دید کے حساس، حقیقت مطلق کے متلاشی دل پر مرشد کی بات کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ خدانگری و خداطلبی میں اُسے اپنے ہوش و حواس گُم ہونے دکھائی دئے اور وہ برہنہ گی کی پروا کئے بغیر گھومنے پھرنے لگی ؎

گورن وُن نم کُنے وژن ۔۔۔ نبر دُ پنم اندرا ژُن
سُے مے للہِ گوو اکھ تہٕ وژُن ۔۔۔ توے ہیوتُم ننگے نژن

ظاہر ہے کہ لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئی ہونگی کہ لل دید ایسی ہے۔ ویسی ہے، جتنے منہ اُتنی باتیں۔ یہ سلسلہ نہ پہلے ختم ہوا ہے اور نہ اب ہوگا۔ ختم ہونے کو ہے لل کہتی ہیں کہ وہ لوگ مجھے بُرا بھلا کہیں یا بدنام کریں، جس کے من میں جو آئے

---

1. لل دید۔ ترتیب۔ جیالال کول پروفیسر نند لال طالب۔ کلچرل اکیڈیمی ایڈیشن ۔۲

کہدے۔ اگر وہ سچے دل سے میری پرستش بھی کریں، پھر بھی مجھ پر ان باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔ ایسا کرنے سے کوئی کیا پائیگا۔

گال گنڈی نم بول پڈی نم ڈیڈ نم لیس یہ روژے

سہز کُسمو پوز کری نم یہ امہِ لأنی تہٕ کس کیا موژے

لل دید کو یہ معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے سیمابی وجود بخشا ہے کہ وہ کہیں ٹک نہ سکے۔ اسلئے جاہل لوگوں کے اوچھے جملے بیکار ثابت ہونگے۔ مقدس دیوانگی رہروانِ جادۂ عشق کیلئے مشعل راہ ہی نہیں بلکہ زینتِ حیات ہے یہ بھید جاننے کا ظرف پست فطرت لوگوں میں کہاں، لل کا مشاہدہ تھا کہ مورکھ کو نصیحت کرنا گویا بال چھیدنے دامن میں پربت اُٹھانے، سمندر اور کرنے کے مترادف ہے، اُسے نصیحت کرنے سے تضیع اوقات کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

مۆڈس پرٕنُن چھٕے موے وال ژیڈُن

مۆڈس پرٕنُن چھُٕے مُرِ دیُن کوہ

مۆڈس پرٕنُن چھٕے سمدر پۆرُن

مۆڈس پرٕنان راوی دوہہ

ایک اور واک میں لل دید کہتی ہیں کہ مورکھ کو سمجھانا گویا گدھے کو گُڑ کھلانا ہے اور ریگ زار میں بیج بونا ہے۔

مۆڈس گیاٗنچ کتھ نوٗنی زے کھرس گور دنہٕ راوی دوہہ

سیکہِ شاٹھس پھل نوٗوی زے کوٗم یا جن راٗوی تیل

انسان نے جب تہذیب کی دہلیز پر قدم رکھا تو زندگی کو حسین تر بنانے کے لئے اس نے اپنے لئے مدنی زندگی کے قواعد بھی وضع کئے اور تزکیہ نفس کے ایسے اصول وضوابط بھی بنائے جنکی بُنیاد خارجی اور داخلی تجربات پر تھی متوازن

اِنسانی سماج کیلئے اعتدال پسند انفرادی طرز حیات کو ضروری گردانا گیا۔ اجتماعی سطح پر چونکہ ان اصولوں پر عمل کرنا ممکن نہیں اس لئے خود آگہی و خودنگری کیلئے شرط اولین یہی ٹھہری کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی نفسیاتی خواہشات کو قابو میں رکھے جبھی تو ممکن ہے کہ جملہ جسمانی و روحانی قوتیں مرتکز ہوں۔ ہندوستان ہو یا ایران وتوران ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں ان ابدی قدروں کی کارفرمائی رہی ہے۔ کشمیر شومت، انسانی رواداری، اخوت ومحبت، اور ذات پات مخالف و دیگر ابدی قدروں کی آبیاری کرنے میں پیش پیش رہا۔ یہاں کی تہذیب میں قدیم ہندومت، بدھ مت، ترکا شاستر، تانتر شاستر اور شومت کے عناصر ترکیبی اشاعت اسلام کے بعد بھی بہر نوع شامل رہے، یہی وجہ ہے کہ آج ہم اسے امتزاجی یا مشترکہ تہذیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

شہوت، غصہ اور حرص یہ تینوں قاتل ہیں، انہیں مار ڈال۔

مارُکھ، مارِ بُوتھ کام، کرُوٗد، لوٗب !

لل دید اعتدال پسندی کی تعلیم یوں دیتی ہے کہ ایسے کپڑے پہنو کہ سردی محسوس نہ ہو۔ اور وہ غذا یا خوراک لے جس سے بھوک مٹ جائے۔

یوٗ ترٗ ژلی تم امبر ہیٚیا کھوٚدیوٚ گلی تم آہاراَن

یا یہ کہ مسلسل کھانے پینے سے من کو شانتی نہیں ملتی، عیش وعشرت کی فراہمی بھی یہاں بیکار رہے۔

سوٚمےٚ آہار سبتھا زوٗنم لوٗبَن بوٚگن بُرم نہٕ پڑے

میں نے اعتدال سے کھانا پینا سمجھا اور خواہشاتِ نفسانی کی طرف مائل نہ ہوئی۔ کیونکہ جب خواہش زمانے کے تغیر سے آزاد ہوں تو پھر انسان گھر میں رہے یا بن باس لے ایک ہی بات ہے، خداوندلم یزل کو حاضر وناظر جان کر

جیسے بھی اُسے جاننے یا پانے کی کوشش کی جائے ویسے ہی روپ میں اُس کی جلوہ گری ہوگی ۔

کلن کالہِ زاٗلی یوٚ دوے ژےٚ گوٚل
ویٚند وِ گہہ واویٚند وِ ونواس
زاٗنتھ ستر ڈ گتھ پڑ بھو اموٚل
یتھے زانکھ تیتھے آس ہے

کوئی شاعر کتنا ہی داخلیت پسند کیوں نہ ہو جیسا کہ ہر بڑا شاعر ہوا کرتا ہے ۔ روح عصر اُس کے لاشعور کے جھروکے سے اُسکی شاعری میں در آتا ہے ، یہ فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ ناداں اعلیٰ منصب کا مالک ہو اور عقلمند در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرے بقول حافظ ۔

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان
طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم

لل دید نے بھی ایسی حالت کا مشاہدہ کیا ہے کہ میں نے ایک دانا و زیرک کو بھوکوں مرتے دیکھا جیسے پت جھڑ میں درختوں سے گرتے ہوئے پتے ۔ ایک نادان اور مورکھ کو اپنے باورچی پیٹتے دیکھا کہ تو نے لذیز کھانے کیوں نہیں بنائے ۔ تب سے میں دنیا کے بندھنوں سے چھٹکارا پانے کی منتظر ہوں ۔

گاٹلاہ اکھ وچھم بوچھہ ستی مران
پن زن ہران پہنہِ واولہ
نیٚش بوٚد اکھ وچھم وازس ماران .
تنہٕ لل بہٕ پژاران ژھیٚنیم ناپژاہ

جہاں حُسن فطرت کی فراوانی سے ارضِ کشمیر کا دامن بھرا پڑا ہے ، وہاں

آفاتِ سماوی، سیلاب اور قحط بھی یہاں کی آبادی کو دبوچ لیتے ہیں، یہ مصائب سیاسی کساد بازاری وسفاکی کے مستزادہیں، جو لل دید کے زمانے میں کشمیر کو دیکھنا پڑی۔ لل دید نے اس بات کا اظہار لاشعوری طور یوں کیا ہے کہ دنیا کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی، ابھی آتش داں شعلہ زن ہے اور ابھی نہ دھواں ہے کہیں نہ آگ، پانڈوؤں کی ماں چشم زدن میں خالہ کُمہارن یعنی مفلس وخاک نشیں ہو جاتی ہے۔

ڈمی ڈٲٹھم گج دزٕ وِنی
ڈمی ڈیوٗٹھُم دِہ نتہٕ نار
ڈمی ڈٲٹھم پانڈون ہنزٕ مأجی
ڈمی ڈٲٹھم کرٕٲجی ماس

سر رچرڈ ٹمپل اپنی کتاب "لل واکھ" میں لکھتے ہیں "اگرچہ لل ہندو تھی اور شیومت کی مقلد اور اُسکا رجحان اور خیالات صاف طور پر اس کے اپنے ہی تصورات کے آئینہ دار تھے، پھر بھی اس میں صوفیوں کی تعلیم کو بہت دخل رہا ہے، جو قریب قریب ہندوؤں کے اُپنشدوں کا نظریہ ہے"۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لل دید کا کلام شیومت اور اسلامی تصوف وتمدن کا امتزاج ہے۔ لل دید اور شیخ نورالدین ولیؒ کے کلام کا لسانی تجزیہ کرنے سے لسانی بعد کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کئی واک ایسے ہیں جو دونوں قدآور شاعرانہ و عارفانہ شخصیتوں کے مجموعہ ہائے کلام میں پائے جاتے ہیں اسکی سب سے بڑی وجہ وہ والہانہ عقیدت ہے جو اُن سے بلا لحاظ مذہب وملت یہاں کے لوگ رکھتے آئے ہیں اور جس کی وجہ سے تخلیقی وغیر تخلیقی تقلید وعقیدت کے پردے میں اُن کے کلام میں اضافے ہوتے رہے جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے،

کہ عرفان ذاتِ کا جذبہ ابتدائے آفرینش سے انسان کے دل ودماغ کو کریدتا آیا ہے اور اس کے اصول اتنی مماثلث رکھتے ہیں کہ اُن تاخیر وتقدیم کی نشاندہی کرنا، ناممکن سا بن جاتا ہے اشاعتِ اسلام سے پہلے بھی یہاں مفکرین کا سلسلہ چلتا رہا اور مختلف مکاتب خیال پروان چڑھتے رہے، جن کے اثرات یہاں کے اجتماعی ذہن پر اس قدر مرتسم تھے کہ اُن سے صدیاں گزرنے کے بعد بھی چھٹکارا ممکن نہیں۔ اسلام میں طریق رشیہ کے ترک لذات کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ اجتہادوانفعال کو آپس میں کیسے تحلیل کیا جائے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اسلامی توحید، خدا کے وجود سے متعلق بودھ خامشی؛ اور الوہیت کے متعلق ہندومت کی پیکر پرستی کے درمیان آسمان وزمین کا فرق ہے۔ ہاں تو داخلی شہادت کے بغیر خوش اعتقادی کی بنا پر اگر "لل دید" کو مسلمان قرار دے دیا جائے تو کیا کیجئے اور اگر کوئی یہ فرمائے کہ حضرت شیخ العالم نعوذ باللہ مسلمان نہیں ہندو تھے تو اُسے کیا کہیئے۔ ان حضرات کو کون سمجھائے کہ حضرت نند ریشیؒ کی ذات بابرکات جتنی زیادہ تاریخی، اہم اور حقیقی ہے اتنی ہی زیادہ لل دید کی مجذوبانہ عارفانہ اور بلند قامت شعری شخصیت پُر اسرار حد تک افسانوی ہے یہ ٹھیک ہے کہ لل دید اپنے زمانے کے عہد ساز معاصرہ تہذیبی وثقافتی تغیر سے ضرور اثر انداز ہوئی ہوگی لیکن اُس کی بنیادی تخیلی اور فکری سطح غیر متزلزل رہی، کیونکہ روحانیت خود فراموشی کے عالم میں مذہب وملت کی تفریق مٹ جاتی ہے اس امتزاجی تصوف کے مفروضے کو ثابت کرنے کے لئے جن واکوں کا سہارا لیا جاتا ہے وہ ہمیں لسانی مزاج کے پیش نظر اپنے عہد کے قریب ترین دل کی دھڑکن معلوم ہوتے ہیں کیونکہ چشم زدن میں کسی فنکار کے یہاں لسانی بُعد کا اتنا وسیع ہونا ہے۔ تغیر کے غیر مرئی فطری قوانین تسلیم کرتے ہوئے بھی بے محل سا دکھائی

دیتا ہے۔ شتی کنٹھ کی "مہانے" پرکاش بھٹ اوتار کی "بانا سُر کتھا" اور لل دید کا بہت سا کلام ہمارے لئے معمہ نہیں ہوتا اگر اُنکے کلام کو اسلامی تصوف کی ترسیل و تبلیغ کا شرف حاصل ہوتا۔

لل دید کا کلام اس بات کا بین ثبوت ہے کہ معاصر رجحانات دو ہم عصر شعراء پر ایک جیسا اثر نہیں چھوڑتے۔ اُس کے بیشتر واکوں سے داخلیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اُس نے زمانے کے انقلابات و اتفاقات کے درمیان سانس تو لیا لیکن اُسکی فکری سطح پر کوئی ارتعاش نمودار نہیں ہوا وہ سچ مچ ہمارے صدیوں پرانے لاشعور کی بلند پایہ غماز ہے اور اُسے اپنے زمانے سے بس اسی حد تک نسبت ہے کہ وہ چودھویں صدی سے تعلق رکھتی ہے لیکن شعری تجربات میں مضمر ژرف نگاہی اُسے ایک ہی جست میں وہاں پہنچا دیتی ہے جہاں وہ اب بھی تنہا ہے اور کچے دھاگے سے وجدان کے سمندر میں ناؤ کھیتی جا رہی ہے تا کہ وہ اُس پار اپنے حقیقی مسکن پہ جا اُترے۔

آمہِ پنہٕ سٕدرس ناوِ چھس لمان
کتہِ بوزِ دے میون مێتہِ دیہِ تار
آمین ٹاکین پوٚنۍ زن شمان
زُوچھم بڑمان گرِ گژھہٕ ہا

☆☆☆

# لل دید.....فلسفۂ حیات

اب کے یہ رسم چلی ہے کہ ہر بڑے تخلیقی شاعر، ادیب اور فنکار کے ساتھ ایک فلسفہ بھی جوڑ دیا جائے تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ اُس کی عظمت کس فلسفہ یا نظریۂ حیات کی مرہونِ منت ہے۔ نظریہ منفی ہو یا مثبت عصری عوامل سے کلی طور منہ نہیں موڑا جاسکتا۔ کوئی نظریہ یا فلسفہ حیات کسی تخلیق کار کے سر پر عظمت کا تاج نہیں رکھ سکتا ہے۔ البتہ جیسا کہ اکثر صورتوں میں دیکھا گیا ہے کہ کئی عالمی شہرت رکھنے والے قلم کاروں کی تخلیقی کاوشیں مختلف سماجی اور سیاسی عصری نظریات کی تبلیغ واشاعت میں بالواسطہ مؤثر ذریعہ ثابت ہوئیں۔ یہاں بھی عظیم فنکار شاعر اور ادیب بننے میں اُن کے تخلیقی جواہر ہی کام آئے نہیں تو اُن کی تخلیقات کی وقعت وقتی تحریرات سے زیادہ نہیں ہوتی۔ لیوٹالسٹائی، میکسم گورکی، شیکسپیر، یا پریم چند اور رابندر ناتھ ٹیگور کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ دور کیوں جایئے کلہن کی فطری خلاقیت تاریخ کشمیر کو شاعری کا سدا بہار گلدستہ بنانے میں کامیاب ہوئی۔ یہی بات لل دید اور شمس العارفین شیخ نورالدین ولیؒ پر صادق آتی ہے کہ اُن کی شخصیات ہماری مشترکہ اور امتزاجی تہذیبی قدروں کی مظہر بھی ہیں اور محافظ بھی۔ کیونکہ کٹر برہمنیت اور مُلائیت کے برعکس اُن کے تخلیقی سرچشمے مختلف تہذیبی دھاراؤں کو عوام تک پہنچانے میں شکوہِ سلطنت اور

شیرازہ۔ جلد ۱۹: اکتوبر ۱۹۸۰ء شمارہ ۱۲-۱۰ ایڈیٹر محمد احمد اندرابی۔ مطبوعہ: کلچرل اکیڈیمی سرینگر

زورِ بازو سے مؤثر ثابت ہوئے۔ عصری تخلیقی عوامل میں لوک روایات کے علاوہ ملک کے تاریخی، سماجی، مذہبی، لسانی، سیاسی اور معاشی حالات شامل ہیں جو بلاشبہ دوہم عصر تخلیق کاروں پر ایک جیسے اثرات نہیں چھوڑ سکتے اور جن کا بین ثبوت کو للّ دید اور نندہ ریشیؒ کی حیات اور ان کا کلام ہے جو بادی النظر میں روحِ عصر کی ایک ملتی جلتی تصویر پیش کرتے ہیں لیکن گہرے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اول الذّکر کا بیشتر کلام معروضی ہے اور مؤخر الذّکر کا موضوعی۔ لیکن دونوں اپنے اپنے رنگ میں عصری تفکر کے خلاف احتجاج کی کبھی دھیمی اور کبھی زاور دار آواز بلند کرتے ہیں۔ للّ دید نے دنیوی زندگی تیاگ کر کے شو شکتی کے تخلیقی تصور میں پناہ لی اور حضرت شیخ نور الدین ولیؒ نے بھی ترک لذات کر کے راہِ عرفان اختیار کی تاکہ ذاتِ کُل کے عرفان سے پہلے سے پہلے نفس امارہ کو زیر کر کے عرفانِ ذات کا صبر آزما مرحلہ طے کیا جا سکے۔

یہ درست ہے کہ بڑے شاعر کا عصری عوامل کے ساتھ ایک منفرد رویہ ہوتا ہے وہ اپنی مخصوص عقابی نظر سے اپنی نئی تخلیقی کائنات دریافت کرتا ہے اسی منفرد اندازِ نظر اور نگاہ تخلیق کو اگر فلسفہ حیات کا نام دیا جائے تو للّ دید کا بھی کوئی فلسفہ حیات نہیں تھا جس کی اس نے تبلیغ کی ہو کیونکہ ویشنومت، بودھ مت، شیومت اور ویدانت کے اثرات یہاں کے شعور میں صدیوں سے سرایت کر چکے تھے جن کے مجموعی اور اجتماعی اثرات کو اُس کے اجتماعی لاشعور سے محو کرنا ممکن نہیں تھا۔ ادب و شعر کو نہ صرف زندگی کا آئینہ دار قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ نقدِ حیات بھی: جس کی وجہ سے للہَ واکھوں کو کشمیر شیوازم کا آئینہ کہا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام میں ویشنومت، بودھ مت اور دیدانت کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ شاید یہ کہنا بھی بیجا نہیں ہوگا کہ کوئی بھی فنکار جب ہی کوئی خاص

نظریہ اختیار کرتا ہے جب وہ اُس کے تہ در تہ اندرون کے ساتھ بھی مطابقت رکھتا ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ للِ دید نے صنف نازک کے ناتے شیو شکتی کا تخلیقی پیکر چُن لیا۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ للِ دید کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہیں تھی۔ اُس کا یہ قول کہ ''بھیڑ مارا جائے یا مینڈھا ذبح ہو لل کا مقدر بٹا ہی ہوگا'' ساس کی بہو کے تئیں روا رکھی زیادتیوں کے ضمن میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے لل کی ساس کھانا پروستے وقت اُسکے کھانے کے برتن میں بھات کے نیچے پاؤ بھر گول پتھر اس لئے رکھا کرتی تھی تا کہ اُسکے برتن میں کم پروسے چاول زیادہ دکھائی دیں۔ للِ دید بڑے صبر و تحمل سے یہ ظلم و ستم ہستی رہی لیکن آخر کار وہ گھڑی آن پہنچی کہ اُس کا زن و شو کا یہ روایتی رشتہ بکھر گیا۔ للِ دید ازدواجی اور گھرے دنیوی بندھنوں سے بھی آزاد ہوئی۔ قدرت نے آشفتہ سری اور عشق کی رہ نوردی اُس کے مقدر میں لکھی تھی۔ صنف نازک ہونے کی بناء پر للِ دید کو اپنے فطری ذوق جمال اور جذبہ تخلیق کی تشفی کا سامان کرنا لازم تھا۔ اُسکی اُفتادِ طبع کے پیش نظر یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ پھر ایکبار رشتہ ازدواج میں جڑ جاتی۔ اس نے اپنے دیو پیکر مخفی تخلیق قوتوں کو شعری جامہ پہنایا کیونکہ یہی وہ مؤثر ترین ذریعہ تھا، جس کے وسیلہ سے وہ جملہ دیومالا کی اور روایتی اظہارات کو کام میں لاسکتی تھی تا کہ وہ ماؤف و مجروح لاشعور کو اعلیٰ و ارفع حقیقت کے تصور میں ڈھال سکے۔

خوش قسمتی سے للِ دید کو سدھ سری کنٹھ جیسا کامل آستاد بھی نصیب ہوا جس نے اُسکو شیوازم کی مبادیات سے واقفیت بہم پہنچائی اور اُس کے متلاشی باطن کو صحیح راہ دکھائی للِ دید کے شوہر، اُس کے گرو سدھ شری کنٹھ اور خود اُسکے درمیان منظوم مکالمہ اس کے تلاش حق کا غماز ہے اور تجربات کی مختلف اساس کا عکاس بھی۔ مکالمہ کے لسانی قرب و بعد سے قطع نظر اس کا مطالعہ دلچسپی سے

خالی نہیں ہوگا ۔لل دید کا شوہر:۔

سری ٔیس ہیؤ نہ پرکاش ٔگنے
گنگہ ہیؤ نہ تیرتھ کاٗنہہ
بأیس ہیؤ نہٕ باندو ٔگنے
زَنہِ ہیؤ نہٕ سوکھ کاٗنہہ

''سورج جیسی روشنی یا سورج جیسا نور کسی شے میں نہیں، گنگا جیسا تیرتھ کہیں نہیں۔ بھائی جیسا کوئی رفیق نہیں اور بیوی جیسی سکھ دا ایک اور کوئی شے نہیں''

سدھ مول:

أچھن ہیؤ نہٕ پرکاش ٔگنے
کوٹھین ہیؤ نہٕ تیرتھ کاٗنہہ
چندس ہیؤ نہٕ باڈو ٔگنے
کھنہٕ ہیؤ نہٕ سوکھ کاٗنہہ

آنکھوں کی روشنی جیسی کوئی روشنی نہیں، ٹانگوں کے برابر کوئی تیرتھ نہیں، کیسہ سے بڑھکر کوئی ساتھی نہیں اور جو سکھ چادر سے ملتا ہے وہ کسی اور شے سے ملنے والا نہیں''۔ لل دید:

مایہِ ہیؤ نہ پرکاش ٔگنے
لیہ ہیؤ نہ تیرتھ کاٗنہہ
دَیس ہیؤ نہ باندو ٔگنے
بیس ہیؤ نہ سوکھ کانہہ

''خدا سے لو لگانے میں جو نور حاصل ہوتا ہے وہ سب سے بڑھکر ہے، یہی وہ جذبۂ عشق حقیقی ہے جو سب سے بڑا تیرتھ ہے، خدا سے بڑھکر کوئی رفیق

نہیں اور اسی کا خوف راحت قلب وجگر کا باعث ہے"۔

مناظرہ کا پہلا جُز (واکھ) ایک روزمرہ اور عام تجربہ ہے جو سورج اور گنگا کی سماج میں پوترتا اور تقدیس کا حامل ہے۔ یہ بھائی اور بیوی کے دنیوی رشتہ کو بھی اُجاگر کرتا ہے جو بہر نوع اضافی ہے۔ پرکاش اور تیرتھ برتاؤ یہاں پر سماجی روایت کی روشنی میں فطری اور قرین قیاس ہے۔

دوسرے جُز میں آنکھوں کی بینائی کو اعلیٰ دارفع نور سے، چلنے پھرنے کی طاقت اور صحت وتندرستی کو تیرتھ، جیب یا زادِ راہ کو بڑے سے بڑے رفیق اور خوف خدا کو سب سے بڑے سکھ سے تشبیہ دی گئی ہے، آنکھوں کی بینائی کو اس لئے سب سے بڑی روشنی مانا گیا ہے کہ اس کے بغیر فطرت کی نیرنگیوں اور خدا کی برکتوں سے فیض یاب نہیں ہوا جا سکتا۔ ٹانگوں کو اس لئے سب سے بڑا تیرتھ مانا گیا ہے کیونکہ یہی شریر کی صحت کی علامت کے طور، روحانی زندگی کی بھی شرط اولین ہے۔ اور چادر بالخصوص سفر میں پناگاہ بھی ہے قرارگاہ وخواب گاہ بھی۔ بہ نظر غائیر دیکھا جائے تو یہ واکھ بھی عارفانہ سفر کا راہ نما ہے جس میں لوازمات سفرعرفان کی طرف بلیغ اشارہ کیا گیا ہے۔

تیسرا جُز (واکھ) تلاش حق اور جذبہ محبت وعشق کا ترجمان ہے جو سفر عرفان کی تیسری اور آخری منزل ہے جبکہ پہلے دو جز بنیادی زینوں کی حیثیت رکھتے ہیں[1] جو ہمارے

---

[1] روایت ہے کہ یہ مناظرہ لل دید اور اسکے گرو سدھ (سدھ شری کنٹھ) کے درمیان ہوا تھا۔ جس میں پہلا واکھ لل دید نے کہا اور دوسرا سدھ مول نے اس پر لل دید نے۔ تیسرا داکھ کہہ کر سدھ مول کو لاجواب کر دیا۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ پہلا واکھ بابا نصرالدین نے کہا کہ جو شیخ نورالدین کے خاص مرید تھے۔ دوسرا شیخ نورالدینؒ نے فرمایا اور تیسرا واکھ لل دید نے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہلا واکھ لل دید کے شوہر نے، دوسرا سدھ مول نے تیسرا لل دید نے کہا۔ کہتے ہیں کہ لل دہ ید کا شوہر سدِھ مول کے پاس اس غرض کے لئے گیا کہ وہ اس کے ساتھ جا کر لل دہ ید کو سمجھائے کہ وہ گھر واپس چلی آئے یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ لل دید، مرتبہ۔ پروفیسر کول وطالب۔ مطبوعہ کلچرل اکامی۔ صفحہ ۱۸۰۔۱۸۳)۔ توجیہات کچھ بھی ہوں۔ محولہ واکوں کی زبان آج کی کشمیری زبان کے بالکل قریب ہے اور لل دید کے منفرد اندازِ بیان سے دور بھی۔ چونکہ لل دید اور حضرت شیخ العالمؒ کا کلام لوک مزاج میں اتنا رچ بس گیا ہے کہ نگاہ محقق ان سے لسانی طور متفق نہ ہوئے بھی کُفر کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

لئے دستیاب داخلی شہادتوں کی حیثیت رکھتے ہیں تا کہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ لل دید کی نجی اور فنی زندگی کن مراحل سے گزری کیونکہ ان کا آپسمیں چولی دامن ساتھ ہے لل دید کی نا آسودہ نجی زندگی بول اُٹھتی ہے جب وہ کہتی ہے کہ مرا وجود تیرتھ (زیارت) سے محروم سرِ بازار بے قفل دکان کی مانند ہوا اور میری لکڑی کی کمان کو بے کار تیر (تکا) نصیب ہوا۔ میری حالت ایسی ہوئی جیسے میرے وجود کی راجدھانی کی تعمیر کسی ناہنجار بڑھئی نے کی ہو۔ یہ واکھ آپ اپنے زمانہ کا شہر آشوب بھی ہے اور خود لل دید کی انفرادی زندگی کا المیہ اظہار بھی۔ اپنے وجود کی راجدھانی، بے قفل دوکان، بنا تیرتھ کے شریر۔ یہ سبھی علامتی پیکر لل دید کے داخلی کرب کے مظہر ہیں جو اتنے جاندار اور سدا بہار ہیں کہ لل دید کے ذوقِ جمال اور احساس کرب کے فنکارانہ نسوانی ابلاغ کی داد دینا پڑتی ہے۔ ایسے ہمہ جہت اور ہمہ گیر اظہار پر قدرت ہر کس و ناکس کے نصیب میں نہیں ہوتی

ہچِو ہٲر نجہ۔ پیٚڑِو کان گوم
اَکھ چھان پیوم یتھ راز دانے
منز بازرس قلفہ رۄس وان گوم
تیر تھ رۄس پان گوم کُس مالہِ زانے

لل دید کی نہایت ہی حساس اور کرب آگاہ طبعیت عطا ہوئی تھی جو پہلے ہی گرہستی تجربے میں شیس محل کی طرح چکنا چور ہوئی۔ کوئی اب شیشۂ دل کے ٹکڑوں کو جوڑے تو کیسے؟ شیشوں کا مسیحا کوئی تو ہو؟ بقول غالب

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھانے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

لل دید ایسا ہی تجربہ اپنی تخلیقی ہمہ گیریت اور آفاقیت کے ساتھ

باندھتے ہوئے کہتی ہے۔ کہ بارِ نبات کو اچھی طرح نہ باندھ پائی جس کی وجہ سے میرا سرو قد خمیدہ ہو گیا۔ مرشد کا قول میرے لئے احساسِ گمشدگی کی کسک سا ثابت ہوا کہ میرا ریوڑ بغیر نگہبان کے ہے۔ مجھ سے سب کچھ کیسے سہا جا سکے۔

نابدی بارس اَٹہٕ گنڈ ڈیۆل گوم
دیہہ کاڈ ہۆل گوم ہبکہ کہیو
گور سُنْد وَنُن راون تیۆل پیوم
پہلہ ِ رۆس کھیۆل گوہبکہٕ کہیو

اس آشوب آگہی میں اُسے اپنا وجود تنہا دکھائی دیتا ہے اگر کچھ کھو چکا ہے تو اُسی کا۔ بساط ذات اگر اُلٹ چکی ہے تو اُسی کی۔ خودنگری دوروں بینی میں اس کا رفیق ہو تو کون؟ تقریباً چھ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس واک کی تازہ کار پیکر تراشی آج بھی ہمیں وجدانی انبساط و شادمانی سے ہمکنار کرتی ہے۔ اس قبیل کے واکوں میں لل دید اپنے باطن میں غوطہ زن ہو کر تجربات کے وہ انمول موتی ہمارے دامن میں بھر دیتی ہے کہ ایسے لذتِ ہجر کے قدموں میں ساری کائنات بچھانے کو جی چاہتا ہے۔ لل دید عشق کے اسی پیہم سوزِ درونِ کائنات سے واقف تھی۔ وہ بقول اقبال جانتی تھی۔

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام سوختنِ ناتمام
عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذت طلب

ایک اور واک میں لل دید کہتی ہے کہ اُسے یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں سے اس دُنیا میں آئی اور یہاں سے جانے کا راستہ کون سا ہے؟ وہ کون سی دِشائیں ہیں۔

جن کی مجھے ٹوہ لگانا ہے، کتنی خوش بختی ہوگی اگر مجھے اس بات کا عرفان حاصل ہوگا ورنہ یہ سانس تو آنی جانی ہے اسکا کیا بھروسہ۔ یہ استعجاب وتحیر انسان کا مقدر رہے، زندگی آج بھی ہمارے لئے ایک سوالیہ نشان ہے۔ لل دید ایک دوراہے پر کھڑی تھی، اس نے ایک زنجیر اتار پھینکی تھی: ایک بت توڑا تھا اور نئی بت گری وتخلیق کاری کی تلاش میں سیماب پا تھی اُسکی اندرونی کیفیت بقول غالب یہ تھی ۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

آیس کمہِ دشہِ تہٕ کمہِ وتے — گژھ کمہِ دشہ کوزانہ وتھ
اَنتہٕ داے لگیم یئے — چھئینس یِتھ کِس کانٛہہ نوسیتھ

ذرا غور کیجیے کہ تنہا اجنبی ایک بے نام صحرا میں بے نام راہوں کا پتہ کس سے پوچھے؟ کس ایک راہ کا ہولے؟ بیتابی واضطراب کی کیفیت بیان سے باہر ہے جبکہ اس بات کا کھٹکا لگا رہے کہ یہ زندگی آنی جانی ہے، پل بھر کا بھروسہ نہیں۔ لذتِ ہجر اور شوقِ وصال نصیب ہو تو ایسا ہی ۔

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

بالآخر وہ گھڑی آن پہنچی جب اُسے گورو کے وہ شبد نصیب ہوئے جن کی اثر پزیری داعجاز سے وہ برہنہ تن گھومنے پھرنے لگی یعنی اُس کے سبھی دنیوی بندھن ٹوٹے وہ واصل ذاتِ کل ہوئی۔ اُسے وہ کچھ ملا جسکی اُسے تلاش تھی یعنی شیو شکتی کا وہ حیات آفرین شخصی تخلیقی تصور جسے اُسکا فلسفہ حیات کہا جا سکتا ہے۔

گورن دۄپنم کنُے وژُن — نبر دۄپنم اندر اژُن
سُے مے للہِ گوٚو واکھ تہٕ وژُن — توے ہیوٚتم ننگے نژُن

اس طرح لل دید کی خودنگری ، دروں بینی ، سرمستی وسرشاری کی شروعات ہوتی ہیں جب اُسے اپنے عصری گورو، سدھ شیر کنٹھ کی عارفانہ اور عالمانہ صحبت میں شیوشاستروں سے واقفیت بہم پہنچی۔

ہندو دیو مالا میں برہما اور وشنو بھی ترموتی کا ایک دیوتا ہے مگر کشمیر شیومت میں شیو کا سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام ہے اور وہی سب سے عظیم حقیقت ۔لل دید اس عقیدے میں نئ جہتوں کا اضافہ کرتی ہے جب وہ کہتی ہے کہ ہمیں تھے اور ہم ہی ہونگے ، ہم ہی اگلے وقتوں سے معرکے سر کرتے آئے ہیں ،شو ( حقیقت کل ) کے حیات وممات کا سلسلہ تا ابد جاری رہے گا۔سورج بھی محوِ سفر ہی رہیگا۔ ع

بقا ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اَسی دور گرِی پتہٕ وتھ   اُسی اُسی تہٕ اُسی آسو

رُوس سورِنہٕ لتہٕ گتھ   شِوس سورنہٕ زیوٗن مرُن

اس واکیہ کے پس منظر میں آواگون کا قدیم نظریہ کارفرما ہے مگر ساتھ ہی اس میں ایک حقیقت کی طرف بڑے ہی بلیغ اور لطیف انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔کہ جینے مرنے کی حقیقت کچھ بھی نہیں یہ تو محض شو کی لیلا ہے کیونکہ جب وہ پھیلتا ہے تو کائنات اٹھکیلیاں لینے لگتی ہے اور جب سمٹتا تو ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔لل دید کے واکھیوں میں جو اثر آفرینی اور دل میں اُتر جانے کی خصوصیت موجود ہے اُسی کا سب سے بڑا راز اس بات میں پوشیدہ ہے، کہ اس نے اپنے حقیقی تجربات کو کامیاب اور اعلیٰ شاعری کا روپ دیا[1] ۔

[1] لل دید واکھیہ اور اُسکا منظر۔موتی لال ساقی۔شیرازہ ( اردو ) لل دید نمبر کلچرل اکادمی سرینگر ( جلد ۔۱۸ نومبر دسمبر ۱۹۷۹ء

وحدت الوجود کا عقیدہ شنکر ویدانت میں بھی ہے جس کے مطابق پر برہم حقیقت اعلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے اس کا وجود ہی اُس کی صداقت ہے، جانداری اور آنند بھی اسی میں شامل حقیقت کے دو رخ ہیں وہ نہ جیو ہے نہ ایشور اور نہ جگت یا کائنات۔ یہ تینوں مایا اور فریب ہیں۔ جیسے سپنوں کی دنیا۔ شِو فلسفہ کے مطابق پرم برہم یا پرمیشور ہی اعلیٰ سے اعلیٰ حقیقت ہے جو ساری کائنات پر چھائے ہوئے ہے۔ وہ خود ہی جگت (کائنات) جیو اور ایشور ہے، یہ ساری کائنات اسی کا ظہور اور جلوہ ہے۔ ہر شے اس کا روپ دھارے ہوئی ہے جہاں میں گئی، جدھر بھی میں گھومی ہر جگہ اُسی (ایشور) کو حاضر و ناظر پایا۔ کانوں میں بالیاں سجا کے بھی وہی۔ جب وہی سب کچھ ہے تو میں کس شمار و قطار میں

یۆت بہٕ گٲیس تتہِ اوس سُے	تتہِ ڈیۆٹھم مول کوسُے
کنس ژٕ ھنِتھ وول سُے	سُے یُٔتے سُہ تہٕ بہٕ کوسہٕ

تو ہی آسمان اور زمین میں سمایا ہوا ہے، تو ہی دن، پوَن اور رات بھی ہے، تو ہی ارگ (پوجا کے چاول)، چندن، پھول اور جل ہے، تو ہی سب کچھ ہے، حیران ہوں کہ کیا تیری نذر کروں، کونسا چڑھاوا پیش کروں۔

گگن ژٕ ے، بھوٗتل ژٕ ے	ژٕ ے دٕن پون تہٕ راتھ
ارگ، ژندُن، پوش پونٛ ژٕ ے	ژٕ ے چھکھ سوٗر سے تہٕ لاگ زی کیات

"آچاریہ پرمیشور مجھے بھکتی کی مستی میں ساری کائنات میں شوناتھ کے درشن نصیب ہوں تاکہ میری ہر حرکت اور میرا ہر عمل شِو ہی کی پوجا معلوم ہو"۔ ابھنوگپت نے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"شویوگی جو کچھ بھی کہے وہی اُسکا جپ منتر ہے اُس کے شریر کی ہر ادا

ایک ایک مدرا ہے، اور اُس کا ہر نفس پرانا یام جبس دم میں شامل ہے[۱]۔''

لل دید کے اس واکھ میں بھی یہی واضح اشارات ملتے ہیں۔

یِی یِی کرِتی ارژون (ارژُن) یِی یِی رستہِ وبۂ ورُم تی منتھر

یِی یِی لگیم دیہس پرٔژے سُے پرمہ شون منتھر

ویشنوی عقیدہ کے مطابق پرمیشور کا کائنات ہست و بُود سے ماورا کوئی وجود نہیں لیکن کشمیر شوشاستر میں پرمیشور شوشکتی کے تصور سے ماوراالازمانی اور لامکانی ہے۔ شوشکتی کا تصور اس کی انتہا ہی سہی لیکن پرمیشور کا ماورائی پیکر اس کی آخری منزل ہے جس کی کوئی انتہا نہیں جو لاشخصی ہے۔

لل دید کا ارشاد ہے کہ وہاں تک نہ الفاظ کی رسائی ہے اور نہ ہی کائنات کی کوئی شے وہاں کام آسکتی ہے۔ خاموشی اور سکوت کی مدرا بھی وہاں باقی نہیں رہتی۔ وہ شوشکتی کی پہچان سے ماورا ہے۔ یعنی وہاں شوشکتی کا تصوری پیکر ٹوٹ جاتا ہے اُسکے بعد جو کچھ بھی باقی وہ تمہیں سمجھانے کیلئے کافی ہے

واکھ مانس کول اکول نا اَتے

ژھوپہ مُدرنا اتہِ پرٔدیش

روزان شِو شکھتِ نا اتے

موتہِ یَے کینہِ تہِ سُے وو پدیش[۲]

بودھ فلسفہ میں کائنات شب و روز در دنیا و مافیہا سے ماوراءِ ذات کو شُنیٰ (کینْہہ)

[۱] لل دید بہ حیثیت شویوگنی۔ ڈاکٹر بلجی ناتھ پنڈت۔ شیرازہ (کشمیری) لل دید نمبر جلد۔۱۶۔ شمارہ۔۶۔ مطبوعہ کلچرل اکادمی۔ [۲] وہاں حرف زبان باقی رہتا ہے اور شو فلسفہ کے بتائے ہوئے ۳۶ تتوُوا کا عمل۔ وہاں شوشکتی تو بھی باقی نہیں جو کچھ باقی رہتا ہے وہی باقی رہتا ہے وہی اُپدیش ہے) لل دید۔ کلچرل اکادمی۔ اا ایڈیشن۔ صفحہ ۳۸۔ مرتبہ۔ پروفیسر طالب و پروفیسر جیالال کول۔

کا نام دیا گیا ہے۔ ویدانتی اسے شدھ چیتنا کہتے ہیں۔ شوشاستر ان عقاید کی نفی کرتا ہے، یہ مانتے ہوئے بھی کہ پرمیشور اور اپنی آتما دو الگ چیزیں نہیں۔ عرفان ذات کو ریاضت وعبادت کا بلند مقام مانا گیا ہے۔ لل دید نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے گلہائے عرفان کے باغ سجائے ہیں جب وہ کہتی ہے کہ میں نے صحرائے ''شُنیہ'' کو اپنے وجود سے خارج کر دیا، میں ہوش وہواس کھو بیٹھی، مجھے عرفان ذات نصیب ہوا، اور میرے وجُود کے اندر عرفان کے گلہائے رنگا رنگ کے کنول کھلے یعنی میں نے اپنے ہی وجُود میں شوناتھ کو پایا۔

شیٖنیک مأداں کوٚڈم پانس — مےٚ للہِ رُوٗدم نہٕ بو تہِ ہوش
ویٚزٕ ے سپنس پننس پانس — اِدٕ کم گل پھوٚلی للہٕ پمپوش
لل بو دزٕ ایٖس لولرے — ژھانڈان لوٗسم دٕہن کھوراتھ
وُچھم پنڈتھ پننے گرے — سُے مےٚ رُوٗٹمس نیچھترتہِ ساتھ

بھارت کے دھرم شاستروں اور جین دھرم کے برعکس کشمیر شومت اُس تپسیا کے خلاف ہے جس سے جسمانی اذیت پہنچنے کا احتمال ہو۔ اعلیٰ وارفع بھکتی وہی ہے۔ جو باہمہ دبے ہمہ رہ کر عرفان ذات کے صبر آزما مرحلہ سے گزر کر حاصل ہو۔ لل کا ارشاد ہے کہ او مورکھ یہ عمل صالح نہیں کہا جا سکتا ہے کہ تو دن رات تن پروری تن آرائی وتن آسانی میں لگا رہے سوچ وچار (عرفان نفس) ہی اُپدیش ہے۔ ایک اور واکھیہ بھی اسی حقیقت کی راز افشائی کرتا ہے رسمی سادھناؤں سے پرمیشور کے درشن نصیب نہیں ہو سکتے۔

تو وجودِ ذاتِ حق کی چاہتا ہے معرفت
حاجت ضبط وسکوں اسکے کچھ بھی نہیں
آرزو مندی سے بس تو نہیں پا سکتا نجات

دھیان میں کوئی نہ ہو کیوں محو ہی آٹھوں پہر
پھر بھی اندازہ تشخص کا بہت دشوار ہے[1]

موڈ و کرٔے چھے نہٕ دارُن تہٕ پارن
موڈو کرے چھے نہٕ رٕچھنٕ کاے
موڈ وکرے چھے نہٕ دیہہ سُند ارُن
سہنٕ وجٕارُن چھُے ووپدیش

لل دید نے یوگ اُن مدارج کا بھی ذکر کیا ہے جو شاستر کے مطابق شو یوگی یا یوگنی کو عرفان نفس حاصل کرنے کیلئے طے کرنا ہوتے ہیں تا کہ اُسے پرمیشور کی عنایات نصیب ہوں۔ اس کی رو سے اپنے تصور کے بل یا کلپنا سے شریر کو پران میں، پران کو بدھی کو چیتنا میں جذب کر کے ماورائی حقیقت یا گیان کی منزل طے کی جاسکتی ہے۔

منتھٕر گلہِ تأے موٗنتے ژبتھ تنتھر گلہِ تأے منتھر موژے
شوٗنبس شُنٕز یامیلتھ گو ژبتھ گوٗل تأے کینہ نأگنے

تانتر کے کلعدم ہونے سے منتر باقی رہیں گے منتر بھی نہ رہے تو چیتنا، چیتنا کا شعور بھی ختم ہو تو باقی شُنٕز"ہی"شُنٕز"اور ماورائی ذات رہیگی جو ایک یوگی یا یوگنی کی محبوب منزل ہے"

اس امر کی طرف پہلے ہی اشارہ کیا جاچکا ہے کہ شِو فلسفہ اس ساری کائنات رنگ و بو کو پرمیشور یا پرمہ شو کا مظہر قرار دیتا ہے۔ شو شاستروں کے گیانہ یوگ کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ آتمہ دیو خود پرمیشور ہے جو خود جیو کا شریر ہے شو یوگی کے سبھی ہوش و حواس، اس کی حرکات و سکنات کلپنا کی شکتی لے آتمہ دیو کے

[1] وہاں حرف زبان باقی رہتا ہے اور نہ شو فلسفہ کے بنائے ہوئے ۳۶ تتوٗں کا عمل۔ وہاں شو شکتی تو بھی باقی نہیں، جو کچھ باقی رہتا ہے۔ وہی اپدیش ہے۔ لل دید کلچرل اکادمی۔ ایڈیشن صفحہ ۱۱۹۔ مرتبہ پروفیسر طالب پروفیسر جیالال کول

ارپن ہوں تو وہی اُسی کا سب سے بڑا ہون مانا جائیگا[۱]۔

کون ہے مالی کون ہے مالن
کس سامان سے؟ کن پھولوں سے
پوجا اُس کی تو کرتا ہے
من کی شانتی کے مقصد سے
کس ندی کے جل سے اُس کو
دھیرے دھیرے نہلاتا ہے؟

من ہے مالن شوق ہے مالن
پوجا کے گلہائے عقیدت
اُس کے آگے لا کے رکھدے
چاند کے رس کی گنگا سے پھر[۲]
تازہ تازہ پانی لیکر
اُس کو تو اشنان کرالے
جپ لے منتر ہوگا اُجاگر
آتم تیرا پیارا شنکر
دیکھے گا تو من میں اپنے!

۱؎ لل دید بحیثیت شویوگنی۔ ڈاکٹر بلجی پنڈت۔ شیرازہ کشمیری (لل دید نمبر) جلد۔۱۶۔ شمارہ ۶۰ مطبوعہ کلچرل اکادمی جموں کشمیر

۲؎ یہاں رسمی پرستش کے خالف روحانیت کی برتری کا ذکر کیا گیا ہے۔ چاند سے مراد وہ پُراسرار چاند ہے جو کاسہ سر میں متمکن ہے اور اس کے رس سے وہ امرت مراد ہے جو آرادھنا کرنے والے کے روحانی شریر میں داخل ہوتا ہے اور اُسے اپنے آپکا مالک بنانے کے قابل بنا دیتا ہے منترے سے مطلب سکوت کا عمل ہے جس میں شویوگی بغیر کسی آواز کے فقط سانس کے اتار چڑھاو سے کام لیتا ہے۔ (لل دید۔ مطبوعہ کلچرل اکادمی۔ ایڈیشن۔۲)

کس پش تے کوسہٕ پشأنی
کم کسُم لأگی زبس پوزے
کوٕ گوڈِ دزِبس ذلچہٕ ذأنی
کر منتر شنکر وۄزے

من پش تے یژھ پشأنی
باوِ کی کسُم لأگی زبس پوزے
ششہِ دسہٕ گوڈِ دزِبس زلہٕ دأنی
ژھوپہ منتر شنکر وۄزے !

جنم مرن کے چکر سے نجات دلانے میں کشمیر شوازم پرمیشور کے انوگر یہہ کو افضل سمجھتا ہے، وہی منش (بشر) مکتی پاسکتا ہے جس پر شوناتھ کی مہربانیاں ہوں۔ پرمیشور کی شکتی پات لیلا محیر العقول طریقوں سے جاری ہے[۱] یہ ہے اُس فلسفیانہ اساس کی تلخیص جس تناظر مین بلا شبہ لل دید کے کلام کا مطالعہ کرنے میں بہت حد تک مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی رواداری، انسان دوستی، اعتدال پسندی، صلح وآشتی اور محبت جیسی قدیم قدریں تاریخ کے عہد ساز اَدوار سے گزر کر ہماری مشترکہ میراث کی حیثیت رکھتی ہیں جو لل دید کے لاشعور کے جھروکوں سے ہمیں آج بھی بلا رہی ہیں۔ لل دید کے کم سن ہم عصر نند رشیؒ ان ہی درخشندہ اقدار سے ہماری تاریخ راہوں کو منور کئے ہوئے ہیں گو کہ اُن کے بیشتر کلام پر اسلامی تصورات پرتو فگن ہیں جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ سبھی عالمی مذاہب انسانی عظمت وآشتی کے نقیب بھی ہیں اور نغمہ خوان بھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لل

[۱] لل دید بہ حیثیت شیو یوگنی۔ ڈاکٹر بلجی پنڈت۔ شیرازہ کشمیری (لل دید نمبر) جلد ۱۶۔ شمارہ ۶

دید شِو یوگنی ہوتے ہوئے بھی للہ عارفہ کے روپ میں یہاں کے مسلمانوں کے قلب وجگر پر حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین ولیؒ کے پہلو بہ پہلو بے تاج فرمانروائی کر رہی ہے۔ وہ گیان دھیان کی دیوی کے روپ میں اور ننددرشی سہج آنند پیکر کی صورت یہاں کے ہندوؤں (کشمیری پنڈتوں) کے دل کے سنگھاسن پر براجمان ہیں۔

گیا ہٕکی امبر ہٕ پرتھ تتنے
یم پد للہ ہٕ وٕنی تِم سرہٕد اٴنکھ
کاہٕنی پزٕ نو کِہ لے کوٗر للے
ژٕتھ جیوتہٕ کاٴسن مرٕنہٕ شانکھ

☆☆☆

# لل دید اور روحِ عصر

ہر عہد ساز شخصیت غلط عقید تمندانہ تاویلات ومفروضات کے ملبے تلے دب کر بھی اپنی سدا بہار داخلیت وانفرادیت کی بناء پر اُبھرتی آئی ہے۔ یہی بات لل دید پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ کشمیری زبان وادب کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ زبان وادب کے دوراہے پر ہی نہیں تاریخ کے بھی۔ اُس کی حیثیت ایک تاریخی یا سماجی رہنما کی نہیں بلکہ ایک عظیم المرتبت فنکار کی ہے۔ جسکے اَنمٹ نقوش تاریخ کے بے رحم ہاتھوں کی گرفت سے آج تک باہر رہے اور آنے والی صدیاں جس کے پُر بہار شباب کو لوٹ نہیں سکتیں۔ وہ نہ ہی کوئی مذہبی اور فلسفی شاعرہ تھی اور نا ہی کسی اسلامی تصوف اور شِو فلسفہ کے امتزاج کی خالق۔

کسی بھی فنکار کی شخصیت کو جانچنے کے لئے اُس عہد کے تمدنی، تاریخی اور سماجی قدروں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے یہ مانتے ہوئے بھی کہ الفاظ کی دُنیائے فسوں بسانے والا، اظہار کی خلیج پاٹنے والا بڑا فنکار ہر لحاظ سے تاریخ کے بہت آگے ہوتا ہے۔ لل دید بھی ایسے ہی بڑے خوش بختوں میں سے ایک ہے کوئی مادی، سماجی، تاریخی جبریت کا قائل ہو یا جنسی شعور کی برتری کا۔ افادی ادب کے نظریہ کو تسلیم کرتا ہو یا تجریدی جمالیات کے زاویہ نگاہ کو مانتا ہو، تخلیقی ادب کی عظمت اور آفاقیت اُسکو ہر عہد میں اپنا لوہا منواتی رہیگی۔

ہر دور کا اپنا جداگانہ مزاج ہوتا ہے، اپنا سیاسی، سماجی اور لسانی رنگ ہوتا ہے۔ بعد زمانی کے باوجود لل دید آج بھی ہمارے دل کے نہاں خانوں کو

منور کرتی ہے اور ہم ایک ذہنی اور رؤحانی قرب سا محسوس کرتے ہیں۔ جبکہ اوتار بھٹ کی ''بانا سرُ کتھا'' اور شتی کنٹھ کی مہا نے پرکاش کے سمجھنے میں ہمیں بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا رہا ہے حالانکہ لل دید کے کئی اچھے واکوُں کا انتہائی لسانی قرب اُنہیں مشکوک بھی بنا دیتا ہے۔

عبدالاحد آزاد نے اس بات کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

''مہاتما شیتی کنٹھ سنسکرت کے عالم اور رؤحانیات کے دلدادہ تھے۔ للہ عارفہ کو بھی رشیوں اور مہاتماؤں کے فیض سے رؤحانیت کا اعلیٰ مرتبہ حاصل ہوا تھا۔ اِن بزرگوں کے تخیلات کا ماخذ سنسکرت ادب تھا۔ اگر اُن کے کلام میں سنسکرت اور ہندی الفاظ کی بہتات ہے تو انوکھی بات نہیں بلکہ اس میں واقعیت ہے۔ یہ بھی عرض کروُنگا کہ میری اس رائے کو قیاس سے زیادہ وقعت نہیں ممکن ہے کہ اُس زمانے کی مروجہ زبان وہی ہوگی جو اُنہوں نے استعمال کی ہے۔ لیکن ''مہا نے پرکاش کی طرز کی عبارت کو جیتی جاگتی زبان نہیں کہا جا سکتا۔''

بقول علی جواد زیدی ''مہا نے پرکاش کی زبان عوامی زبان سے دور سہی لیکن وہی قالب بدل کے جیتی جاگتی زبان بنی۔ خیر یہ مسلہ جس کا تعلق لل دید کی شاعری کے لسانی پہلو سے ہے زیر بحث لانا میرا مقصد نہیں۔ لل دید کا قریبی ہم عصر جونراج اُس کے بارے میں خاموش ہے۔ شاعری اور ادب دونوں تاریخ سے زیادہ زندگی کے قریب ہوتے ہیں۔ اس لئے لل دید کی شاعری کو تاریخ کے آئینے میں پرکھنا سعی لاحاصل سے کم نہیں ہوگا۔ کیونکہ تاریخ عام طور پر حکومتوں کے عروج وزوال کی سلسلہ وار واقعہ بیانی سے آگے نہیں بڑھتی۔ لل دید چودھویں صدی میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی، بیاہی گئی ترکِ علائق کے بعد للہ ایشوری اور للہ عارفہ کے نام سے مشہور ہو کر اس دنیا سے چل بسی۔

چودھویں صدی کو اگر کشمیری تہذیب وتمدن کے نئے امتزاج کی صدی کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کیونکہ اسی صدی میں ارضِ کشمیر کو باضابطہ طور اسلام کی ابدی ضیا پاشیاں نصیب ہوتی ہیں اور اُس کا حلقہ اثر بھی بڑھنے لگتا ہے۔ اس تہذیبی لین دین کے عرؤج میں اور وجوہات کے علاوہ یہاں کے ہندو حکمرانوں گی رواداری کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔

لل دید کا ذکر باضابطہ طور سترھویں صدی کے وسط کے بعد فارسی تاریخوں اور تذکروں میں عقید تمندانہ رنگ آمیزیوں کے ساتھ آتا ہے۔ مبالغہ آرائیوں اور مفرؤضات کے دھندلکوں میں اُسکی فنی شخصیت کے خدوخال گم ہوجاتے ہیں۔ لل دید کی شاعری کو سمجھنے کیلئے یہاں کے غالب تہذیبی ورثے کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اُسی صورت میں اُس کے فنکارانہ قد وقامت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ للہَ واکوں اور واک نما شلوکوں (شرکوں) کی آپسی آمیزش کے پیش نظر ایسا کرتے ہوئے بھی پھونک کر قدمؔ رکھے بغیر چارہ نہیں۔ لل واکوں اور شیخ نؤرالدین ریشیؒ کے شلوکوں (شرکوں) میں چھپی اَبدی مسرت کی چنگاریاں آج بھی بجھے دلوں کو سوز وگداز دے رہی ہیں۔ طباعت واشاعت کے فقدان کے سامنے فن کے پجاری جھکے نہیں، اُنھوں نے صحیفہ قلب وجگر پر فن کے اَبدی نقوش کھینچے اور عظیم فنی وادبی سرمایہ کو محفوظ رکھ کر کشمیری زبان وادب کو سر بلند رکھا۔ گو اسطرح وقتاً فوقتاً لل واکوں میں لسانی اور غیر فنی آمیزش ہوتی رہی جسکو ذہن میں رکھتے ہوئے فن شناس نظر بھی دھوکا کھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

لل دید کے کلام میں اُس دور کی ہورہی سماجی، سیاسی اور انتظامی تبدیلیوں کی بالواسطہ بازگشت کی تلاش بے معنی ہے۔ لل دید ایک پنڈت

گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اُس کے ذہنی اِرتقاء میں اُسکے خاندانی گورٗو اور اُسوقت کے مشہور پنڈت سدھ سری کنٹھ کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لل دیدٕ۔ کے عقائد شو فلسفہ سے مطابقت رکھتے تھے۔ کشمیری شو فسلفہ کے بانیوں میں واسو گپت، سوما نندا اور اَبھنو گپت و دیگر مفکرین قابل ذکر ہیں۔ اس سے پہلے یہاں بدھ مت کو بول بالا تھا جس کے اثرات سے شومت کا دامن بچانا آسان نہیں تھا۔ لل دیدٕ کے کلام میں اسی امتزاجی تہذیبی ورثے کے خدوخال نمایاں ہیں۔ پروفیسر نندلال کول طالبؔ (مرحوم) اور پروفیسر جیالال کول ''لل دیدٕ'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

''لل دیدٕ بلاشبہ ایک شیو یوگنی تھیں اور شیو فلسفہ کی ترجمان، ترکا فلسفہ کے رموز ونکات اور تانترک عمل سے بخوبی واقف تھیں، جیسا کہ اُن کے کلام سے ظاہر ہے جسمیں وہ بار بار پران، اَپان، نادبند، کنڈلی، یوگ کلاؤں اور برہمہ رندر کا ذکر کرتی ہیں۔ اُن کے نزدیک پرم شو'' اکُل ہے مگر شکتی جو کل یعنی تتوؤں کی دنیا ہے شو کا دوسرا روٗپ یا پہلو ہے۔ مایا محض ایک موہوم تصور نہیں بلکہ شکتی ہے۔ کائنات ممکن الوجود ہے اور عامل کے لئے ذریعہ عمل کشائش ہے یا بالفاظہ دیگر وہ برھمانڈ ہے جسمیں برھما کے انڈے پائے جاتے ہیں

انسان کے پیدا ہوتے ہی پہلا سانس لینے کے ساتھ ساتھ کشمکش حیات شروٗع ہوتی ہے۔ بچپن سے بلوغیت تک روایات کے قالب میں اُس کا ذہن ڈھل جاتا ہے۔ کائنات ہست وبوٗد کے بارے میں ان گنت سوالات اُسکے باطن کو شدت سے کریدنے لگتے ہیں۔ زندگی کا یہی مقام ہے جہاں لل دیدٕ کو بھی زندگی کی تلخ کامیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ ایک حساس فنکار کیطرح یہ سب کچھ دیکھتی اور سچی یوگنی کے مانند سہہ لیتی ہے سسرال میں سہیلیوں کی

جانب سے کہے جانے پر کہ آج تیرے گھر میں قسم قسم کی ضیافتیں تیار ہونگی اور تم پیٹ بھر..........کھانا کھاؤ گی۔

لل دید درد بھرے اور فنکارانہ انداز میں جواب دیتی ہے۔

ترجمہ: مینڈھا ذبح کیا جائے یا بھیڑ لل کا مقدر بٹا ہی ہوگا۔ لل دید کا یہ قول جواب ضرب المثل بن گیا ہے سسرال کے روایتی مظالم کے خلاف ایک خاموش، پُرمعنی اور پُرزور احتجاج ہے۔ ظاہر ہے کہ ابھی وہ ناروا ازواجی زندگی کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی اور ترک علائق کی گھڑی ابھی تک نہیں آئی تھی۔

انسان کا نفس تین طرح کا ہے۔ ایک وہ جو گناہوں کی طرف مائل رہے اُس کو نفس اَمارہ کہتے ہیں دوسرا وہ جو برائی اور قصور کے سرزد ہونے پر ملامت کرے کہ تو نے یہ حرکت کیوں کی، اُس کو نفس لوامہ کہتے ہیں۔ تیسرا وہ جو برائیوں سے متنفر ہو اور نیکیوں کی طرف راغب کرے اُس کو نفس مُطمئنہ کہتے ہیں۔ نفس لوامہ کی حالت لل دید کے اوپر نقل کئے گئے قول پر صادق آتی ہے۔ کیونکہ اُس میں اُسکی اپنی ازدواجی زندگی سے بیزاری بھی عیاں ہے۔ پہلی حالت سے اُس نے ازل ہی سے چھٹکارا پایا تھا۔ تیسری حالت جو اُسے کو ترک علائق کے بعد نصیب ہوئی جسمیں ہمیں واکوں کے انمول موتی ہاتھ آئے۔

آمہِ پنہٕ سٕو درس ناوِ چھس لمان        کتہٕ بوزِ دے میون میٚتہٕ دیہٕ تار!

آمین ٹا کین پوٗنی زن شمان        زُو چھم بڑ مان گر گژھہٕ ہا!

ترجمہ: میں سمندر میں کچے دھاگے سے ناؤ کھیتی چلی جاتی ہوں۔ کاش! میری دعا منظور ہو خدا کی بارگاہ میں اور میرا بیڑا ابھی پار ہو۔ میری جان اپنے گھر جانے کو یعنی حقیقت ابدی سے وصل کے لئے یوں ترستی ہے جیسے کچے مٹی کے برتن سے پانی رستا چلا جائے کچے دھاگے سے کشتی کھینا۔ جان مضطرب کا کچے

مٹی کے برتن سے رستے پانی کی طرح ہونا ایک بھرپور فنکارانہ تجربہ کو سامنے لاتا ہے۔ عشق و آگہی کے لئے یہ سب کچھ ممکن دکھائی دیتا ہے اور منزل قریب سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ ہے اس واک کا پہلو۔ خارجی مطالعہ سے کشتی، دریا، مٹی کے ظرف کا ہونا بھی عیاں ہے۔ بے نام منزل کو جالینے کی یہ تمنا شدت اختیار کرتی ہے۔ اور وہ بے اختیار پکار اُٹھتی ہے۔

لِلتھ لِلتھ ودے یہ وآے ژِتا مُہچ پییِ ماے

روزی نو پتہٕ لوہ لنگر چ ژھاے نزِ سورِپ کیا موٗ ٹھے ہاے

ترجمہ: لل میں تجھ کو خود رہ رہ کر روؤں، اے میری شعور رکھنے والی ذات تجھے مایا نے اپنے بس میں کر لیا۔ اس دنیائے زیب و زینت کی چھایا بھی تیرا ساتھ نہیں دیگی آہ! تو اپنے اصلی روپ کو بھول بیٹھی۔ غالب نے اسی خیال کو اپنے انداز میں یوں ادا کیا ہے۔

حیران ہوں روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اسی قبیل کا یہ واک بھی ملاحظہ ہو۔

ہچو ہأرِ نجہٕ پیٹھریو کان گوم
اَکھ چھان پیوم یتھ راز دانے
مژٕ بازرس قُلفہٕ روٗس وان گوم
تِرتھہٕ روٗس پان گوم کُس مالہِ زانے

ترجمہ:۔ چوبیں کمان اور تیرِ خس دونوں بے کار، وجود کی راجدھانی کو ماہر فن کاریگر نہ مِلا۔ کھلے بازار میں میرا حال تالا لگائے بنا دوکان کا سا ہے، میں درشن سے فیضیاب نہ ہو سکی، میرا حال کون جانے۔ اس انتہائی ذاتی تجربے

کو از سرِ نو بیان کرنا میں جانتا ہوں کہ میرے بس کی بات نہیں پھر بھی میری ناچیز رائے میں لل کہتی ہے کہ وجود کی راجدھانی (شوکا سنگھاسن) فن سے بے خبر کاریگر ٹھیک ٹھیک ڈھنگ سے بنا نہیں پائے، چوبیں کمان اور تیرِ خس ظاہر ہے کوئی مدافعت نہیں کرسکتے ۔ اور بے قفل دوکان وجود کی، کوئی زیارت سے فیضیاب ہو تو کیسے کیونکہ اُس صورت میں عناصر کا متوازن رہنا محال ہے۔ اَچھوتی پیکر تراشی کو دیکھکر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ یہ تجربہ دل کی گہرائیوں میں اُتر کر فن کا روُپ دھار چکا ہے جس کا کوئی بدل نہیں ۔ ایک ایک پیکر فن کا اور وارداتِ قلبی کا بے انت دفتر ہے ۔

آیس کمہِ دِشہِ تہٕ کمہِ وتے
گوڈہِ کمہِ دِشہ تہٕ کوزلنہٕ وتھ
انتہٕ دائے لگےٚ تتے
چھیٚنس پھوکس کانٛہ دٕ ہتہِ نوستھ

لل کہتی ہے، میں نہیں جانتی کہ وہ کس راہ سے کہاں سے آئی اور نہ مجھے یہاں سے واپس جانے کی راہیں معلوم ہیں ۔ خوش نصیبی ہوتی اگر بالآخر منزلِ حقیقی کو پالیتی کیونکہ زندگی کے کالی تارِ نفس میں صداقت نہیں ۔ جذبات کی اسی رو میں تقدیر کی ناگزیریت اور اُسکی بالادستی کا اظہار یوُں کیا ہے۔ تسخیرِ کائنات اور ہمہ جہت ترقی کے باوصف انسان کے تقدیر سے منکر ہوتے ہوئے بھی ہر طرف فطرت کے پراسرار قوتوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ لل کہتی کہ اے انسان تو کیوں ریت کی رسی بٹتا ہے، ایسی بے کار کوشش سے تیری کشتی آگے جانے کو نہیں ۔ کلکِ ازل نے جو کچھ تیرے مقدر میں لکھا ہے وہ ٹالے سے نہیں ٹل سکتا ۔

ہا منشہِ کیا زِ چھکھ وُ ٹھان سیکہ لور
اَمہِ رٹہِ ہمالہِ پکی نہٕ ناو
لیوٗ گھے یہ نارٕ نی کرمنہٕ رِکھِ
تہٕ مالہِ ہیکی نہٕ پھرِتھ کانٕہہ

عشق کی کوئی انتہا نہیں۔ اس کے لئے بے تاب دِل اور سیمابی نظر چاہئے جو للہ دید ازل سے لے کے آئی تھی وہ اپنی عقابی نظروں سے ہزاروں پردے چیر کر حُسنِ ازل کے جلوے دیکھ سکتی ہے لیکن ایک مورکھ سے اُسکا پالا پڑنا بڑا کٹھن ہے۔

ڈ چھنِس اوٗ برٕس زایُن زلنہِ ہا
سٕدرس زلنہٕ ہا کَڈِتھ اتھ
مٕندِس روٗگیس وَیدیُت زلنہٕ ہا
موٗڈس زٕانم نہٕ پرٕنتھ کتھ

ترجمہ: میں دھنی گھٹاؤں کے ماخذ سے واقف ہوں، سمندر کو کاندھوں پر اُٹھانا، روگی کو بیماری سے نجات دلانا جانتی ہوں لیکن موٗرکھ کو بات نہ سمجھا سکی۔ کائنات کی باریکیوں کو جاننا ہر ذی ہوش کے بس کا روگ نہیں بھرتری ہری کا یہی خیال علامہ اقبالؒ نے بلیغ پیرائے میں یوٗں ادا کیا ہے۔

پھوٗل کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم ونازک بے اثر

زندگی میں نوعِ انسانی کو نشیب وفراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ داخلی اور خارجی تجربات کا رہ رہ کر جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ایک حساس دل ہی اُنہیں زبان دے سکتا اور فرش سے عرش کو اُٹھا سکتا ہے۔ فنکارانہ ترفع (Suhlimation)

کا عمل ایک عام تجربے کو کچھ کا کچھ کر دیتا ہے۔ ایک عام تجربے کو جس پیرائے سے ادا کیا گیا ہے وہ للّ ہی کا حصہ ہے۔ وہ کہتی ہے پیٹھ پر بندھا ہوا نبات کا بوجھ ڈھیلا پڑ گیا جو اُٹھائے سے نہ اُٹھا۔ یہاں تک کہ میرے قد وقامت میں خم آ گیا۔ گورو کا وچن میرے لئے گمشدگی کے گہرے احساس کی مانند ہے گڈریے کے بغیر ریوڈ کی سی حالت مجھ سے سہی نہیں جاسکتی۔ عرفان وآگہی کے طالب کے لئے ہی آفاقی، ہمہ جہت اور سدابہار عارفانہ تجربہ ہر وقت جام بہ کف ہوگا۔

ناپدی بارس اَتہٕ گنڈ ڈیوٗل گوم
دیہہ کاڈ ہوٗل گوم ہبکہٕ کٔہیو
گورِ سُند وَنُن راوَن تیوٗل پیوم
پہلہٕ رؤس کھیوٗل گوم ہبکہٕ کٔہیو

للّ دید کشمیری زبان اور اسمیں بھکتی تحریک کے بانیوں میں سے ہے۔ ہماری وادی گل پوش صدیوں سے ریشیوں اور منیوں کا مسکن رہی ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ کشمیر اگلے وقتوں سے علم وآگہی کا گہوارہ رہا ہے کشمیریوں نے سنسکرت زبان وادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ ہند کے دھارمک ادب میں شیو فلسفہ کا اضافہ کر کے عرفان ذات کا نیا باب کھول دیا، فارسی زبان کے دامن کو انمول موتیوں سے بھرا ہے۔ تہذیب وتمدن کے مثبت نشوارتقا کیلئے یہاں کے علم دوست اور دور اندیش حکمرانوں نے اپنی آغوش وا رکھی۔ للّ دید دربار سے الگ، صلہ وستائش سے بے نیاز محبوب حقیقی کی تلاش میں سرگرداں فن میں ڈوب کر فن وآگہی کے رموز سے یوں پردہ ہٹاتی ہے۔

"محبوب حقیقی کو صدق دلی سے ڈھونڈا اپنے وجود میں اُسکا حقیقی مسکن یہ ہے، حرص وشہوت پر قابو پا کر تجھے سچی سُندرتا ملے گی اور تیرا وجود نورِ ذات کی

جلوہ سامانیوں کا مرکز ہوگا۔''

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

علامہ اقبال دوسری جگہ دوسرے انداز میں خودی کے رموز کو یوں بیان کرتے ہیں۔

مُنکرِ حق نزدِ مُلا کافر است
مُنکرِ خود نزدِ من کافر است

اور لل دید بھی ایشور کو پانے کے لئے خود آگہی کو مقدم گردانتی ہے۔

سومنہِ گارُن منز یتھ کندے
یتھ کندِ دپاں سوڑپ ناو
لۆب، مۆہ ژلی شۆب یی کندے
یتھ کند تیز تے سور پژ کاش

یہ کٹھن راستہ بے لگام طے نہیں ہوسکتا۔ حدِ اعتدال میں رہ کر ہی آدمی آدمی انسان کہلانے کا مستحق ہے۔

یۄ تر ژلی تم امبر ہتھا
بوچھِ یۄ ژلی تی اہار اَن
ژِتا سوپرٕ وبژارس پتھا
ژِتا دیہس وان کیا وَن

یعنی کایا کو فقط سردی بچانے کیلئے کپڑے پہن۔ جس سے تیری بھوک مٹے اُتنا ہی کھانا کھا۔ میرے من! ذاتِ حق کو پہچان، یہی وچار کر، تن بدن کو بھی وہی سمجھا، کیونکہ پرم آتما اور پرم شِو تجھی میں متمکن ہے۔

ضبطِ نفس مکتی حاصل کرنیکی کنجی ہے۔ صبر و تحمل اسکا اہم رُکن۔ عشق و محبت دو سے شروع ہو کر کائنات کا احاطہ کرتی ہے۔ لل دید کہتی ہے کہ میں شنکر کی پوجا میں جان و تن سے مگن ہوں۔ مجھے کوئی ہزار بُرا بھلا کہے یا دشنام دے، میرے جی پر ذرا بھی اثر نہیں ہونے کو، کیونکہ راکھ کی میل آئینہ پر نہیں جمتی۔ ظاہر ہے کہ من و تو کی ریتلی دیوار مٹ چکی ہے اور وہ محبوب حقیقی کو من کی نینوں سے ہر رُوپ میں دیکھتی ہے۔ بُرا بھلا سب کچھ سہتی ہے، یہی سچے بھگت کی پہنچان ہے۔

أسا بول پڑِنم ساسا
مےٚ منہِ واسا کھید ناہیٚے
بویہ سہز شنکر بکھژ آسا
فکرس ساسا مل کیا پیٚے

ایسے مقام پر ظاہری پرستش بے معنی ہے۔ یاد رہے کہ شیو فلسفہ کے مطابق مذہبی رسُوم اور پُوجا ترجیحات میں شامل نہیں۔ انسان پھر بھی توہمات کا دامن تھامے ہوئے ہے۔ شاید اُسے مضطرب باطن کو اسی طرح تسکین ملتی ہے۔ لل کہتی ہے کہ اسے مؤرکھ پنڈت یہ کس کے اُپدیش پر تو جاندار بھیڑ کو بے جان صنم کے آگے ناحق قربان کردے، یہ پانی اور گھاس پر زندہ رہتی، تیرے تن بدن کو ڈھانپتی اور تجھے سردی سے بچاتی ہے۔ اس واک سے اہنسا کے اصول کیطرف بھی ہماری توجہ مبذول کی گئی ہے۔

تڑن زل کری آہار لزکاسی شیت نواری
أژِیتین وٚتس ئوٚیتن دیٚن آہار یہ کُمی وو پدلیش کوٚرُے بٹا

یہ سب کچھ جب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب راہ حقیقت کا طالب مرشد حق کے وچن پر صدق دلی سے عمل کرے اور گیان کی باگ سے شعور کے

گھوڑے کو قابو میں رکھے۔ سارے اندریوں کو نظم وضبط میں رکھکر اُسے آنند نصیب ہوسکتا ہے، وہ امر ہوگا، اُسے کوئی مار نہیں سکتا۔

گوٗرِ شبدس یُس یژھ پژھ برے
گیانہٕ وگہِ رٹہٕ ژیتہٕ تورگس
یئندر ریٚے شوٗمرتھ آنند کرے
اِدِ کُس مرِتہٕ ماژن کس!

خود آگہی اور عرفان ذات حقیقت مطلق کو پانے کے لئے پہلا زینہ ہے لل کہتی ہے کہ میں نے کائنات کی لامحدود خلاؤں کو چھان مارا۔ مجھ پر خود رفتہ گی کی حالت طاری ہوئی۔ میں نے اپنے وجُود کی اصلیت کو پالیا اور خاک سے کنول کا پھوٗل ہوئی۔

شُنیُک مأدان ژھوٗنڈُم پانس
مےٚ للہِ روٗزِم نہ بودنہٕ ہوش
ویزِے سپنِس پانےٚ پأنس
اِدِ کمہِ گلہِ پھوٗل للہِ پمپوش

اسی حقیقت کو لل یوں بیان کرتی ہے کہ جو تلاش حق کے لئے ’’سوہم‘‘ کا منتر دن رات جپتا رہے اور شیو کا نام ورد کرے، اپنے من کو دوئی سے پاک رکھے وہی دیوتاؤں کے دیوتا کی خوشنودی حاصل کرسکتا ہے۔

شو شو کران ہمسہ گتھ سوٗرتھ
روٗزِتھ وبو ہأری دبُن کیاوٕ راتھ
لاگہِ روٗس اَدٕے یُس من گرتھ
تسی نبتھ پرٔسن سُرِ گرِ ناتھ!

زندگی مسلسل تبدیلی کا نام ہے۔ شکتی روپ پر روپ بدلتی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ "بقا اک تغیر کو ہے زمانے میں" ہم آتے رہینگے اور جاتے رہینگے لیکن کائنات جاری وساری رہیگی۔ لل کہتی ہے "ہمیں تھے، ہمیں ہونگے، ہمیں نے ابتدائے آفرینش سے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ شو کے حیات وممات کا سلسلہ کبھی ٹوٹیگا نہیں اور نا ہی سورج کی رہ نوردی منزل کو جالیگی۔

اَسی اَسی تہٕ اَسی آسو

اَسی دور کری پتہٕ وتھ

شوس سورنہ زیوٗن تہٕ مرُن

رَوس سورِنہٕ لتہٕ گتھ

مسلۂ آواگون کی طرف بھی اس واک میں صریح اشارہ ملتا ہے گو کہ "شیوازم" شیو کا روپ دھار کر اس چکر سے مُکتی پانے کی تعلیم دیتا ہے۔

سکوت یا اس قسم کی اور حرکات واعمال سے براہِ راست اُس تک رسائی ممکن نہیں۔ ان کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ معرفت ذات کا قرب پایا جاسکتا ہے۔ ذاتِ حق شو شکتی بھی نہیں کیونکہ ان "تتووں" میں بھی صورت اور نام کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ "وہ" ان دونوں سے مبرا ہے وہ نرگن اور نراکار ہے۔ دکھاوے کی رسمی پوجا کے ساتھ ساتھ یہ واک ذات پات کی غیر فطری تقسیم پر بھی ضرب کاری ہے۔ یہاں پر بھی ہندومت اور کشمیر شیومت کے درمیان حدِ فاصل قائم ہوتی ہے۔

واکھ مانس کول اَکول نا اَتے

ژھوپہٕ مُدرِ لتہِ ناپرویش

روزان شو شکھتھ نا اَتے

موتہ ییٚ کُنہہ تہٕ سُے وو پدیش

نفس امّارہ کو قابو کرنا کوئی آسان کام نہیں، ریاض و عرفان کے مختلف مدارج طے کرکے لل دید کو نفس مطمئنہ پانے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے اپنی کایا کے محل کے در در یچے بند کردیئے اور دُزدِ نفس کو اپنے قابو میں کر کے اُسے دل کوٹھڑی (یعنی دل کے نہاں خانے میں) میں محبوس رکھکر ''اوم'' کے چابک سے مار مار کر سر اُٹھانے نہ دیا۔ اس واک کی چست بندشوں اور الفاظ کے فنکارانہ برتاؤ سے نفس کے دُزدِ ازلی کو زیر کرنے کی ساری اثر انگیز کیفیت آنکھوں کے سامنے رقصاں نظر آتی ہے۔

دیہچہ لرِ دارِ بر ترٛوپرِم
پرٛانہٕ ژٛور روٗٹم تہٕ دیٛت مس دم
ہردیہچہِ کوٗٹھرِ اندر گوٗنڈُم
اوٗمکہ چوبکہٕ تلمس بم

یہ سلسلہ روٗپ بدل بدل کر آج بھی جاری ہے جبکہ آج کا فنکار بھی اپنی ذات میں گُم کچھ کھویا ہوا پانے کی آرزو کا دامن تھامے ہوئے ہے۔

☆☆☆

# لل دید اور عصر جدید

زشعر دل کشِ لل دید می تواں دریافت
کہ درسِ فلسفہ می داد و عاشقی ورزید[1]

وادیٔ مینو نظیر قطعۂ بہشت ارضی کشمیر اگلے وقتوں سے عرفان و آگہی و شعر و مسرت ابدی کا مرکز و محور رہی ہے، شیو مت کے دوش بدوش یہاں بُدھ مت کو بھی نئی جہتیں عطا ہوئیں ۔ چودھویں صدی میں اسلام کی ضیا باریوں کے سائے میں ایک امتزاجی تہذیب وجود پذیر ہوئی جس کی جڑیں یہاں کی صدیوں پُرانے تمدنی و ثقافتی ورثے میں پیوست ہیں۔ لل دید کا عہد کشمیر میں سیاسی ، سماجی و تاریخ اُتھل پتھل کا عہد ہے ، زندگی کی پیہم حشر سامانیوں کی پرچھائیاں لل دید کے کلام میں زیادہ نہیں تو کم کم بکھری پڑی ہیں ۔ یہ واک کہ ابھی بہتی ندی تھی معمول کی اور ابھی یہی طوفان بدوش ہے کہ کہیں پار کرنے کی راہ نہیں، کِھلتی کلیاں چشم زدن میں نیست نابُود ہوئیں ۔ روُح عصر کی ایک جیتی جاگتی تصویر نہیں تو اور کیا ہے جب ذولچو اپنی سفا کانہ سیاکاریوں اور تباہ کاریوں سے کشمیر کے نہتے عوام پر بے انتہا مظالم ڈھا چکا تھا۔

ڈمی ڈیٹھم ندٕ ہہ وٕنی ڈمی ڈیوٹھم سُم نتہٕ تار
ڈمی ڈیٹھم تھٔر پھولہٕ وٕنی ڈمی ڈیوٹھم گُل نتہٕ خار

یا اُسکا اپنے اصلی اور ابدی مسکن کی جانب مراجعت کا جذبہ بھی موضوعی حقائق

[1] اقبال کا شعر یوں ہے ۔ زشعر دلکش اقبال می تواں دریافت کہ درس فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

کا معروضی اظہار ہے۔

آمہٕ پنہٕ سرِ سُدرس ناوِ چھس لمان
کتہٕ بوزِ دے میون میٚتہٕ دِیہ تار
اَمین ٹاکین پوٚنی زن شمان
زُو چھم بڑمان گرٕ گوژھ ہا

ہر بڑا شاعر صاحب بصیرت بھی ہوتا ہے اور پیش بین بھی، جسکا مطلب یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں بڑی شاعری اپنے وقت سے بہت آگے ہوتی ہے، بُعدِ زمانی ومکانی کے ساتھ ساتھ اُسکی ماہیت وافادیت بھی اور زیادہ نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ شیکسپیر نے پلیوٹارچ کے یونانی تاریخ مواخذ کو اپنی بے پناہ اختراعی قوتوں کو بروئے کار لاکر ابدیت ولافانیت عطا کی، انسانکی بشری و فطری کوتاہیوں کے بارے میں سوچتے ہوئے ندامت تو ہوتی ہے لیکن ایک بے نام عظمت وبرتری کا احساس بھی کروٹیں لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے مایہ ناز شاعر کلہن نے تاریخ کو سدابہار ابدی شاعری کا رُوپ دیا۔

وہ اس لئے ممکن ہوا کلہن نے اپنی فطری خلاقیت سے بہت بڑا کام لیا، دیومالائی ورثہ کو خوب برتا اور ہمارے خزینہ تخیل کے لئے بہت حد تک تشفی کا سامان بہم کیا، بڑی شاعری کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ اس میں تجربے کی انفرادی اساس کے باوصف آفاقیت، گیرائی، گہرائی اور ہمہ گیریت کا عنصر غالب ہو یہی وہ حقیقت ہے جسکی بنا پر عبدالاحد آزاد کو لل دید کا کلام کشمیری شاعری کا اولین باب ہونے کے باوجود آخری باب قرار دینا پڑا، وہ اس لئے کہ اسمیں بڑی شاعری کی عظیم تخلیقی قوتیں موجزن ہیں، یہ بحرِ عرفان کی وہ طوفان انگیز لیکن سکوت بدوش موجیں ہیں جن پر ارض وقمر کی طبعیاتی قلبِ

ماہیت کا اثر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے، کہ بقولِ اقبال لل دید نے فلسفۂ شیومت کو مشعل راہ بناتے ہوئے بھی راہِ عشق کی صحرانوردی کی ۔

کہ درس فلسفہ می دادو عاشقی ورزید

زندگی بھی سیدھی ڈگر پر نہیں چلی ہے۔ مُتضاد و مخالِف قوتیں ہمیشہ برسرِ پیکار رہی ہیں تا کہ ایک مثبت اور روشن تر حقیقت آشکار ہو جائے، معاف کیجیے مجھے یہاں جدلیاتی فلسفہ بھگارنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ یہ امر تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ شاعری، فن یا ادب تخلیق کار کی مدنی ونجی زندگی کا بھرپور پرتو تو نہیں کم سے کم عکس تو ضرور ہوتا ہے، اعتقاد والحاد ایک صداقت کے دو رُخ ہیں، اگر ایسا نہیں ہوتا تو یزدان واہرمن کا تصور ہی نہ ہوتا۔ عزازیلؑ، جبرائیلؑ، رُوح القدس اور الوہیت کو اعتقادی علامتیت حاصل نہ ہوتی۔ ہاروت و ماروت نے آدم خاکی کو نیچا دکھانے کی پاداش میں ندامت اُٹھائی۔ لل دید کی ناہموار نجی، زندگی اُسکے تخلیقی سوتوں کو جگانے کا موجب بنی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ لل دید قنوطیت ویاسیت کا شکار ہوتی لیکن اُسے شیومت کا شِو شکتی کا تصور در دِل کا مداوا دکھائی دیا، جو صنفِ نازک ہونے کے ناتے اُس کی آشفتہ طبعیت سے مطابقت رکھتا تھا، اسی کے نتیجہ میں کشمیری شاعری کو عرفان و وجود آگہی کے انمول موتی نصیب ہوئے۔ اس کے برعکس لل دید کے جواں تر ہم عصر، حضرت شیخ نورالدینؒ کے شلوکوں میں موت کا تصور بہت ہی گھناونا ہے، جسکی تہذیبی، تاریخی اور سماجی توجیہہ ممکن نہیں۔ جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ایک ہی تاریخی صداقت دو عظیم تخلیق کاروں اور قد آور سماجی شخصیتوں پر یکساں طور نہیں پڑسکتے۔ لل دید سے منسوب یہ قول کہ ”مینڈھا مرے یا بھیڑ ذبح ہو لل کا مقدر بٹا ہی ہوگا“، ”ہۆنڈ مارِی تن یا کٹھ، للہِ نلہٕ وٹھ ژلہِ نہٕ زاہ“ آج بھی اپنی سماجی معنویت

برقرار رکھے ہوئے ہے، بالخصوص جب آئے دن اُٹھتی جوانیوں کو رسُوم وقیُود کی قربانگاہ پر موت کے گھاٹ اُتارا جاتا ہے اور قانون، انصاف واخلاق کے دعویدار رسمی ہمدردی سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ بھرتری ہری سے علامہ اقبال کا یہ خیال کہ ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پہ کلامِ نرم ونازک بے اثر

بہت پہلے اپنی مدنی وسماجی اساس کے ساتھ لل دید کے کلام میں جگہ پا چکا ہے۔ جب وہ کہتی ہے کہ میں بادلوں کے ماخذ سے واقف، ساگر کا پانی آسانی سے ڈھو سکتی تھی، جسمانی طور معذور و مریض کا علاج بھی کر سکتی لیکن مورکھ کو بات سمجھا نہ سکی ؎

| | |
|---|---|
| سٔدرس زلنہٕ کڈِتھ اَتھ | ژِھنس اۆ برس زایِٕن زانہ ہا |
| مۆڈس زانٕم نہٕ پرٛنتھ کتھ | منٛدِس، رۆگیس ویدٕت زانہٕ ہا |

فطرت کی ستم ظریفی ہر عہد میں موضوعِ بحث رہی ہے۔ احمقوں کی بالادستی اور عاقلوں کی زیردستی کے پیشِ نظر ہی شاید سعدی شیرازیؒ کو کہنا پڑا۔ ''سنگ رابستند وسگاں آزاد''۔ حافظ کا ایک اور مشہور شعر ہے ؎

اسپ تازی شدہ مجرُوح بہ زیرِ پالاں

طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

لل دید بھی ایک دانشمند وزیرک کو بھوکوں مرتے اور ایک نااہل واحمق کو عیش وتنعم میں مست زیردستوں پر ظلم ڈھاتے ہوئے دیکھکر اس دنیائے دوں کے بندھنوں سے نجات چاہتی ہے ؎

| | |
|---|---|
| پن زن ہران پوہنہٕ واولہ | گاٹلاہ اکھ وچھم بوچھہٕ ستی مراں |
| تنہٕ لل بو پرٛاران ژھنیم ناپراہ | نیٚش بوٚد اکھ وچھم وازَس ماراں |

انتشار میں تنظیم کا متلاشی ہونا بنی نوع انسان کا مقدر رہا ہے۔ لل دید کے کلام کی مجموعی اساس عرفانی ہی سہی لیکن انسانی سماج کو ایک ہی رشتہ میں پرونے خواب بھی متشکل ہوتا دکھائی نہیں دیتا جب آپسی رشتہ منقطع ہونے سے سبھی ادھر اُدھر بھٹک جاتے ہیں۔

کیا کرٕ پانٛژن دہن تہٕ کہن | یم یتھ لیٚجہِ وو کھُشن گرتھ گییے
سأری ہے سمہٕ ہن اُکرِ ہے رزٕ لمہٕ ہن | اِدٕ کیازِ راوِ ہے کہن گاو

حرص وہوس تمام مصائب کی جڑ ہے، اس لئے قناعت واعتدال پسندی کو خوشحال انسانی سماج کے لئے کلیدی حیثیت دی گئی، سعدی شیرازیؔ اس بات کی طرف یوں اشارہ کرچکے ہیں۔

کم خورد کم خواب وکم گفتار باش
گردِ خود گردندۂ پرکار باش

لل دید کا ارشاد ہے کہ جس لباس سے تمہارا جسم سردی سے محفوظ رہے، وہی زیب تن کرا اور بھوک مٹانے کے لئے کھانا کھا۔ ایسے ہی عرفان نفس ممکن ہے، کیونکہ نفس پرستی سے غرور وتکبر میں اضافہ ہوگا۔ نہ کھانے سے بھی ایسا ہی نتیجہ حاصل ہوگا۔ اعتدال میں رہنے سے عالمِ الوہیت کے دروازے کُھل جائینگے۔

یوٚ ترٕ ژلی تم امبر ہیٚتا | بوچھِ یوٚ ژلی تم آہار ان
ژِتا سوٚپرٕ وچارس پیٚتا | ژِتا دیہس وان کیا ون

☆

کھبنہٕ کھبنہٕ کران گُن نو واتکھ | نہ کھبنہٕ گژھکھ اہنکأری
سوٚمُے کھےٚ مالہِ سوٚمے آسکھ | سمہِ کھبنہٕ مُورنے برنبن تأری

تکنیکی اور سائینسی لحاظ سے انتہائی ترقی کے باوجود آج بھی فرقہ

پرستی، نسل پرستی، جارحانہ وطن پرستی وقوم پرستی، توسیع پسندی وہوس پرستی کی صدیوں پرانی مصلحت پسندانہ برائیاں روپ بدل بدل کر بقائے انسانی کی خاطر سب سے بڑا خطرہ ہیں، اس لئے آج بھی مذہبی رواداری اخوت و برادری بقائے باہم، صلح وآشتی امن پسندی، عدم تشدد ومساوات جیسی ابدی قدریں نوع انسانی کیلئے مشعل راہ کا کام دے سکتی ہیں تا کہ انسانی سماج کا شیرازہ برقرار رہ سکے۔ شرط یہ ہے کہ ارباب حل وعقد اور سماجی لحاظ سے ارفع واعلیٰ مقام رکھنے والے دعویداروں کے قول وفعل میں کوئی فرق نہ ہو اور ظاہر و باطن میں ایک پائدار مثبت یگانگی کارفرما ہو۔ موجودہ دور کی ہمہ گیر ترقی اور زوال وضعفِ اعتقاد وجیسے تصورات کو تقویت دینے کے سلسلے میں کہا جاتا ہے، کہ کوئی بھی قدر مطلق نہیں اور ہر صداقت تغیر پذیر اور اضافی ہے۔ جس کے پیش نظر ابدی قدروں کی باتیں کرنا اور اُن کا دامن تھامے بیٹھا کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن عملی دنیا ان منفی رجحانات کی نفی کرتی ہے کیونکہ انتہائی تکنیکی ارتقاء کے باوصف انسان کے بنیادی مادی اور روحانی تقاضے تغیّرِ مسلسل کے باوجود کسی نہ کسی صورت میں قائم رہتے ہیں۔ انا رکی ایک حساس فرد کائنات کی بہتر اکائی ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی سماج کی بھی اہم اکائی ہے۔ جس میں وہ انارکی یا نراجیت کے بل بوتے پر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتا، اس لئے آج بھی ان (ابدی قدروں) سے منہ موڑنا حقائق سے منافی ہے۔ اور للہ دید اگر رسمی، پوجا، ذات پات دوئی اور قول وفعل میں تضاد کے خلاف آواز اُٹھائے دکھائی دیتی ہے تو بجا ہے۔ ان جیسے واکوں میں سماجی تاریخی اور مدنی افادیت آج بھی ایسی ہی ہے جیسی عہد تخلیق میں تھی۔

واکھ مانس، کول اکول تا آتے ژھوپہ مُدرِ اَتہِ تا پرویش
شِو چھے تھلہِ تھلہِ روزان موزان ہیوندتہ مسلمان

بُتھِ کیا جان چُھکھ وونڈ چھکھ گنی اصلچ کتھ زاہ سُنی نو
پران پران وُتھ اؤنگج گجی أندرم دُے زاہ ژجی نو

رہی فریب شکستگی، ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ انفرادی سطح سے لیکر سماجی اخلاقی اور عالمی سطح پر یہ سلسلہ قدیم زمانہ سے جاری ہے ۔ اور شاید زیادہ شدت کے ساتھ آئندہ بھی جاری رہیگا ۔ میر تقی میر کا یہ شعر اسی حقیقت کی طرف نہایت ہی بلیغ پیرایہ میں اشارہ کرتا رہیگا ۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ادب وشاعری تاریخ کے مقابلہ میں زندگی سے زیادہ قریب ہے ۔ کیونکہ تاریخ حکمران طبقہ سے وابستہ واقعات کی کھتونی ہونے کی بناء پر زندگی کی یک رخی حقیقت ہے جبکہ ادب وشاعری بالواسطہ اور بلا واسطہ زندگی کی بوقلمونی کی فنکارانہ تصویر ہوتی ہے ۔ شاعری وادب کی سرحدیں وہاں سے شروع ہوتی ہیں جہاں سے سائنس کے قدم ڈگمگاتے ہیں ۔ اس لئے ہمارے دورِ جدید میں بھی شاعری وادب یا فن لطیف کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ سوال کیا جاسکتا ہے کہ شاعری وادب کی یہ کوئی ذمہ داری نہیں کہ کاروانِ حیات تازہ دم ہوکر آگے بڑھتا رہے ۔ یہ انسان کی داخلی اور جبلی ضرورت ہے کہ وہ اُکتانے اور تھک جانے پر ستائے اور پھر آگے بڑھے ۔ زندگی ایک ابتلائے مسلسل ہے جہاں ہر وقت نظریں بکھرنے کا احتمال ہوتا ہے اور قوائے انسانی کے اضمحلال کا امکان بھی ۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ جذبہ تخلیق سے کام لیکر انسان تسخیر فطرت کے معرکے سر کرتا آیا ہے، شاعری وادب اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے ایک مقدس تخلیقی احتجاج ہے، اُن فطری غیر فطری ، جبلی ، غیر جبلی اور سماجی رکاوٹوں کے

خلاف جو انفرادی آزادی اور شخصیت کے پورے نشو ونما میں حائل ہوتی ہیں، ایک فنکار انتہائی حساس ہونے کے ناتے اپنے بکھرے اور گم ہوتے وجود کو پانے کی سعی میں اپنے اندرون کو کھنگالنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے تاکہ وہ کما حقہ اپنے وجود کے قائم بالذات ہونے کا جواز پاسکے۔ یہ وہ نازک مرحلہ ہے جہاں ایک فنکار کے بھٹکنے کا خدشہ ہے اور ایک بڑا شاعر یا ادیب اپنی ذات کو پہچان لیتا ہے، یہ اسکی جبلی اور داخلی شدتِ خود آگہی وخود نمائی کا فطری جذبہ ہی ہوتا ہے، جو اُسے الفاظ سے تخلیقی معجزات کا کام لینے پر مجبور کرتا ہے اور اُسکے انفرادی تجربات میں وہ ہمہ گیریت اور گیرائی ہوئی ہے کہ سننے والا بلا جھجک پکار اُٹھے۔

دیکھنا وہ لذت تقریر جو اُس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لل دید کو بھی یقین تھا کہ عرفان کا لباس زیب تن کر کے جو کچھ بھی اُس نے کہا وہ قلب وجگر کا جزبنا۔

گیا ژلکھ اَمبر پرِتھ تتنے یم پدلِلہِ وٗنی تم ہر یدٗ اَنکھ

موجودہ دور تکنیکی لحاظ سے انتہائی پیچیدہ سماجی قدروں کو جنم دے چکا ہے۔ قدروں کی شکست و ریخت شدت اختیار کر چکی ہے۔ فریب شکستگی اتنی خیرہ کن ہے کہ سماجی آدرش اور روشن مستقبل کے خواب ٹوٹتے دیر نہیں لگتی۔ انسان فضائے بسیط پر اپنا تسلط جمانے کی تگ ودو میں ایک دوسرے سے سبقت لینے کی کوشش میں مگن ہے ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ بحر وبر انسان کے جارحانہ عزائم کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، سائینسی ٹیکنالوجی پر انسان کی گرفت مضبوط ہوتے ہوئے بھی ڈھیلی ہوتی جارہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ انسانی تہذیب روبہ زوال ہے، کوئی اِزم یا کوئی مت ہمارے دُکھوں کا ابدی مداوا دکھائی نہیں

دیتا۔ جارحانہ قوت آزمائی میں کمیونیزم اور سرمایہ داری میں کوئی حد فاصل نہیں۔ جہد البقاء کی اِس دوڑ میں عہد بربریت کے باسی اور آجکل کے ترقی یافتہ اِنسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ تیر و ترکش اور گند ہتھیاروں سے محدود سطح پر کام لیتا تھا اور یہ چشم زدن میں مہلک جنگی آلات سے ساری انسانی تہذیب کو تحس نحس کرسکتا ہے۔ ایسے میں اگر خاندان اور سماجی رشتے ٹوٹتے نظر آئیں تو کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ اس نفسا نفسی میں آج کا شاعر یا فنکار اپنی ''انا'' کی کینچلی میں سمٹ آیا ہے۔ لیکن یہاں بھی اُسے سکون میسر کہاں؟ اُسے بھی زندہ رہنے کے لئے عام آدمیوں کی طرح روزگار کی تلاش ہے۔ کیونکہ انسان کی بنیادی ضرورتیں جوں کی توں قائم ہیں اور وہ جوُں توُں کر کے گزراوقات کر رہا ہے۔ لیکن ایک شاعر یا ادیب کو انسان کی طرح صرف جسمانی طور مطمئن ہونے پر اکتفا نہیں کرسکتا۔ وہ نا آسودہ خیالی دنیاؤں کو آباد کرنا چاہتا ہے۔ وہ بت شکن بھی ہے اور بت گر بھی۔ وہ خدا کی بنائی ہوئی محیر العقول کائنات کو اور زیادہ حسین دیکھنا چاہتا ہے تاکہ اُس کے ذوقِ جمال کی بھی تشفی ہو اور سماج کا ایک محدُود سخن فہم زندگی کا صحیح ادراک رکھنے والا طبقہ بھی دو قدم اُس کے ساتھ چلے یا نا بھی چلے تو کوئی بات نہیں

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

نہ سہی میرے اشعار میں معنی نہ سہی

اپنے ذوق جمال کی نا آسودگی اور تشنہ گی مٹانے کا فطری جذبہ اُسے اپنے وقت کا ہوتے ہوئے بھی وقت سے بہت آگے کر دیتا ہے، وہ اپنے عہد کی شخصی، سماجی اور تہذیبی علامتوں یا دیو مالاؤں کو نئے معنی عطا کر کے وسیع تر کرتا ہے، ان باتوں کے پیش نظر جب ہم لل دید کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ للہ واک اپنی موضوعی اساس رکھنے کے باوصف معروضیت کا غالب عنصر لئے ہوئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ للہ واکوں میں داخلیت کا عنصر زیادہ نمایاں ہے، یہی وجہ ہے کہ لل دید ہر بڑے شاعر کی مانند آج بھی ہمارے بہت قریب ہے۔ کیونکہ وہ اپنے عہد کی بے پناہ حشر سامانیوں اور تباہیوں سے بے نیاز اپنے اندر کے بے نام وجوُد کا دامن تھامے رہی۔ وہ اپنے ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے کہ تو پرائے اور پرائے دھرم پر اپنی ذات کو بھول کر فریضہ کیوں ہوا، سراب پر تجھے سچ کا گمان ہو بیٹھا یہ شکستِ فریب نہیں تو اور کیا ہے۔

ہاژتا کوٗ چھُے لوٗ گُمت پرمس | کوٗ گوٗ ے اَپزس یزٕ یک برونت
دِشہِ بوٗ زوٗش کوٗ رنکھ پردھرمس | ینہٕ گرٕ ھنہٕ زہنہٕ مرنس کرونت

اس واک میں چودھویں صدی میں یہاں عام لوگوں کے مذہب اسلام اختیار کرنے کے خلاف ایک کھلی لیکن خاموش تنبیہ کروٹیں لیتی دکھائی دیتی ہے پھر بھی اسکی فنی صداقت آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔

آج کے انسان کی بے اطمینانی شدید و پیچیدہ ہے اور آج کا تخلیق کار بت شکنی تو کرتا ہے لیکن بت گری نہیں جانتا۔ اُسے ساری دنیا ویران، سنسان، صحرائے بسیط، اندھیرے میں گم اور دھکم پیل میں گم کردہ راہ دکھائی تو دیتی ہے۔ لیکن وہ سارے سماجی و ثقافتی ورثہ کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر مُنہ نہیں لگاتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ فن تخلیقی محل تعمیر نہیں کر پائے اور نا ہی اپنی ذات کو انتشار مسلسل سے بچا سکے ہیں۔ وہ لل دید کی زبانی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میرا وجوُد زیارت سے محروم بازار میں بے قفل دُکان کی مانند ہوا اور میری لکڑی کی کمان کو تیر نصیب نہیں ہوا۔ میری حالت ایسی ہوئی جیسے میرے وجوُد کی راجدھانی کی تعمیر کسی ناہنجار

بڑھی نے کی ہو۔

اَ بکھ چھان پیوم یتھ راز دانے
بچو ہا رنجہِ پیٚو لوکان گوم
ترتھ رۆس پان گوم کس مالہِ زانے
منز بازرس قلفہِ رڈس وان گوم

بارِ نبات کو اچھی طرح سے نہ باندھ پائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرا سرو قد خمیدہ ہوگیا۔ مرشد کا قول میرے لئے احساس گُم شدگی کی کسک سا ثابت ہوا کہ میرے وجوٗد کا ریوڑ بغیر نگہبان کے ہے۔ مجھ سے یہ سب کچھ کیسے سہا جا سکے۔ اس واک کی انفرادی تجربہ کی اساس محدوٗد ہی سہی لیکن اسکی تخلیقی پیکر تراشی آج بھی تازہ ہے۔

دیہہ کاڈ ہوٚل گوم ہکیہِ کہیٚو
نابدٕ ی بارس اَٹہِ گنڈ ڈیٚول گوم
پہلہِ رۆس کھیٚول گوم ہکیہِ کہیٚو
گورٕ سُندوِنن راون تیٚول پیوم

انسانی تہذیب کثرت میں وحدت ڈھونڈنے کی دعوت دیتی ہے۔ آج کی تمیزِ رنگ ونسل میں اُلجھی ہوئی دنیا کی خاطر لل دید کا یہ واک رواداری اور وحدت ادیان کی تعلیم دیتا ہے کہ حقیقت مطلق (شِو) کو تجھے علیٰحدہ علیٰحدہ رنگوں میں جب ہی پانا ہے۔ جب تو سب کچھ سہہ سکے تو تجھے آنند اور روحانی سکون ملیگا۔ غضب، رشک وحسد کا تو قلع قمع کرلے تو تجھے شِو کے درشن نصیب ہونگے۔ اگر یہ مان لیا جاتا کہ یہ ساری کائنات صفات ذاتِ کل کی مظہر ہے تو پھر انسانی سطح پر گوناگوں قسم کے بربریت و وحشت کے مظاہرے نہیں ہوتے۔

سورٕ ے ژالکھ برکھ سوکھ
رٕنگس منز چھے بیٚون بیٚون لبُن
اد ڈیشکھ شِوٕسُند موکھ
ژکھ، رٕش تہٕ وآرگالکھ

کہنے کو تو یہ کام آسان دکھائی دیتا ہے لیکن اس پر عمل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادِف ہے، کیونکہ آدمی کو انسان بننے کی بھی مہلت کہاں۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

اس یقین دز دعہد نو رو ظلمات میں اپنے وجود کے عناصر ترکیبی کو قابو میں رکھنا مٹھی میں آندھی باندھنے، چکش بام کو سمیٹنے کے مترادف ہے۔ جو ایسا کر سکے وہی قصرِ ظلمات میں نورِ خورشید سے اپنا دامن بھر سکتا ہے۔ لیکن کہاں وہ عالم خود فراموشی و خود سپردگی اور کہاں ہم! پھر بھی ؂

ششرس وتھ کس زٹے　　گس بو کے رٹے واو
یُس پانٔژھ یندریٚ ژیٖلتھ ژٹے　　سُے رٹے گٹے رو

لل دید کو یہ سب کچھ جب ہی نصیب ہوا جب اُس نے بارگاہ ایزدی میں قلب و جگر کو اُس کے رنگ میں رنگ کر اپنے دامنِ نیاز و انکسار کو پھیلائے ہی رکھا تا کہ وہ گلہائے عرفان چنتی ہی چلی جائے ؂

مل وُوندِ گولُم
جگر مؤرم
تیلہِ لل ناوِ دزام
یلہ ڈلی ترأ وی تس تیٔ

کہا جاتا ہے کہ ڈارون نے انسانی ارتقاء کے قانون کو دریافت کر کے ایک انقلاب عظیم برپا کیا۔ حضرت مولانا رومؒ (۶۰۴۔۶۷۲ھ) نے بہت پہلے ساتویں صدی ہجری میں اپنے اشعار میں حیاتِ انسانی کے ارتقائی قوانین کی جانب یوں واضح اشارے کئے ہیں ؂

آمدہ اول بہ اقلیم جماد　　وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد　　وز نباتی یاد ناوُرد از نبرد

وز نباتی چوں بہ حیوانی فتاد — نامدش حالِ نباتی ہیچ یاد
جُز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں — خاصہ در وقت بہارِ ضمیراں
ہمچو میل کود کاں با مادراں — سِرِّ میلِ خود ندا اند درلباں
باز از حیواں سُوِ انسانیش — میکشد آن خالقے کہ دانیش
ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنوں عاقل و دانا وزفت[1]

اسی طرح جب جدید سائینس نے فطرت و ماحول میں مضمر طاقت کے تغیُّر مسلسل کو دریافت کیا تو اُسے ( Trausformation of Energy ) کے قانون کا نام دیا گیا جس کے تحت ماحول میں مختلف فطری عناصر میں کمی بیشی نہیں ہوتی البتہ قلب ماہیت ہوتی رہتی ہے جس سے کائنات کا یہ نظام قائم ودائم ہے۔لل دید اس صداقت ابدی کو یوں بیان کرتی ہے کہ ہمیں تھے اور ہم ہی ہونگے۔ہمیں نے اگلے وقتوں سے معرکے سر کئے ہیں۔شو ( حقیقت کُل ) کے حیات ومَمات کا اٹوٹ صفاتی سلسلہ جاری رہیگا۔سورج کا سفر بھی تا ابد رُکنے والا نہیں ع بقا اک تغیر کو ہے زمانے میں

أسی أسی تہٕ أسی آسو — اَسی دور گری پتہٕ وتھ
شوس سورِنہٕ زیوّن تہٕ مرُن — روس سورنہٕ لتہٕ گتھ

یہ ممکن نہیں کہ لل دید جیسی عالی مرتبت شاعرانہ اور عارفانہ شخصیت کو بھرپور انداز سے عصر جدید کے تناظر میں جائزہ لیا جائے کیونکہ اُس کے شاعری لسانی بُعد تجربات کی انفرادی وفلسفیانہ اساس لئے اس کے اندرون میں جھانکتے وقت حائل ہوتی ہے۔یہ کیا کم ہے کہ اُسکا کلام آج بھی بلالحاظ مذہب وملت ہمارے دل کے نہاں خانوں کو منور کئے ہوئے ہے۔عظیم شاعری قید زمانی ومکانی سے

[1] مثنوی مولانائے روم دفتر اوّل: مقدمہ: مولانا قاضی سجاد حسین مترجم: ص: ۲۲-۲۱: ۱۹۷۴ء:

ماوراء ہے۔ اسی تناظر میں میرا یہ مختصر جائزہ شاید کچھ گرہیں کھولنے کی طرف مبہم ہی سہی اشارہ کر سکے۔ کشمیری شاعری ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے لل دید کے اوّلین اعلیٰ شعری سرمائے کو فراموش نہیں کر سکتی۔ خصوصاً جب ابھی اُس کے قد و قامت کا دوسرا شاعر پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ اس بات کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے کہ کٹر برہمن فلسفہ کشمیر شیوازم کے انقلاب آفرین اور منفرد پیغام کو عام لوگوں تک پہنچانے میں حائل ہی ہوتا اگر لل دید اُسے فکر انگیز و اثر آفرین شعری پیکروں کا رُوپ دیکر قبولِ عام عطا نہ کرتی۔ یہ الگ سوال ہے اُس پر کوئی صحیح معنوں میں عمل پیرا ہو یا نہ ہو لیکن اُسے اپنی جگہ ابدی مسرت کا بجا طور احساس ہے کہ ؎

فاش می گویم واز گفتۂ خود دِل شادم
بندہ عشقم واز ہر دوجہاں آزادم

☆☆☆

# حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین ولیؒ

## شخص وفن!

### منظر - پس منظر

کشمیر کی تمدن ساز شخصیات میں حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ عرف نُندریشیؒ کا نام سرفہرست ہے، ان کو بجا طور کشمیری تہذیب اور زبان ادب کے معماروں میں کلیدی حیثیت حاصل ہے ۔ وہ یہاں کے منفرد مشترک اور امتزاجی کلچر کے امین بھی ہیں اور ترجمان و پاسبان بھی ۔ یہ انکی ضیابار شخصیت کا اعجاز ہی تو ہے کہ اُن کا کلام چھ صدیوں تک سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا۔ اس طرح نہ صرف کشمیری شعروادب کے خدوخال محفوظ رہے بلکہ کشمیر کے امتزاجی کلچر کو بھی ایک حیات آفرین جہت ملی ۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی معرکتہ الآرا مثنوی کو اگر فارسی میں قرآن سے تعبیر کیا گیا ہے تو علمدار کشمیرؒ کے شرُک (شلوک) کو کشمیری زبان میں قرآن (کاشُر قرآن) کہا گیا ہے اور اُنہیں ''کاشُر واعظ'' (کشمیری واعظ) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ حُسن اتفاق دیکھئے لل دید (چودھویں صدی) کے واکھ (واکیہ) کشمیری شیومت کے منفرد مکتبۂ فکر کے ترجمان ہیں۔ وہاں بھی اہنسا، رواداری، رنگ ونسل، دھرم اور ذات

پات سے برتر انسانی اخوت ووحدت پر مبنی ،عرفان وآگہی کی ضیاء باریاں ہوئیں اور یہاں بھی اسلام کے نظریہ اخوت ووحدتِ انسانیت کے مینار روشن ہوئے۔ لل دید کے واکوں میں عقیدہ توحید کو رسوم وقیود سے چھٹکارا ملا۔ بقول غالب ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوٗم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایمان ہوگئیں

لل دید نے شِو کو ہر روٗپ میں دیکھا اور ہر صورت میں تلاش کیا اور پایا بھی۔ مہرِ درخشاں کی طرح تابندہ پائندہ، ہندو میں بھی اور مسلمان میں بھی ؎

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

شِو چھُے تھلہِ تھلہِ روزان موزان ہیٚو ندٕ تہٕ مسلمان
ترُکئے چھکھ پئن پان پرزان سوے چھےٚ صاحبس زٲنی زان

ترجمہ: شو تو تمہاری نظروں کے سامنے مہر درخشان کی طرح ہے، ہندو، مسلمان ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں، تیری دانشمندی کی کسوٹی یہی ہے تو اپنے جسم وجاں کو مالِک حقیقی کی امانت سمجھ۔ یہی قادر مطلق کی بارگاہ میں باریابی کی سیڑھی ہے۔

روایت ہے کہ حضرت شیخ نے اپنی ولادت باسعادت کے موقعہ پر اپنی ماں کی چھاتی سے دودھ نہیں پیا۔ انکو بڑی تشویش ہوئی۔ لل دید کا گزر اُن کی جائے ولادت کیموہ سے ہوا، جنہوں نے ننھے شیخ کو اپنی چھاتی سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''پیو بابا پیو'' جنم لینے سے جب تو نہیں شرمایا تو دودھ پینے سے کیوں

---

شیرازہ: جلد۔۳۴: شمارہ ۳ ۱۹۹۵ مطبوعہ: کلچرل اکیڈیمی۔ ایڈیٹر: محمد احمد اندرابی: ص۔۲۵۔۵

کتراتا ہے۔ ''روایت کے مطابق ننھے رشی نے چھاتیوں کو منہ لگایا ہی تھا کہ لل دید کی چھاتیوں میں دودھ کا امرت بھر آیا۔ عبدالوہاب شائق نے اس واقعہ کو شعری قالب میں یوں ڈھایا ہے۔

به طفلی زشیخ آمده کارِ پیر زپستان مادر، نه، نوشید شیر
به انگشت شیرش بداداے شگفت للہ عارفہ درکنارش گرفت
لبن درگلویش ازان آمده دوانگشت بی بی دو پستان شده

اسطرح عرفان و آگہی کا سلسلہ لل دید سے حضرت شیخ العالمؒ سے پیوست ہوگیا جسکا اعتراف انہوں نے بعد میں، لل دید کو اوتار مان کر کیا اور دعا کی کہ انہیں بھی ایسی ہی عنایت سے نوازا جائے۔

تس پدٕ مانپور چہ للے تمہ گلے امرت پؠ
سو سائٕن اوتار ہٕ للّی تِتھے مےٚ ور دِتو دِؠ

اساسی نظریات میں اختلاف و بعد زمانی و مکانی کے باوجود تہذیبی یگانگت کے سرچشمے لل دید اور حضرت شیخؒ، دونوں کے یہاں پھوٹے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے ہندو اور مسلمان کشمیری تہذیب و ادب کے ان معماروں کو لل دید، للہ عارفہ اور نندریشی کے مشترک ناموں سے آج بھی یاد کرتے ہیں۔ ان کا کلام کشمیری عوام اور عرفان و آگہی کے شیدائیوں نے عقیدت مندیوں کے دھندلکوں سے اتنا خلط ملط کیا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہی ہو جاتا ہے کہ کون سا کلام روشنی کے کس مینار کا پرتو ہے۔ بایں ہمہ یہ کشمیری زبان و ادب کی نیک بختی ہے کہ اس کی گود میں اس کے اتنے عظیم معمار اور عرفانِ الٰہی کے روشن مینار پروان چڑھے اور اسے ابدی روحانی مسرتوں سے سرفراز کیا۔ یہ انہی الوہی اور عارفانہ شخصیات کا فیضان ہے کہ زمانے کی گوناگوں کج ادائیوں کے باوجود

کشمیری زبان سخت جان ثابت ہو کر پھلی پھولی۔

لل دید حضرت شیخ کے لئے کشمیری تہذیب وتمدن کے حوالہ سے ایک واضح سماجی ، روایتی ، لسانی اور روحانی پس منظر کی حیثیت رکھتی تھی ۔ اللہ ہر برگزیدہ شخصیت کو ایک عظیم کام کے لئے خلق کرتا ہے۔ حضرت شیخؒ سے اسلام کے حیات آفریں پیغام کا اشاعت کی اعلیٰ مقصد، حاصل کرنا مطلوب تھا جو انہوں نے اپنی عارفانہ شعری کاوشوں سے بحسن وخوبی انجام کو پہنچایا۔ اس کیلئے پہلے ہی یہاں ایک خوشگوار اور موافق مذہبی وتبلیغی ماحول موجود تھا۔ اسلام حضرت عبدالرحمن شرف الدین بُلبلؒ کے ہاتھوں تبّتی شہزادہ رنگچن (رینچن) صدرالدین کے نام سے ۱۳۲۰ء میں مشرف بہ اسلام ہونے سے ان کی ولادت باسعادت ۷۷۹ھ (۱۳۷۸ء) تک کشمیر میں اپنے قدم جما چکا تھا۔ یوں تو وسط ایشیا سے اسلامی مبلغین کی کشمیر میں آمد کا سلسلہ صدیوں پہلے سے جاری تھا۔ جب ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے راجہ داہر کا تختہ اُلٹ کر فتح سندھ کا کارنامہ انجام دیا تھا۔ راجہ داہر کا بیٹا جے سیا کشمیر کے راجہ سے قرابت داری کی بنا پر یہاں پناہ لینے آیا۔ محمد بن قاسم نے اس کا پیچھا کیا۔ لیکن کشمیر کے محیط فلک بوس پہاڑوں کی سر بلند چوٹیوں نے ان کا راستہ روکا۔ شامی نژاد مسلمان حمیم بن سام یہاں آنے میں کامیاب ہوا اور اس نے یہاں تبلیغ اسلام کی شروعات کیں۔ اسلئے ایک ممتاز کشمیر شناس، یورپی عالم اور راج ترنگنی کے فاضل مرتب سر ارل سٹائن کا یہ مشاہدہ صداقت پر مبنی ہے کہ ’’ اسلام کشمیر میں زور زبردستی سے نہیں بلکہ مرحلہ وار تبلیغ سے آیا‘‘۔

کشمیر میں حضرت شیخ سے پہلے جہاں للتادتیہ اور اونتی ورمن جیسے عادل رعایا پرور اور اعلیٰ ذوق کے باصلاحیت بادشاہ ہمارے لئے محل افتخار ہیں وہاں

ہرش دیو جیسے کئی راجاؤں کے سفاک و بہیمانہ طرزِ نظام اور طرزِ زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے احساس ندامت ہوتا ہے۔ چنانچہ آج بھی ''ہرشہِ دیو'' کا لفظ خلافِ عقل و معمول کے معنوں میں کشمیری روزمرہ میں استعمال ہوتا ہے انہی جیسے سماجی اور ناساز سیاسی حالات میں یہاں کے برہمن اپنے آپکو برہمن ذات سے منسوب کرنا گناہ تصور کرتے تھے۔ اگر کوئی کسر باقی رہی تھی تو وہ ۱۳۲۰ء میں ذولچو نے پوری کر دی۔ ذولچو جو ہلاکو اور چنگیز کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، منگول بادشاہوں کی کشمیر فتح کرنے کی آرزو پوری کرنے کیلئے پکھلی (بارہ مولہ) کے راستے سے ستر ہزار منگول اور ترک فوج کی معیت میں کشمیر پر دھاوا بول دیتا ہے۔ سرحد غیر محفوظ ہونیکی وجہ سے اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہ ہوا۔ وہ آگے ہی بڑھتا گیا۔ راجہ سہدیو اُسے زرِ کثیر دے کر واپس کرانے میں ناکام ہوا۔ غلط طریقہ پر دشمن کا مقابلہ کرنے کے بہانے اس نے لوگوں پر مختلف قسم کے بے جا ٹیکس عاید کئے۔ یہاں تک کہ برہمن بھی اس کے ظلم وستم کا شکار ہوئے۔ منگول لشکر مار دھاڑ اور قتل و غارت کا بازار گرم کرتی گئی۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔ تباہی اس حد تک پہنچی کہ راجہ سہدیو سر چھپانے کے لئے کشتواڑ بھاگ نکلا۔ بدنظمی اور بداخلاقی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔ کہ راجہ اپنی جان بچانے کیلئے گدی چھوڑ کر چلا جائے اور رعایا کو اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ جائے۔ ذولچو کی سفاکی اور بربریت آٹھ ماہ تک جاری رہی۔ آخر کار فطرت کرم پر آئی اور ساری منگول فوج برنل (پرگنہ دیوسر) سے واپس جاتے ہوئے برفانی طوفان کی لپیٹ میں آکر ذولچو سمیت فنا ہوئی۔ حضرت شیخؒ کے آباواجداد میں سے اوگردیو کا پوتا اس دوران جان بحق ہوا۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ذولچو مسلمان تھا[1]۔ گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل ہی سے

---

[1] کشمیر انڈر سُلطانز (Kashmir uder Sul tan,s Mohibul Hussain) صفحہ ۳۴ تا ۳۶

ہندو عہد رو بہ زوال ہوتا ہے۔ راجہ اپنی رعایا کو بھول جاتے ہیں نفس پرستی اور ہوس رانی کے حاوی ماحول میں محمود غزنوی کشمیر پر دوبارہ حملہ کرتا ہے۔ اُسے پونچھ اور سورن کوٹ کے درمیان لہر کوٹ کے مقام پر دونوں بار شکست ہوئی جسمیں قدرت کی گوناگوں نیرنگیوں کا بھی ہاتھ تھا۔ منگول تباہی کے بعد بے بس کشمیری پہاڑوں کی چوٹیوں سے اپنی بستیوں کی طرف لوٹے۔ ہر طرف بدنظمی کا دور دورہ تھا جس کا فائدہ اٹھا کر تبتی راجہ کا بیٹا رنگچن (رینچن) بڑی ہوشیاری سے کشمیر کے راجہ رام چندرا کو اپنے لداخی حواریوں کی مدد سے قتل کر کے گدی پر براجمان ہوتا ہے۔ رنگچن کا باپ بلتیوں اور لداخیوں (تبتیوں) کے تصادم میں مارا گیا تھا اور وہ کشمیر بھاگ کر پرگنہ لار میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ رام چندرا نے نظم ونسق کا قیام اُسی کے سپرد کیا تھا۔ اپنی صلاحیتوں کی بناء پر وہ اپنی ساکھ قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ جس کا بہترین فائدہ اس نے بھیمانہ منگول حملہ کر بعد اٹھایا۔

راجہ سہدیو ذولچو کے نیست و نابود ہونے کے بعد، کشتواڑ سے کشمیر پھر گدی حاصل کرنے کے لئے آیا۔ لیکن اُسے ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ رینچن کو اب لازماً عقیدہ کی تلاش تھی تاکہ وہ سکون قلب کے ساتھ ساتھ حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر سکے۔ زوال آمادہ بدھ مت کا وہ پیرو رہ چکا تھا۔ ہندومت، ذات پات اور برہمنوں کے سخت گیر رویہ کی وجہ سے اُسے قابل قبول نہیں تھا حضرت شرف الدین بُلبلؒ اس کے دور کا مداوا ثابت ہوئے اور وہ اُن کے باسعادت ہاتھوں صدر الدین کے نام سے حلقۂ اسلام میں آیا۔ سید شرف الدین بُلبل شاہ نعمت اللہ کے خلیفہ اور سلسلہ سہروردی کے صوفی تھے۔ وہ ایک ہزار پیرکاروں کی رہنمائی کرتے ہوئے سہدیو کے عہد میں چنگیزی چیرہ دستیوں

کے دوران وارِدِ کشمیر ہوئے۔ سب سے پہلے جو لوگ قبولیت اسلام کا شرف حاصل کر چکے وہ بودھ اور ادنیٰ ذات سے تعلق رکھنے والے برہمن تھے ریٓنچن نے بلبل شاہؒ کے نام سے ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور اُسی کے نام سے سرکاری اخراجات سے ایک لنگر بھی جاری کیا۔ اس خانقاہ کو تا ہنوز تحقیق کے مطابق اولین مسجد کی حیثیت حاصل ہے۔ لنگر عہد چغتائیہ تک جاری رہا۔ ریٓنچن (سلطان صدرالدین) کا حیدر نام کا ایک نابالغ بیٹا تھا۔ کوٹہ رانی نے شاہ میر کے مشورے سے سہدیٓو کے بھائی اُدیان دیو کو سوات سے بلا کر اس سے شادی رچائی اور اسے گدی پر بٹھایا۔ جونہی وہ تخت پر بیٹھا تو ترک حملہ آور پھر نمودار ہوئے۔ اُدیآن دیو اپنے بھائی کے برعکس (جو کشتواڑ بھاگا تھا) لداخ کی طرف بھاگ نکلا۔ کوٹہ رانیٓ نے اُن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اُنہیں پسپا کر کے اقتدار کو مضبوط کرنے لگی۔ ۱۳۳۹ء میں اُدیان دیو کی وفات پر اُس نے اپنے دو بیٹوں کو نظر انداز کر کے خود تخت سنبھالا ہی تھا کہ شاہ میٓر اُس کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔

سلطان شمٓس الدین شاہ میر کی شخصیت تاریخی دُھندلکوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ کئی مؤرخوں کا کہنا ہے کہ وہ پانڈوں کی اولاد میں سے تھا[۱]۔ جونرآج اس کے بارے میں خاموش ہے۔ بہارستان شاہی کا مصنف اور مؤرخ حسٓن اس کا رشتہ سوات کے حکمرانوں سے جوڑتے ہیں حُسن تدبر اور کارناموں کے جائزے سے شاہ میر کے ترک نژاد ہونے پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ وہ وقور شاہ کا پوتا تھا اور ان کے والد کا نام طاہر تھا۔ وقور شاہ بڑا مذہبی اور پارسا آدمی تھا۔ جونرآج نے اس کا

---

۱؎ طبقات اکبری: نظام الدین۔ تاریخ فرشتہ

نام غلطی سے قورشاہ درج کیا ہے۔ شاہ میر اپنے قبیلے کے ساتھ ۱۳۱۳ء میں قسمت آزمائی کیلئے سہدیو کے دورِ حکومت میں وارد کشمیر ہوا جس نے اسے ملازمت میں رکھنے کے علاوہ بارہ مولہ میں کسی جگہ جاگیر بھی عطا کی۔ اُدیان دیو کے عہد حکومت میں اُس نے کشمیر کو ایک اور ترک حملہ سے بچالیا۔ ۱۳۳۸ء میں جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جاچکا ہے کہ اُدیان دیو کی وفات پر کوٹا رانی نے خود تخت و تاج سنبھالا اور بھٹا بھکشنا کو اپنا وزیر اعظم بنایا تاکہ شاہ میر کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت کی مدافعت کا سامان کیا جاسکے۔ اس نے سرینگر سے اندر کوٹ کو دارالخلافہ منتقل کیا۔ شاہ بھکشنا کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہونے کے بعد کوٹا رانی کی طرف متوجہ ہوا اور اسے اپنی زوجیت میں لینے کی پیش کش کی کوٹا رانی نے مسترد کردی جس پر شاہ میر نے اندر کوٹ پر فوج کشی کی۔ کوٹا رانی ناکام ہوئی۔ شاہ میر نے کہنے کو تو اُس سے شادی کرلی لیکن اُس کے شکوک نہ مٹ سکے۔ اُس نے کوٹا رانی کو دونوں بیٹوں سمیت قید کرلیا۔ جہاں وہ ۱۳۳۹ء میں چل بسی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوٹا رانی نے شاہ میر کی قربت میں آنے سے پیشتر ہی اپنے پیٹ میں چھرا گھونپ کر خودکشی کرلی[1]۔

اس طرح شاہ میری عہد کی شروعات ۱۳۳۹ء سے ہوتی ہیں۔ شاہمیری سلاطین کی حکومت تقریباً دو سو سال تک قائم رہی۔ اس دور کے بادشاہوں میں بہمہ وجوہ ممتاز درجہ رکھنے والا بادشاہ سلطان زین العابدین ''بڈشاہ'' ہے جس کے عہدِ حکومت میں علم و ادب، صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدن غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ کے فروغ و ارتقاء کی طرف توجہ دی گئی[2]۔ یہی وجہ

---

[1] تاریخ حسن [2] مقتدر خلفاء کے علاوہ حضرت شیخ العالمؒ کے نمائندہ معاصرین میں زین العابدین بڈشاہ، بہاؤ الدین گنج بخشؒ، بھٹ اوتار، حسرت کھوکھر، جوان راج، حاجی ابراہیم ادہم، سلطان سکندر، سلطان علی شاہ، سید حسین منطقیؒ، سید عالی بلخی، سید محمد مدنیؒ، شری بھٹ، شری کنٹھ، ملا احمد، ملا پارسا، ملک سیف الدین (سہہ بٹ) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں

ہے کہ اس عادل، وسیع القلب، وسیع النظر، علم وادب کے شیدائی اور رعایا پرور سلطان کی حکومت پچاس سال تک یعنی ۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء تک برقرار رہی۔ فارسی کو چونکہ سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا اس لئے اس کا استعمال روز بروز بڑھتا گیا اور کشمیری زبان کے روزمرہ کے ذخیرہ الفاظ میں بالواسطہ اور بلاواسطہ بہت حد تک اضافہ ہوا۔ قطع نظر اس کے کہ خط نسخ و نستعلیق کشمیری زبان کے لسانی اور صوتی مزاج کے موافق تھا یا نہیں۔ ہم فطرت کے غیر مرئی سخت گیر قوانین کے سہارے ہی زندہ رہتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہماری مادری زبان لل دید اور حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ کی باطنی، وجدانی اور روحانی کیفیات کا آئینہ بن کر رہی اور ہم بھی ایک قومی اکائی کی حیثیت سے سخت جانی کے ادوار سے گزرتے رہے۔ یہ صبر آزما اور دقت طلب سلسلہ آج بھی جاری ہے یہ ہمارا صدیوں پرانا اجتماعی اور سماجی لاشعور ہی ہے جو لل دید کے بعد حضرت شیخ نورالدین رشیؒ کی ذات با برکات کی صورت میں ہمارے ورد کا مداوا بنی۔ یہی وہ نورانی پیکر ہے جس نے ہمارے دل کے نہاں خانوں کے منور کرکے ہمیں حق وصداقت، زہد تقویٰ اور اخوت ومحبت کا آفاقی درس دیا۔ آیئے ذرا فلک بوس پہاڑیوں کو سر کر کے کشتواڑ کی خوش بخت وپرُنم سرزمین سے آنکھیں ملا کر دیکھیں کہ اقلیم عرفان وسخن کا یہ بے تاج بادشاہ رختِ سفر باندھے پُشتیں بدل بدل کر وارد کشمیر ہونے کے لئے کب سے بے تاب تھا۔ ویرآمدی براہِ دُور آمدی۔

## حضرت شیخ العالمؒ کا خاندان

شمس العارفین حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کے جدِ بزرگوار کشتواڑ کے راجا تھے۔ رشی ناموں اور نور ناموں میں جو کچھ بھی اُن کے حالات کے بارے میں درج ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن کے جدِ امجد اوگراسنز (تیز) ناسازگار حالات کی

وجہ سے کشمیر چلے آئے۔ اُن کا ایک بھائی کولگام تحصیل کے ڈ در کوٹ گاؤں میں قیام پذیر ہوا اور بھائی نے چرار شریف کے قریب تلہ سر گاؤں میں خمنی وانو کے یہاں پناہ لی۔ خمنی وانو اس علاقے کا سردار تھا۔ اوگراسنز اپنی خداداد قابلیت وصلاحیت کی بنا پر خمنی وانو کے معتمدوں میں شامل ہوا۔ خمنیؔ وانو جب بھی شکار کھیلنے یا کسی دوسرے کام سے کہیں چلا جاتا تو اپنے سارے اختیارات اوگراسنز کو سونپ دیتا۔ مھن کوٹ کے علاقہ کا حاکم راجہ مانرے خمنی وانو کا دوست تھا۔ ایک دن وہ شکار کھیلتے اُس کے یہاں پہنچ گیا اور کئی دن وہاں ٹھہرا۔ کریوہ باروہ کے بڑے زمیندار مکند راجہ کی خمنیؔ وانو سے عداوت تھی۔ اُس نے موقع پا کر تلہ سر پر حملہ کیا اور اوگراسنز (تیز) ''رہکائ'' کے میدان کارزار میں مارا گیا۔ جب خمنیؔ وانو کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو وہ راجہ مانرے کی فوج لے کر ''کریوہ باروہ'' کی طرف چل پڑا اور مکند راجہ کے قلعہ کے اینٹ سے اینٹ بجادی۔ خمنیؔ وانو نے اوگرسنز (تیز) کے بعد گرزاسنز کو منصب سپہ سالاری بخشا۔ گرزاسنز کے بیٹے کا نام درپتاسنز (تیز) تھا[1]۔ درپتاسنز کا بیٹا زنگاسنز بڑا بہادر تھا اور راجہ سہدیو کے زمانے میں ذولچو، کی تباہ کاریوں کا شکار ہو کر لڑائی میں مارا گیا۔ زنگا سنز کا بیٹا ہُمر سنز جان بچانے کیلئے جگہ جگہ مارا مارا پھرتا رہا۔ جب حالات ذرا سدھر ے تو وہ گوڈ سوتھو (بڈگام) میں آکر بسا۔ ہمر سنز کا بیٹا گرزاسنز تلہ سر کے کوٹہ راجا خمنی وانو کا سپہ سالار رہا جو باروہ (بڈگام) کی پہاڑی پر ایک تصادم میں مارا گیا۔ گزراسنز کا بیٹا سلرسنز اپنے والد کے مارے جانے کے بعد دل برداشتہ ہو کر سکونِ قلب کی تلاش میں حضرت سید حسین سمنانیؒ کے حضور پہونچا اور انہی کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوا۔ نومسلم کی حیثیت سے شیخؒ سالار دین کہلایا اور حضرت شیخ نورالدین کے مولود مسعود

---

۱ کشمیری زبان اور شاعری۔ جلد دوم۔ عبدالاحد آزاد۔ مطبوعہ کلچرل اکادمی سرینگر۔ ص ۱۴۸۔ ۱۴۷

کی گھڑی قریب تر آتی گئی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ العالمؒ کا لکھا ہوا منظوم نسب نامہ من وعن پیش کیا جائے۔

سَنزِ ے چُھم مول تے سنزِ ے چھم مائ جی
کل تھاو، کول میون چھُ سنزِ ے ہو
جد میون بکن وڈن اوگرا سنز اوسو
سنہٕ پتہٕ رٕوس درپتا سنز!
درپتا سنزس یله سمے ووتو
پوٚت پتھ رٕوس زنگا سنز
زنگا سنز ییٚله رنہٕ سنز موٚرو
پتھ تس رٕوس ہُنر سنز
ہُنر سنزس سُت کم ووپتو،
اکھ سُت رٕوس گرزا سنز
گرزا سنز س سلر تےٕ سلوٚ
سلرُن بہ چھس ننُدا سنز

اس لئے حضرت شیخ العالمؒ کے شجرہ نسب کو یوں ترتیب دیا جاسکتا ہے:

اوگرا سنز

درپتا سنز

زنگا سنز

ہُنر سنز

گراز سنز

سلر سنز (شیخ سالار دین)

## نُند اسنز (حضرت شیخ العالمؒ)

### بابا حیدر

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلر سنز بجبہاڑہ میں یاسمین رشی کے ہاتھوں دائرہ اسلام میں آیا لیکن حضرت شیخ کی داخلی شہادت سے اس بات کی تردید ہوتی ہے۔

اکھ شت سلت سنز پرمانو وُ دی مسلمان گتہ پہن
تس گور سید حسین سمنانو لیس حیدر کا لگامیُن ربن

جملہ ریشی نامے[1] اسی بات پر متفق ہیں کہ حضرت سید حسین سمنانیؒ ۷۷۵ہجری میں وارد کشمیر ہوئے۔ قدرتی امر ہے کہ اُن کے ورودِ مسعود

---

[1] حضرت شیخ العالمؒ کے بارے میں لکھے گئے ریشی ناموں میں ریشی نامہ بابا نصیب الدین، ریشی نامہ بابا کمال، ریشی نامہ (منظوم) بابا کمال، ریشی نامہ بابا خلیل، ریاض الاسلام عبدالوہاب شائق، ریشی نامہ ملا بہاؤالدین قابل ذکر ہیں۔

[2] عبدالاحد آزاد نے کشمیری زبان اور شاعری جلد ۱مطبوعہ کلچرل اکادمی میں حضرت شیخ العالمؒ کے سوانحی حالات قلمبند کرتے ہوئے "حضرت شیخ: عالم ارواح میں" کے عنوان سے لکھا ہے:

"جب بانی مسلمانی میر سید علی ہمدانیؒ بزرگان دین کی ظاہری اور باطنی تربیت سے بدرجہ کمال پہنچے اور انہوں نے "اُورادِ فتحیہ" مرتب کئے تو ایک دفعہ حضرت خضرؑ اُن کے پاس تشریف لائے۔ اورادِ فتحیہ دیکھ کر اس میں چودہ کلمات کا اضافہ کر کے نظر سے غائب ہو گئے۔ حضرت علی ہمدانیؒ مدینہ منورہ کو زیارت کے لئے چلے گئے اپنے جد بزرگوارؐ کے مرقد پاک کے سامنے دست بستہ کھڑے رہے۔ ان پر ربودگی کی کیفیت طاری ہوئی۔ روضۂ مطہرہ سے ایک حسین لڑکا نکلا۔ میر سیدؒ کا وہی مجموعہ کلمات ہاتھ میں لیکر پھر اندر چلا گیا۔ دوبارہ باہر آ کر یہ مجموعہ میر سید علی کے حوالے کر دیا۔ کہا کہ حضرت نبی کریمؐ نے اپنی زبان پاک سے فرمایا فرخُذِ الفتحیہ۔ میر سیدؒ خدا شکر بجالائے اور اُس لڑکے کے حسن و جمال سے متعجب ہوئے۔ حضورؐ سے عرض کی "ایں فرزندِ ارجمند از نسل کدام اصل است" جواب ملا کہ یہ لڑکا ریشیان کشمیر کا سردار نورالدین نام ابھی پردہ غیب ہی میں پوشیدہ ہے" عنقریب از پشت پدر در شکم مادر قرار گیرد۔ برتو لازم است کہ در خطۂ کشمیر رفتہ نامش نورالدین گزاری وایں فتحیہ در ملکش داری" اس طرح سے بانی مسلمانی جدِ بزرگوار کے حکم سے کشمیر آئے۔ جب اسلام آباد پہنچے تو لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ للہ عارفہ نے دور سے اُن کو دیکھا۔ ہر چند کہ تن ڈھانپنے کی کوشش کی، کپڑا نہیں ملا۔ "بے ہلت مرد آمد" کہتے ہوئے ایک نانبائی کے جلتے تنور میں کود پڑی۔ نانبائی گھبرا گیا۔ تنور پر بڑی سی ہانڈی رکھدی۔ میر سید دکان کے آگے ٹھہر گئے۔ نانبائی سے کہا کہ تنور کا ڈھکنا اٹھاؤ۔ وہ بے چارہ سخت گھبرایا۔ میر سیدؒ نے تنور کا ڈھکنا خود اُٹھایا۔ عارفہ "ملبس از تنور مانندِ حور بروں آمد" اور سلام تحیات بجالائی......"

امیر عارفہ سے شیخ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ ابھی پردہ بطن سے جلوہ گر نہیں ہوئے ہیں۔ امیرؒ اور عارفہ پھر بھی کیموہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ شیخ نے بطن مادر سے سلام کیا۔ امیرؒ نے تحسین و آفرین کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے بعد ہی سلزنٔ مشرف با اسلام ہوئے ہونگے۔ حضرت سمنانی ایک روایت کے مطابق حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے تعمیل ارشاد میں یہاں حالات کا جائزہ لینے کے لئے اپنا آبائی وطن سمنان چھوڑ کر ہندوستان آئے اور دہلی

---

اتنے میں شیخ کی والدہ سدرہ ماجی بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ ہوش میں آئیں تو حضرت میرؒ نے ان سے نام پوچھا اور ترجمان سے اس نام کے معنی پوچھ کر فرمایا ''البتہ ایں چنیں در شہوار، در صدف عمال خواہد شد۔'' سدرہ ماجی نے عرض کی کہ نماز پنجگانہ کی اذان کے وقت میری یہی حالت ہوتی ہے۔ میرؒ نے فرمایا کہ اس پشت بہ قبلہ رہنا چاہئے تاکہ بچہ (شیخ) قبلہ رو ہو کر نماز ادا کر سکے۔ اس طرح آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ للہ عارفہ کو امر ہوا کہ در نگہبانی ایں در گرانی نہ کُنی۔''

جب حضرت میر سید علی ہمدانیؒ دوسری مرتبہ کشمیر آئے تو موضع کیموہ (کولگام) جہاں حضرت شیخ سکونت کرتے تھے پہنچے۔ شیخ کی عمر اس وقت سات برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ ایک کریوہ پر ایک اونچی جگہ پر بیٹھے تھے۔ حضرت امیرؒ نے اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑا اور شیخ کے پاس گئے۔ شیخ آداب بجالا کر متواضع بیٹھے۔ حضرت امیرؒ دیر تک شیخ کو اسرارِ باطنی سے آگاہ کرتے رہے۔ حضرت امیر کے ساتھیوں میں غلام الدین موذن ایک تھے۔ اُن کے دل میں حضرت امیرؒ کے اس رویہ سے برے جذبات اُبھرنے لگے۔ ابھی اس کے دماغ میں یہ خیالات گھوم ہی رہے تھے کہ سید پاک آگئے اور غلام الدین سے یوں مخاطب ہوئے۔

''اے غلام الدین ایں اوہام باطل در دل راہ مدہ۔ حقائق شناسان را بخشم حقارت نگریستند خود در چاہِ ذلالت انداخت است۔ وایں معصوم کہ در نظرت حقیر نمود۔ خورشید اوج پزیر است۔ روز خواہد بود کہ تمنائے مریدی وے خواہی کرد۔''

(اے غلام الدین ان غلط قسم کے اوہام کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ حقائق شناس لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی خود گمراہی کے گھڑے میں گر جائے گا اور یہ معصوم جو تمہاری نظر میں حقیر ہے ایک ایسا سورج ہے جو مائل بہ رفعت ہے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ تو اس کا مرید بننے کی خواہش کرے گا۔)

کچھ عرصے کے بعد حضرت امیر کبیرؒ اپنے وطن واپس تشریف لے گئے۔ رحلت فرمانے کے وقت اپنے فرزند ارجمند میر محمد ہمدانی کے نام کشمیر جا کر حضرت نورالدین رشی سے ملنے کی وصیت تحریر فرما کر اپنے مرید خاص شیخ قوام الدین کے حوالے کر دی''۔

اس طرح سے حضرت شیخ نورالدینؒ کی ملاقات حضرت امیر کبیرؒ سے دو بار ہوتی ہے۔ ایک پیدائش سے پہلے دوسری بار صغر سنی میں۔

حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے فرزندِ ارجمند حضرت میر محمد ہمدانیؒ کا قیام وادی کشمیر میں ۲۲ سال رہا وہ ۱۳۹۳ء میں وارد کشمیر ہوئے اور متذکرہ بالا ہدایت کے تحت حضرت شیخ سے اُن کے مراسم کا پتہ اس امر سے ملتا ہے جب ۱۵ر رجب ۸۱۴ھ کو حضرت شیخ کو انہوں نے پوستِ آہو پر رقم ''خطِ ارشاد'' عطا کیا اور اُن کے ولی اکمل ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ یہ اہم تاریخی دستاویز جو خط نسخ میں ہے خانقاہ معلیٰ کی جملہ نوادرات کی زینت ہے جو متعلقہ اوقاف کی تحویل میں ہے۔

کے قریب قصبہ سامان میں عارضی قیام کیا۔ وارد کشمیر ہونے کے بعد انہوں نے علاقہ دیوسر کو اپنا مسکن بنایا۔ ۱۱ر ماہ شعبان ۸۹۲ء کو جان آفرین کو اپنی جان سپرد کردی۔ کولگام میں اُن کا مدفن مرجع خاص و عام ہے کولگام کے قریب آمنو میں ان کے اہل خاندان آسودہ ہیں۔ ہر عہد ساز شخصیت روایات و عقائد کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پروان چڑھتی ہے۔ یہی کچھ شیخ سالار دین اور سدرہ ماج کے رشتہ زن وشو کے ساتھ ہوا ہے۔ سدرہ موج بھی کشتواڑ کے راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ داوٗت جو ڈدر کوٹ کا راجہ تھا، رعایا کی بغاوت کے دوران قتل کیا گیا۔ سدرہ موج اُسی کی دختر نیک اختر ہے جو اپنے والد کے مارے جانے کے وقت نابالغ تھی۔ مروجہ دستور کے مطابق اُس نے ''کھی جوگی پورہ'' کے قریبی گاؤں کے چوکیدار کے یہاں پناہ لی۔ سدرہ موج اسی کی پرورش میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ چوکیدار دیہہ کو لازماً اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس نے ایک نوجوان کو (جس کے پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے[1]) خانہ داماد بنادیا۔ رشتہ مواصلت میں بندھ جانے سے پیشتر ہی وہ نوجوان فوت ہوا۔

یہ سارا ماجرا چوکیدار دیہہ نے سید حسین سمنانیؒ کو جو اس وقت کولگام میں قیام پذیر تھے سُناتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں اس سے اس نیک سیرت بیٹی کے رشتہ زوجیت کے ضمن میں کوئی غلطی سرزد نہ ہوجائے۔ حضرت سمنانیؒ مراقبہ میں ڈوب گئے۔ سر اُٹھا کر تبسم کرتے ہوئے بولے۔ ''اللہ نے اس گوہر تابدار کی مواصلت شیخ سالار کی قسمت میں لکھی ہے۔ اسی دوران شیخ سالار بھی

---

1۔ یہ بھی روایت ہے کہ ششں اور گندر چوکیدار دیہہ کے اپنے بیٹے تھے۔

حضرت سید حسین سمنانیؒ کی صحبت عارفانہ میں حاضر ہوئے اور انہی کے ارشاد کی تعمیل میں سدرہ موج سے رشتہ ازدواج میں منسلک کیا۔ حضرت سید حسین سمنانیؒ کے کہنے پر وہ ازاں بعد کیموہ میں قیام پذیر ہوئے۔ کشتواڑ سے متعلق کُتب میں اوگردیو کا حوالہ ملتا ہے۔ حشمت اللہ خان، شیو جی در، نجم الدین اور عشرت کشمیری نے تاریخ کشتواڑ پر قلم اُٹھایا ہے۔ حضرت شیخؒ کے جدِ امجد اوگردیو کے بارے میں نجم الدین یوں رقمطراز ہیں:

''اوگردیو کے خلاف اُس کے پچیرے بھائی بولدردیو نے بغاوت کی اور وہ بھاگ کر کشمیر چلا آیا۔ جہاں بادشاہِ وقت نے اُسے ''روپہ ون'' کی جاگیر عطا کی۔''

سنز کشتواڑی میں پہلوان کو کہتے ہیں۔ تاریخ کشتواڑ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنگھ اور سین کنیت کے طور ناموں کے ساتھ برتنے کا رواج تھا۔ سنگھ سنسکرت لفظ سہم سے ماخوذ ہے، جس کے لغوی معانی شیر کے ہیں اور مجازی معنی بہادر اور شجاع کے ہیں۔ سین کا سنگھ یا سہم سے ماخوذ ہونا قرین قیاس نہیں۔ سین بھی اصلاً سنسکرت لفظ ہے جس کے لغوی معنی نوکر، ماتحت اور جسد و بدن کے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ کوئی لفظ اپنے اصلی معنوں میں روزمرہ میں کھپ جائے۔ کچھ بھی ہو، سہم سنگھ، سین اور سنز کا آپسمیں معنوی رشتہ ضرور ہے۔ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اگر حضرت شیخؒ کے جدِ امجد کا نام اوگردیو تھا تو سنز (تیز) کا استعمال کب سے شروع ہوا؟۔

## ولادت

ریشی نامہ ''روضۃ الریاض'' کے مصنف بابا خلیل حضرت شیخؒ کی ولادت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس سرمایہ سعادت کی ولادت سلطان قطب

الدین کے نویں سالِ جلوس کو قریہ کیموہ میں ٦ جمادی الاول ۷۷۹ھ[1] کو ہوئی۔

''ولادت آن سرمایہ سعادت نہم جلوس سالِ جلوس سلطنت سلطان قطب الدین بقریہ کیموہ درروزِ نفیس یوم الخمیس ہشتم ماہ جمید الاول سنہ ہجری ہفت صدو ہفتاد دونہ بود۔

تاریخ کبیر کے مصنف بھی ابو الفقرا بابا نصیب الدین غازیؒ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ کی ولادت کیموہ میں ۷۷۹ھ میں ہوئی۔

ابو الفقرا بابا نصیب الدین غازی (وفات ۱۰۴٦ھ) کا نورنامہ ریشان کشمیر کا اولین تذکرہ ہونے کے ناتے رشیت کی تاریخ میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کی ولادت باسعادت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

''چناں آوردند کہ از ہجرت سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سنہ ہفت صد و ہفتاد ونہ بود کہ حضرت شیخ تولد شُد۔

زہجرت سید عالم ازیں دار کہ بُد ہفتاد و ہفت صدنہ پدیدار
زہی شیخی کہ نور الدین امجد تولد یافت از تاریخ سرمد''

بابا نصیب الدین غازیؒ سے حضرت شیخ کی تاریخ ولادت پر سبھی مورخین نے اتفاق کرلیا ہے کیونکہ حضرت شیخ نور الدین ولیؒ و دیگر ریشیان کشمیر کے اولین تذکرہ نویس کی حیثیت سے اُن کی رائے زیادہ معتبر ہے انہوں نے نہ صرف روایات کو محفوظ رکھا بلکہ تحقیق و تفتیش سے انہیں وقیع اور زیادہ وزن دار بھی بنا دیا۔

بابا کمال بھی ۷۷۹ھ کو حضرت شیخ کا صحیح سن ولادت مانتے ہیں اور

---

[1] ۷۷۵ھ بھی سال ولادت قرار دیا گیا ہے لیکن مورخ حسن نے ملا احمد کی تاریخ ''وقایع کشمیر'' کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت شیخ کا سن ولادت ۷۵۷ھ لکھا ہے۔ ملا احمد کو حضرت شیخ کا ہم عصر کہا گیا ہے۔ یہ دونوں سنین ولادت قرین حقائق نہیں۔

بہاؤالدین متو بھی ؎

نند نیکو است در ہمہ گیتی　　　از زبان خوش سمسکریتی

چوں تولد شُد آن خجستہ نہاد　　　بود یک کم ز ہفت صد و ہشتاد

پنڈت نرائن کول عاجز اپنی ''منتخب التواریخ'' میں اور بیربل کاچرو اپنی مجموعہ التواریخ'' میں حضرت شیخؒ کی ولادت میں مندرج سموت ۷۷۹ھ کی تائید کرتے ہیں اس طرح یہی بات پایہ ثبوت کو پہنچ پائی ہے کہ حضرت شیخ نورالدین ولی رحمتہ اللہ علیہ کے عدم سے وجود میں آنے کا سال ۷۷۹ھ (مطابق ۱۳۷۸ء) ہے۔

## خاندانی زندگی

شیخ سالار دین کا خاندان قناعت و زہد کا نمونہ تھا حضرت شیخؒ نے ابھی عمر کی تیرہ ہی منزلیں طے کی تھیں کہ اُن کے سر سے والد بزرگوار کا سایہ اُٹھ گیا۔ حضرت شیخ بچپن ہی سے یادِ خدا میں محو رہتے تھے اور عیش و تنعم کو ہیچ گردانتے تھے کہ آپ ولی مادر زاد تھے۔

حضرت شیخؒ کی مرضی کا اس میں دخل تھا یا نہیں، اُن کی شادی ڈاڈہ سرہ ترال کے اکبر دین نامی شخص کی بیٹی زے دید سے ہوئی۔ جمال الدین، کمال دین اس کے دو بھائی تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ اُن کی اہلیہ پرگنہ برنگ ساگام کی رہنے والی تھی۔ لیکن داخلی شہادت کی بناء پر اسے تسلیم کرنے میں تامّل ہوتا ہے۔ کچھ بھی ہو، اُن کی اہلیہ محترمہ کا نام زے دید ہی تھا۔

## ترک علائق غار نشینی اور عرفان نوردی

شادی کے چھ سال بعد زے دید کے بطن سے دختر نیک اختر زون دید اور فرزند ارجمند بابا حیدر پیدا ہوئے۔ اللہ کو چونکہ حضرت شیخ کو دنیوی

بندھنوں میں جھکڑے رکھنا منظور نہ تھا۔ اسلئے ان دونوں ننھی جانوں کو اس دنیا سے اُٹھالیا۔ حضرت شیخؒ اپنے رضاعی بھائیوں شش اور گندر کی غلط راہ اختیار کرنے پر تیار کرنے کی تمام تر کوششیں ناکام ہوئیں[1]۔ زے دید انہیں یعنی حضرت شیخ کو رشتہ از دواج میں فطرت کے عین مطابق باندھے رکھنا چاہتی تھی لیکن بالاخر اسے رضائے مولا کے سامنے سرخم ہونا پڑا۔ جذبہ عشق کام کر جائے اور نور الٰہی راہنما ہو تو ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، زن و شو کے تعلقات اور جگر پاروں کی فطری محبت کبھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ حالانکہ اسلام میں دنیوی لذات کو کلی طور ترک کر کے راہبانہ زندگی گزارنے کی گنجائش نہیں۔ لیکن پھر بھی حضرت شیخؒ تقویٰ و زہد کی حدؤد پھاند کر راہِ حق پر چل نکلے۔ سبھی رشتے ہیچ ثابت ہوئے وہ عشقِ الٰہی میں مگن راہِ عرفان پر گامزن ہوئے[2]۔

حضرت شیخؒ نے نفس امارہ کو بس میں کر لیا تھا۔ اسلئے وہ کسی طور دنیوی زندگی گزارنے کیلئے راضی نہ ہوئے۔ وہ اپنی والدہ ماجدہ کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے رہے کہ ''میں دور بن جا کر تپسیا کرتا اوپل ہاک اور کاسنی پر گذر راہ کرتا۔ میں آئے غصے کو اگر پی سکتا تو جاودانی ہوتا، جو اپنے بیگانے میں کوئی تمیز و تفاوت نہیں رکھے گا۔ وہی منزل کو جا لیا۔ اُسی کا بیڑا پار ہے''۔

---

[1] اس بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ انہوں نے حضرت شیخؒ سے ناممکنہ چیزوں تک کی فرمائش کی، اپنا دودھ طلب کیا تو حضرت شیخؒ کے اشارے سے ایک پتھر سے دودھ بہنے لگا۔ وہ بگڑ کر بولیں کہ میرے دودھ سے تو جوان ہوا، گوشت پوست حاصل۔ کیا یہ دودھ کس کام کا؟'' چنانچہ حضرت شیخؒ کی روح قفس عنصری چھوڑ کر پرندے کے روپ میں ایک شاخ پر جا بیٹھی ماں کا دل تھا کہ پسیج گیا۔ تھک ہار کر بولیں ''جو چاہے کر پر مجھے یوں نہ ستا۔ اس پر حضرت شیخؒ دوبارہ انکے روبرو استادہ ہو گئے۔

[2] کیونکہ انہیں وہ مل چکا تھا جس کی انہیں تلاش تھی۔ اسی لئے کھانے پینے اور آرام و آرائش غرض ہر فکر سے آزاد ہو گئے۔ حضرت شیخؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سلسلہ اُویسیہ سے منسلک تھے لیکن حسن کھویہامی ''وقائع کشمیر'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ حضرت شیخؒ نے پہلے حضرت میر سید علی ہمدانیؒ پھر سید حسین سمنانیؒ اور پھر میر محمد ہمدانی سے فیض پایا۔

اَندوَن نیرتھ تپ ژرِ ہا — اُڈٕ ہر کرِ ہا وہ پل ہا کس تہٕ ہندے
آہو ژکھ یوٚد پتھ کرِ ہا — تی یوٚد کرہا مرہا کندے
پرتہٕ پان یُس ہُوے ویندے — سُے بوٚ سیندے ترتھ آو

نفس کشی اور ترکِ لذات کا یہ حال تھا کہ کئی دن تک فاقہ رہتے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ سال ہا سال تک اناج کی کسی قسم کی کوئی چیز تناول نہیں فرمائی۔ ایک جگہ دنیوی نعمتوں پر ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اوپل ہاک اور کاسنی (دو کڑوی سبزیوں) سے روحانی تازگی وسرمستی عطا ہوتی ہے، جو دودھ کے بدلے پانی متھے اس نے جنم لیا ہی کیوں۔

یُس ساد وہ پل ہا کس تہٕ ہندے — سُہ زن سبزس گریندے ژاو
دودتر اُتھ پونی لیس مندے — سُہ سمسارس کندے زاو

حضرت شیخ نورالدین رشیؒ اُنیس سال کی عمر میں کیموہ میں غارنشین ہوئے۔ کیموہ دریائے ویشو کے مغربی کنارے پر آباد ایک گاؤں ہے۔ یہ پرانے زمانے میں ایک جنگل تھا۔ یہیں قریب ہی ''شہمار ٹینگ'' کی جگہ تھی جہاں حضرت شیخؒ نے ایک گپھا کھدوائی اور اسی میں عزلت نشینی اختیار کی۔ اپنی والدہ محترمہ کو یوں دلاسہ دیتے ہیں کہ گپھا میرے لے عالی شان محل ہے اور خرقہ ریشمیں ملبوس۔ چوہوں سے میں طوطے سمجھ کر کھیلوں گا۔ یہاں تک کہ عمر کی دو گھڑیاں بیت جائیں گی۔

ماج گوپھ بہٕ وندے لُرے — جندٕ بہٕ وندے پاٹی کاے
گگرن بہ رازٕ شوگن گندَے — سارٕ عمر بہٕ وندے گرِ ڈاے

کیموہ میں حضرت شیخؒ نے غارنشینی وعبادت گزینی کے بارہ سال گزارے۔ جس کے بعد وہ عرفان اور نوروی پر چل نکلے۔ آپ کے بارے

میں مشہور ہے کہ تیس برس کی عمر میں ایک رات خواب میں سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے فیض یاب ہوئے۔ آنحضور ﷺ نے اپنے دست مبارک حضرت کے کندھوں پر رکھے اور دُعا فرمائی۔ بیدار ہونے پر دوسرا ہی عالم تھا۔ ان کا دِل عشقِ الٰہی سے لبریز تھا۔ عشقِ جنون کی حد تک جا پہونچا تھا۔ بقول ابو الفقرا بابا نصیب الدین غازیؒ ؎

شیخ نورالدین کہ نور از خاک او آید بروں
فیض گونا گوں ز روحِ پاک او آید بروں

اشاعت عرفان و آگہی کے سلسلہ میں حضرت شیخؒ نے جن مقامات پر قیام کر کے اُنکی عزت و توقیر بڑھائی، وہ ہیں:

☆ **ژِمبر**: یہ وہ اولین مقام ہے جہاں آ کر حضرت شیخؒ کیموہ میں بارہ سال غار نشینی میں گزار کر ایک سال قیام کرتے ہیں۔ یہاں بھی اُن کی زیارت گاہ ہے۔ ژِمبر نارِ واو (نور آباد) کا یہ خوش بخت قطعہ زمین اتنا پُرسکون وُ پرسکوت ہے کہ علامہ اقبالؔ کا یہ شعر بیساختہ زبان پر آتا ہے ؎

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

☆ **ہمچی پورہ**: یہاں حضرت شیخ العالمؒ سات سال (۱۴۱۵ء تا ۱۴۲۱) ٹھہرے۔ شیام دید یہیں پر اُن کے خلفاء میں شامل ہوئی۔ حضرت شیخؒ کی زیارت گاہ پر یہاں بھی چرار شریف کے سالانہ عرس کے اَیام کے دوران ہی میلہ لگتا ہے۔

☆ **سُتہِ ہارن**: یہ خوبصُورت قطعہ زمین بھی پرگنہ، بیروہ بڈگام میں واقع ہے، جہاں حضرت شیخ نے ۱۴۲۲ء کے چھ ماہ یادِ خدا میں گزارے۔

☆ درے گام: ہمچی پورہ سے رخصت ہوکر حضرت شیخؒ ستہِ ہارن سے ہوتے ہوئے دڑے گام پہنچے۔ یہاں اُن کا قیام بارہ سال (۱۴۲۳ء تا۱۴۳۴) کا رہا۔ درے گام کی خانقاہ میں وہ مسطح پتھر بھی موجود ہے جس پر حضرت شیخؒ عبادت خدا کیا کرتے تھے یہاں سنگی گنائی اُن کے خلفاء میں شامل ہوئے۔ سنگرام[1] گنائی عرف سنگی گنائی کا مدفن بھی زیارت حضرت شیخؒ کے جنوب میں مزارِ عامہ کے ایک بلند گوشہ میں واقع ہے۔آج کل مقامی بیگ خاندان آستان شریف درے گام کا انتظام چلاتے ہیں۔اس کی جدید تعمیر کا کام ہاتھ میں لیا گیا ہے۔ یہاں سے جب حضرت شیخؒ رخصت ہوئے تو سنگرام گنائی بھی بادل ناخواستہ انہیں الوداع کہہ رہے تھے کہ حضرت شیخؒ نے ندی پار کرتے ہوئے فرمایا کہ جس کسی کو مراد مانگنے آنا ہو، وہ ویروار کو درے گام پہنچے۔ میں اس روز ہر ہفتہ باطنی طور حاضر رہا کرونگا۔

روپہ ون: یہی وہ بلند اقبال گوشہٗ ارضی ہے جہاں بادشاہِ وقت نے حضرت شیخ نورالدینؒ کے آباواجداد کو جاگیر عطا کی تھی نامساعد حالات کی وجہ سے انہوں نے یہاں رہنا ترک کیا تھا۔حضرت شیخؒ نے اپنی اور پارسا زندگی کے آخری سات سال (۱۴۳۵ء تا۱۴۴۱) یہیں گزارے۔ روپہ ون، چرار شریف، جہاں حضرت شیخ کی آخری آرام گاہ ہے، کے شمال مغرب میں ایک کلومیٹر کی دوری پر

---

[1] حضرت شیخ العالمؒ کے ممتاز خلفاء میں بابا نصر الدین، بابا قطب الدین، شنگہ بی بی (مدفن چرار شریف آستان عالیہ) بابا بام الدین (مدفن بُمہ زُو) بابا زین الدین (مدفن عیش مقام) بابا لطیف الدین، شام بی بی (مدفن پوشکر) بابا غلام الدین (مدفن نشاط) بابا تاج الدین (وترہیل)، بابا قمام الدین (مدفن منزگام دیوسر بہت بی بی، دہت بی بی (مدفن ژانہ کور بن ژار) شامل ہیں۔شام بی بی نے حضرت شیخ کی وفات پر مرثیہ لکھا تھا جو کشمیری زبان میں اپنی قسم کا پہلا مرثیہ ہے۔

واقع ہے۔ یہاں حضرت شیخ کی مختصر سی زیارت ہے، جہاں وہ پتھر بھی موجود ہے جسے حضرت شیخ مصلے کی جگہ استعمال کیا کرتے تھے اس زیارت کی تعمیر کئی بار کی جا چکی ہے۔ آستانہ شریف کے قدموں میں صدیوں سے میٹھے پانی کا چشمہ جاری ہے۔

اُنہوں نے کسی جگہ کو بھی اپنا مستقل مسکن نہیں بنایا وہ مراز کے انتہائی بالائی گوشوں سے ہوتے ہوئے کمراز کی سیاحی کو چلے۔ ریشی ناموں کی روایات کے مطابق وہ پرگنہ کرہن، پٹن اور بِند رہوم و دیگر مقامات پر پہنچے۔ کمراز کی سیاحت کا زمانہ ۱۴۱۳۔۱۴۱۴ ہجری کے آس پاس ہے۔ کمراز سے لوٹتے وقت وہ سرینگر میں موکھتہ مُل (موکھتہ پوکھری) پہنچے، جہاں انہوں نے خلوت گزینی میں ایک سال گزارا۔ یہاں اُن کی زیارت گاہ بھی موجود ہے یہی وہ مقام ہے جہاں رقاصہ ایمان دزد ''لولی'' عرف ''یاوَن مُوٗ'' ان کے حلقہ عقیدت میں آ کر دائرہ میں اسلام میں آئی۔

ریاست جموں وکشمیر میں حضرت شیخ العالمؒ کو خراج عقیدت ادا کرنے کیلئے سرکاری طور شش صد سالہ تقریبات کا اہتمام ۱۹۷۸ء میں کیا گیا۔ ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے ایک سالہ تقریبات کے دوران اُن کی ذات سے منسوب مقامات پر یادگاری لوح نصب کرائے۔ جن کے ذریعہ ان کی تہذیبی ،لسانی اور شعری کارناموں کو اُجاگر کیا گیا۔ قومی ار ریاستی سطح کے سیمنار منعقد کیئے گئے۔ ''شیرازہ'' اُردو کشمیری ہندی، پنجابی وغیرہ کے خصوصی نمبر شائع کیئے گئے۔ کشمیری سے اُردو ، ہندی اور انگریزی میں اُن کے کلام کے تراجم منظر عام پر آئے۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ کشمیری کے رسالہ ''انہار'' کا خصوصی نمبر شائع ہوا۔ ساہتیہ اکادمی نے بڑے پیمانے پر قومی سیمنار کا اہتمام کیا۔ کشمیر کلچرل آرگنائزیشن کی جانب سے ایک یادگاری مجلّہ ''علمدار کشمیر'' کی اشاعت روبہ عمل آئی۔ مراز ادبی سنگم بجبہاڑہ کی طرف سے ''وِبتھ آگُر'' کے خصوصی شمارے کے علاوہ ایک مختصر مگر جامع تحقیقی رسالہ

''نورِ آگر''، حضرت شیخؒ کی زندگی اور ادبی کارناموں کے حوالے سے شائع کیا گیا۔ حضرت شیخؒ سے منسوب مقامات کی زیارت گاہوں کی تصویروں پر مشتمل ایک مرقع بھی ریاستی کلچرل اکادمی نے ترتیب دے کر شائع کیا۔ اس طرح کشمیر تہذیب وتمدن اور زبان وادب کے اس کلیدی معمار کی زندگی اور کارناموں کو بطریق احسن اُجاگر کیا گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کا کلیات جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور دستیاب قلمی نسخوں و دیگر مواخذ کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔ بھی زیورِ طباعت سے آراستہ کیا گیا[1]۔

## شعری کارنامے

یہ حُسنِ اتفاق ہی سمجھ لیجیے یا غیر مرئی فطری قوانین کی ناگزیریت کہ ہر زبان کے ادب کی شروعات شاعری سے ہوئی ہیں۔ وہ فطرت کی نیرنگیوں کے بارے میں تصورات ونظریات پر مبنی دیو مالائی عقائد ہوں یا حیات وکائنات کے بارے میں الوہی عقائد کے آئینے۔ عرفانِ ذات وخالق کائنات کے سوتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں کمال وزوال کے مرحلے آتے رہتے ہیں، ہمارے حصے میں بھی آئے۔ ہم بھی کبھی ڈوبے اور پھر ڈوب کر اُبھرے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لل دید اور حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ ہماری تہذیب اور زبان وادب کے روشن مینار بھی ہیں اور معمار بھی۔ وہ ہماری منفرد قومی شناخت برقرار رکھنے کی ضمانت بھی ہیں ورنہ سیاسی مصلحت پسندیوں اور فریب کاریوں نے ہمارا خاتمہ کب کا کیا ہوتا۔ یہ کشمیری زبان وادب اور اس

---

[1] کلیات موتی لال ساقی (وفات ۱۹۹۹ء) کا ترتیب دیا ہوا ہے اور حضرت شیخ العالمؒ کی ہمہ جہت شخصیت کے جملہ خدوخال اُجاگر کرنے کیلئے کشمیری یونیورسٹی میں شیخ العالمؒ چیئر کا قیام ستمبر ۱۹۹۸ء میں عمل میں لایا گیا ہے۔ جس کے پہلے سربراہ پروفیسر حامدی کشمیری ہیں۔

خطۂ مینو نظیر کی خوش بختی ہی ہے کہ بحرِ ظلمات کے بطن کو چیرتے ہوئے آبِ حیات کے یہ زمزمے ہم تک پہنچتے ہیں ورنہ چھ سو سال کی مدت کچھ کم مدت نہیں ہوتی ۔ لوگوں نے انہیں صفحہ قرطاس کی زینت بننے سے پہلے ماضی قریب تک سینے سے لگائے رکھا۔ ورنہ ''کشمیریت'' کی یہ واحد پہچان ، جس کے دو اہم ستون لل دید اور حضرت ''علمدار کشمیرؒ'' ہیں، بھی ہم سے جاتی رہتی۔

شتی کنٹھ کی مہانے پرکاش کو کشمیری زبان کی اولین صورت قرار دیا گیا ہے، جسے بہر صورت عوامی نہیں علمی زبان کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ فاضل مصنف کیلئے شِو درشن کی ترکیبات کا من وعن استعمال لازمی تھا۔ حضرت شیخؒ کے زمانے میں فارسی درباری زبان ہونیکی وجہ سے خواص کی زبان تھی اور عوام کی زبان کشمیری ہی تھی ۔ جس کا عمومی اندازہ لل دید اور کلام شیخؒ سے کسی حد تک کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لل دید ہی کا کلام حضرت شیخؒ کیلئے ایک تابندہ ودرخشندہ لسانی اور شعری روایت کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ لل دید اور حضرت شیخؒ کا کلام آپس میں خلط ملط ہو گیا ہے کیونکہ کوئی بھی ضبط تحریر آیا ہوا عصری نسخہ ہم تک نہیں پہنچا ہے۔ اس لئے ابو الفقراؒ بابا نصیب الدین غازی کے ''نورنامہ'' بابا کمال کے ''ریشی نامہ'' اور ''روضۃ الرِّیاض'' جیسے معتبر قلمی نسخوں پر ہی تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ کلچرل اکیڈیمی کے اہتمام سے موتی لال ساقی کا ترتیب دیا ہوا کلیات شائع ہونے سے بہت حد تک اس ضمن میں تحقیق کا کام آسان ہو گیا ہے[1]۔

عشق کا الوہی و آفاقی تصور ہو نفس کشی و ترکِ علائق اور ترکِ لذات کا

---

[1] اس سے قبل اکیڈیمی نورنامہ کے نام سے کلام شیخ العالمؒ شائع کرچکی ہے جس سے امین کامل نے ترتیب دیا ہے

معاملہ، حیات ومَمات کے مسائل ہوں یا شیب وشباب کے باریک نکات، دنیا کی بے ثباتی ہو کہ آخرت کا ثبات، حضرت شیخؒ عرف نندہ ریشی نہایت ہی سادگی وسلاست سے اپنے دلکش اور موٗثر انداز میں اپنی وجدانی کیفیات کو شعری قالب میں ڈھالنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

خطیبانہ اور مبلغانہ لہجہ کہیں نمایاں اور پوشیدہ ہے۔لل دید اور نند ریشیؒ جس دور سے تعلق رکھتے ہیں اُس دور یا اُس سے پہلے ادوار کی شاعری کا خطیبانہ لہجہ اُس کے فنی حسن و جمال کی ضمانت تھا۔ حضرت شیخ العالمؒ جو کشمیر میں ریشیت کے بانی ہیں اپنی شاعری میں جو زیادہ تر شلوکوں ہی پر مشتمل ہے۔ ''نندہ'' جسکے معنی حسین وجمیل کے ہیں۔ لفظ ہی کو بطور تخلص برتتے ہیں جسکی بناء پر عرف عام میں انہیں نندرشی کے دلربا نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

اب آیئے ذرا دیکھتے ہیں کہ وہ خالق کائنات کو کس انداز ہ سے سرتاپا، پیکر نیاز ہو کر دیکھتے ہیں

اَکُے خدا، ناوٕ چھُس لَچھا ذِکر رۆس اکھ کِھچا مو
ڈُمبر وبنڈُن اَکُے پچھا رزقہ رۆس اکھ مچھا مو

☆ (اللہ ایک ہے۔ جسکے لاکھوں نام، گھاس کا کوئی بھی تنکا اس کے نام کی مالا جپنے سے خالی نہیں۔ حیات مستعار کو ایک پکھواڑہ سمجھ، کوئی مکھی کوئی کیڑا مکوڑہ رزق کا محتاج نہیں) اللہ کے غیبی عنایات کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں۔

دیُتتھ نرس گورتہٕ ٹُلرس مانچھی دیُتتھ ہَلم ہِلس رونٹھ وٕ چھنس دَچھ
بگہِ پأری چانہِ قدرأ ژے دیتتھ روس کوٗستوری رَچھ

☆ (اے اللہ تونے سرکنڈے کو گڑ، شہد کی مکھی کو شہد اور آہو کو نافہ سے نوازا۔ تیری عنایات کے صدقے جاوٴں)۔

نند ریشی ہر رنگ میں قادر مطلق کے جلوے دیکھتے ہوئے کہتے ہیں محیط وہی کُل ہے جو یہاں موجود ہے وہی وہاں پر بھی ہے وہی ہر جگہ مکین ولامکان ہے وہی پا پیادہ اور رتھ سوار بھی ہے، وہی ہر شے میں آشکار ہو کر بھی پوشیدہ ہے۔

یُس اوس یتہِ سُے چھُے تتے  سُے چھے پرٔتھ جایہِ رٔتھ مکان
سُے چھُے پیادٕ تہٕ سُے چھُے رتھے  سُے چھُے سورٕے گنڈتھ پان

وہی (اللہ) ہے اور وہی (اللہ) ہوگا، اس کے سوا کوئی نہیں موجود۔ اُسی کا نام لے لے کر کے جینا چاہیے۔ وہی سارے ظن واندیشے رفع کرنے والا ہے۔ ارے او میری جان! ذرا سوچ کے ناخن تو لے۔

سُے اوس تہٕ سُے آسے  سُے سُے گری زنہٕ
سُے سأری اندیشہ کاسے  ہے ژُوو پالیس پنہٕ

راہ حق کی عشق نوروی کوئی آسان کام نہیں۔ نند رشی فرماتے ہیں کہ ''میں نے کلمہ لا الہ الا اللہ صدق دل سے تسلیم کیا اور اپنے وجود کو سرتا پا اسی سے الہام کر دیا۔ میں نے وجود کے پنجرے کو چھوڑ کر موجود (اللہ) کو پالیا اور لامکان کی سیر کی۔

لا الہ الا للہ صحی کوٗرُم  وچی کوٗرُم پنُن پان
وجود ترأوِتھ موجود رٔدُم  اِد بہٕ ووتس لامکان

اس کے لئے تمہیں برداشت کرنے کی شکتی لازمی ہے۔ برداشت یا سہن کرنا۔ بجلیاں اور اُن کی کڑک، دن دھاڑے کا اندھیرا، پربت کو کاندھا دینا، ہتھیلی پر آگ لینا، چکی میں پس جانا، وش پینا، گارا نگلنا اور لوہے کے چنے چبانا ہے۔

ژاُلن چھے وزِ ملہِ تہِ ترٹے ژاُلن چھے مندنبن گٹہِ کار
ژاُلن چھے پربس کرنہِ اَٹے ژاُلن چھے منز اتھس ہیوٚن نار
ژاُلن چھے پان کڈُن گرٹے ژاُلن چھے کھیوٚن ویہہ تہ گار

اور پھر اُن کا تصور عشق جسے سراپا درد کہا جاسکتا ہے، قابل توجہ ہے کہ عشق ہے تیز دھار کی تلوار کے دار کو سہنا، آدمی سکھ کا سانس لے بھی تو کیسے؟ عشق نام ہے بھڑ کے چھتے کو زیر داماں رکھنا، راحت نصیب ہو تو کیونکر؟ عشق نام ہے کسی ماں کے اکلوتے بیٹے کے مرنے کا۔ وہ چین سے کروٹ لے تو کیسے؟ جذبات واحساسات کی شدت بیان محسوس کرنے کی چیز ہے، بیان کرنے کی نہیں ؂

عشق چھے تیز کرتجہ درن سُہ ہے چھوکھ ذرے تہِ گٔہی
عشق چھے گنہ تلر ببب بُرن سُہ ہے سوکھ برے تہِ گٔہی
عشق چھے ماجہ کُن پوتھر مرن سو ہے دوکھ برے تہ گٔہی

اس لئے لازم ہے کہ عاشق اپنے دل کو قابو میں رکھے کہ اس کے کوئی ناخوشگوار کام انجام نہ پائے، کیونکہ اگر زہر نہ کھائی جائے تو حلق کی طراوت کہاں سے آئے۔ اگر جایا نہ جائے تو آیا بھی نہ جائے۔ اگر آنکھوں سے دیکھا نہ ہو یعنی بینائی نہ ہو تو پہچان کہاں سے آئے ؟

وودنے گنڈی زِتہِ کاٰم کتہِ نیرے ویہہ نے کھیے تہ سزِ یہہ کتہ پھیرے
یورِ نے گوٚھی زِتہِ تورِ کتہِ نیرے لوٚب نے آسہِ تہِ ووٚن کتہ ییے

بیچ میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو نفس امارہ ہے، جس نے سارے کام بگاڑ دئے ہیں جو شیطان کا مبدّل ہے جس نے عمل کے سارے پُل اُڑا کر بہا دیئے ہیں بلاشبہ میرا نفس دوزخ کا دوسرا نام ہے ؂

نفسن کُرنم ادل تہٕ ودل    نفس میون شیطانس بدل آو
نفسن مالہٕ ٴنہم کریہ ہنٛدی کدل    نفس میون دوزخس بدل آو

بدیں وجہ نفس امارہ کو قابو کرنا جہادِ اکبر ہے۔ جس کے لئے پانچ وقت کی نماز پابندی سے قائم کرنی چاہیئے۔ لذیذ اور میٹھی نعمتوں سے دور ہی رہا جائے تو بہتر۔ ماتم کنان زندگی کے دن بیتے جائیں۔ دنیوی محبت میں گرفتار نہ ہونا ہی لازم ہے۔

پاژن وقتن سجدا دِزے    میوٹھ موٗدُر کھیئے زنہٕ ذات
ماتم ہیتھ دوہ دوہ رزے    دُنیہچ لادن ہیئے زنہٕ ذات

لذات شہوانی، غصہ، لوبھ، موہ مایا اور تکبر و نخوت جہنم کی شعلہ زن آگ ہیں۔ ان سے بچتے رہ۔ عمل ہی سے تیرے دل کا سکون میسر ہے، یہی تمہارا زادِ راہ ہے، اسے ضائع نہ کر۔ حضرت محمدؐ تمہارا خریدار ہے۔ خدا خود ہی عدل کرنے والا ہے یہ سب کچھ جب تیرے حق میں ہے تو پھر کس بات کا غم ہے۔

کام، کرودھ، مُہہ تہٕ مداہنکار چھے    دوزخن نار چھے دِواں بڑاے
کرٛے تہٕ کارن وونداد ار چھے    چندس دیار چھی کرمہٕ ضاے
حضرت محمدؐ ہو ادار چھُے    یتھ وبٗوارس ییہہ پانہٕ خوداے

کیونکہ غصہ ہونا سچے مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ جس سے عمل کی کھیتی جل کر راکھ ہوتی اور من کی ساری پونجی لُٹ جاتی ہے۔ غصہ سے ذات کی ساری ساکھ جاتی رہتی ہے۔

کرٛدَے سوٗد راوی پانس    کرودَے کرٛے تہٕ کارن دزے
کرٛدَے ژٔور پیٚی خزانس    کرٛدمو مسلمانس پزے

اہنکار کو ترک کر، نیاز مندی اختیار کر کے نماز کی پابندی بھی کر، کیونکہ

اے مورکھ وقت کی نماز مسلمان کیلئے ایسی ہی فائدہ مند ہے جیسے لکڑی کے لئے رندہ، جواُسے چھلتا ہے، صاف کرتا ہے اور اُسکا کھردراپن دور کر کے اسے مسطح، خوشنما اور قابل دید بناتا ہے وقت کی نماز بندگی اور بے وقت کی نماز شرمندگی اور خندہ زنی کا سامان ہے۔

وَقتٕچ نماز چھے بندگی وقتٕچ نماز چھے تخٕنس رنٛد

بے وقت نماز چھے شرمندگی بے وقت نماز چھے مُرکھو خنٛد

حساب آخرت پر بھی اُن کو پکا یقین ہے اس لئے تلقین کرتے ہیں کہ اللہ کے عطا کردہ رزق میں سے اللہ کے نام سے بھی خرچ کر، تیرے رزق میں وسعت ہوگی۔ نماز کی پوچھ گچھ تو ہوگی ہی جب وہاں تم سے دانے دانے کا حساب لیا جائیگا۔ تمہاری عقل ودانش کام نہیں آئے گی۔

نماز ہُند چھے پُژنے نیاے سخاوت کرکھ توٕ دِنے کھنٛنے

اَدِ کتھ لگنے فکر تہٕ داے تتہٕ ییلہِ ہنہٕ ہنہٕ حساب ہینٛنے

موت کا احساس بھی نندرشیؒ کے یہاں بہت شدید پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں بھی اُن کے دلائل اور دعاوی قابل داد ہیں۔ فرماتے ہیں کہ سانپ کے ڈسنے سے بچنے کیلئے ہم گز بھر دور بھاگ سکتے ہیں۔ شیر کے حملے سے بچنے کے لئے کوس بھر دور، دین دار سے سال بھر کی مہلت مل تو سکتی ہے، مگر موت پلک جھپکنے کی فرصت نہیں دیتی ۔

سٕہس ژٕلی زے کرٕہس تام سرپھس ژٕلی زے اَسس کھنٛڈس

موتس ژٕلی زِنہٕ اَچھ موٕہس تام دین دار ژٕلی وہرس کھنٛڈس

اور پھر موت شیر کی مانند ہے، اس سے مفر کہاں۔ وہ تو زیوڑ میں سے بھیڑ کی مانند چن کے اٹھالیتا ہے۔ موت کی شربت پئے بنا شفایاب ہونا ممکن

نہیں۔ کاش یہ بات میرے ذہن میں پہلے اتر گئی ہوتی ۔

مرگ چھے ہہہ تہٕ کوٗ توٗ ڈلی زے  کھیلہِ منزٕ کڈی ژأرتھ کھٗ

مرچگ شربتھ چنہٕ روٗس نہ بگی زے  سُلہِ کبتھہٕ نہٕ گیہ اَسی ئرتھ کتھ

حضرت نند ریشی نے اپنے زمانے کے کرب کو اپنے تجربات میں نہایت ہی بلیغ اور موثر انداز میں سمویا ہے۔ شعری تجربہ کیا ہے ایک وجدانی کیفیت کو ایسے پیکر کا روپ دیا گیا جو اپنی وضاحت آپ فرماتے ہیں۔ ''میری کایا چندن کی لکڑی سڑ گئی۔ میں (ڈُلڈُل) گھوڑے پہ سوار اور اس نے میری ہاتھ لی ہوئی باگ چبا ڈالی ہے۔ یہ تو میری دنیوی حالت ہے جہنم کی آگ سے نجات کا کیا راستہ؟ اندھا راستہ بھول گیا۔ میری جان یہ بات ذرا دل میں اُتار ۔

دارس زژر ژام ژنڈئنس  سوارس ڈُلڈُل آم وگ ٹکانو

نارس کیا کرٕ تتھ دوزٕ ژنس  وتھ رأو أنس ژین تہٕ میانہِ پانو

ایک شلوک میں ارشاد ہوتا ہے کہ سونے اور پیتل کی چمک ایک جیسی دیکھ کر میری جان نڈھال ہونے لگی۔ جب میں نے یہ دیکھ لیا کہ سندرتا کے مالک لوگ پاؤں تلے روندے جاتے ہیں اور مورکھ شادمان، تو میں نے دور جا کر بن باس لینے کی ٹھان لی۔ کھرے کھوٹے میں تمیز نہ کرنے کا کرب اُن سے سہا نہیں جاتا ۔

سوٗنس تہٕ سرتلہِ اَکُے زلن  تہٕ ڈیشتھ زومیون کلُن ہیوٗت

ڈیوٹھم نند بن لیُتھ تہٕ ڈھین پھولن  توے مےٚ اندون ژلن ہیوٗت

دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا گیا ہے۔ ''یُس کرِ گونگل سُے کرِ کرٕ او'' (جو بوئیگا سو کاٹے گا) میں بھی عرفان ذات کے لئے ضبط نفس کے مختلف مراحل کی نشاندہی کی گئی ہے جس میں ہَل اور بیلوں کی جوڑی کو علامت کے طور برتا گیا ہے۔

بیج اور دوسرے آلاتِ کشاورزی کے ساتھ ساتھ حبسِ نفس اور دیگر ذکر واذکار کا ذکر نظم میں کیا گیا ہے۔ گو کہ اس کی زبان اور موجودہ کشمیری زبان کے روزمرہ میں بعدِ زمانی کے باوجود بہت کم فرق ہے۔ پھر بھی اسے حضرت شیخؒ کے کلام سے کوئی الگ تخلیق سمجھنا مناسب نہیں لگتا۔ کشمیری زبان کے ایک اور ممتاز شاعر پرمانند نے ''سنتوش بیالہِ بووِ آنندِ پھل'' (سنتوش کے بیج۔ سے آنند پھل مل سکتا ہے) لکھ کر اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ نظم اُن تخلیقی کوششوں کی ایک کڑی ہے جنہیں کشمیری شاعری میں موضوعی نظم کی بجا طور شروعات کہا جاسکتا ہے۔

حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ تو اس بات کو ابتدا ہی سے ذہن نشین کر کہ تیری بالی عمر ہی بہار کا موسم ہے اسلئے قبل از وقت اپنے ہاتھ میں مال (آلات کشاورزی) رکھ، ایسا نہ ہو کہ تو پیچھے رہ جائے کیونکہ بہار ایک چھل ہی تو ہے۔ جو ہل جوتے گا وہ پھل کاٹے گا۔

بروُنٹھ گرِ رُت مال پنُنے تھاو آدن سونتھ چھے شین اول تےَ
یُس کرِ گونگل سُے کرِ کراو پتھ یتھ نہ گوھکھ سونتھ چھے ژھل تےَ

''کشمیری بان اور شاعری'' میں کشمیری زبان کے صف اول کے نقاد اور تذکرہ نگار عبدالاحد آزاد بجا طور پر للہ واکیہ اور کلام شیخؒ کا تجزیہ کرتے وقت لکھتے ہیں کہ ''یہ شاہکار کشمیری شاعری کا سنگ بنیاد نہیں بلکہ کشمیری صحیفۂ ادب کا آخری باب ہیں''۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہمیں ان کے کلام میں ادب وشاعری کے آفاقی تصور کے ترکیبی اجزا نہیں ملتے۔ چھ صدیاں گزر جانے کے باوجود ہمیں اُن کی شاعری کے بعض ابواب میں بعد زمانی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ عقائد پر مبنی اُن کی شاعری کی قدامت تسلیم، مگر موجودہ عہد سے مناسبت اُن کی تخلیقات میں پوشیدہ فنی اعجاز ہی کی دین ہے۔ حضرت شیخؒ ایک شلوک (شُرک) میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ''میں یہاں اس دنیا میں آیا تو تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ

کدھر جاؤں پیچ دوراہے کے، ہم حقیرسی مخلوق اُسکی (اللہ کی) مشیت میں کیا دخل دے سکتے ہیں جس کے ہاتھ میں ہماری تقدیر ہے۔ اور یہ دوراہا انسانی زندگی کے بے نام و بے منزل سفر سے عبارت ہے جو ہمارا مقصد ہی تو لگتا ہے۔

آیاس یۆت تہٕ گوٚھو کوٚتو  زوٗنم نہٕ منزٕ ماد وۏت بوٚوے
تس کیا کرو اُسی للہِ پوٚتو  یَس اَتھِ سون لگُھت بوٚوے

## وفات

حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ ۸۴۲ھ[1]/۱۴۴۱ء میں تریسٹھ سال کی عمر میں مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ زین العابدین (بڈشاہ) کی تخت نشینی کا اس وقت تقریباً بائیسواں سال تھا اُس کی زیارت بڈشاہ ہی نے بنوائی تھی جو بعد میں آتش ناگہانی میں شہید ہوئی اور جس کی تعمیر نو پٹھان گورنر عطا محمد خان نے کی جس نے بعد میں ان کے اور حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کے نام سے ۱۲۲۶ھ میں ایک سکہ مشترکہ طور رائج کیا جس کے رو پر ''سکہ شد روشن زہ شاہ نورالدین''[2] عبارت کندہ ہے اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضرت شیخ العالمؒ عوام و خواص میں کتنے مقبول و محبوب تھے اور اُن کی عہد ساز و تاریخی شخصیت کے معترف وقت کے فرمانروا بھی تھے۔

آسماں گوید زمیں را مرحبا  باتوام چوں آہن و آہن رُبا

(مولانا رومؒ)

---

[1] حضرت شیخ کے سال وفات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ ۸۰۸ھ، بعض ۸۲۰ھ اور بعض ۸۲۵ھ بتاتے ہیں۔ مورخ حسن نے حضرت شیخ کے ہم عصر مورخ ملا احمد کی تاریخ وقائع کشمیر کا حوالہ دیکر انکے انتقال کی تاریخ ۲۶؍رمضان ۸۲۰ھ لکھی ہے جو زیادہ بعید لگتی ہے۔ [2] سکہ شد روشن زشاہ نورالدین رائج از مخدوم قطب العارفین، تلاش از محمد یوسف ٹینگ ص ۸

# ریشیت اور رہبانیت

ما ز آغاز وز انجام جہاں بے خبر یم
اول و آخرِ این کہنہ کتاب افتادہ است

ازل و ابد کی پُر اسراریت اور کائناتِ رنگ و بو کی لامتناہی نیرنگیاں موضوعی اور معروضی دونوں لحاظ سے نوعِ انسانی کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہیں۔ سائنس ہو یا مذہب فلسفہ ہو یا منطق رہروانِ جادۂ عشق کو جہانِ بوقلموں کی ابتدا و انتہا سے کوئی غرض نہیں کیونکہ اقلیمِ عشق کی سرحدیں لامحدود ہیں اور طائرِ سوزِ وجدان کو سیمیائی فضاؤں کی وسعتوں کو پھاندتے ہوئے مسلسل محوِ پرواز رہنا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

خالق کائنات کا شاہکار بنی آدم ہے، شاید اسی لئے تخلیق آدم پر عزازیل کو اُسے سجدہ کرنے کو کہا تھا جس سے وہ انکاری ہوا اور تا ابد مردُود۔ آدم کو بہشت ازل میں شجر ہوس کے قریب جانے سے ممانعت کی گئی۔ لیکن ابلیس اپنا کام کر گیا اور اُسے بھی جنت سے نکلوانے میں کامیاب ہوا جب سے یہ دونون ابلیس و آدم باہم دست و گریباں ہیں۔ نیکی و بدی کا یہی ازلی اور فطری تصادم اعلیٰ و ارفع جمالی قدروں کی جان ہے۔ شاید اسی لئے اقبال

---

۱؎ ریشیات: شیخ العالم شش صد سالہ تقریبات کمیٹی: کلچرل اکادمی ۱۹۷۸ء ص: ۲۸۔۱۹۹: ایڈیٹر: رشید نازکی

نے ایک اور جگہ فرمایا ہے۔

اُسے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے میرا

زندگی ایک جہد مسلسل ہے اسے جب ہی کامیاب قرار دیا جاسکتا ہے کہ جب من بدن کی خواہشاتِ نفسانی کی آماجگاہ کو اپنے بس میں کیا جائے اور اپنی سیمیائی متصادم اور پُر اسرار ذات میں مضمر ابدی نُور کی شعاعوں کو قابو کیا جائے۔ عرفان ذات کا یہی فطری جذبہ ہے، جو انسان کو حُسنِ خلق، تہذیب نفس، تدبر و تحمل، زہد و اتقا جیسے انسانی صفات کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ جن سے آج تک ہماری دنیا کا سارا نظام انتشار و انفعال سے بچتا آیا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ مختلف ادوار میں ہماری کج فہمی و کج بینی کی وجہ سے بنی نوع انسان کے قدم لڑکھڑائے لیکن پھر بھی یہ کاروان آگے ہی بڑھتا گیا اور یہ سلسلہ آئیندہ بھی جاری رہے گا، باوجود اس تلخ حقیقت کے بھی کہ کثرت تعبیر سے خودنگری کے حسین و جمیل خواب کے منتشر ہونے کا کھٹکا ہر وقت لگا رہتا ہے۔

وہ اور آرائش خم کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

برصغیر ہند مختلف تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ یہیں سے علم و دانش کے ابتدائی سرچشمے پھوٹے۔ یوُنان پہنچتے پہنچتے عرب جا پہنچے۔ اُپنشدوں، ویدوں، پوُرانوں اور بدھ مت کے چشمے یہیں سے اُبلے۔ سکھ مت کی آبیاری بھی یہیں ہوئی۔ اشاعت اسلام سے یہاں کی تہذیب و ثقافت اور مدنیت کو نئی جہتیں عطا ہوئیں۔

ترک لذات کا سلسلہ بہت قدیم نہ سہی لیکن جوُں جوُں انسان کو آدابِ مدنیت آئے توں توں تہذیب نفس اعلیٰ معیاروں نے جنم لیا۔ عہد بربریت میں بھی

متنوع قربانیوں کے ذریعہ انسان اپنے تئیں فطرت میں سے تراشے بتوں اور خداؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دنیا کی مہذب قوموں کے دیو مالائی ادب کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی انداز وہوسکتا ہے کہ کس طرح گوناگوں ومافوق الفطری کردار تخلیق کر کے سیماب طبعیت انسان نے سکون قلب حاصل کرنے کی ان تھک کوششیں کی ہیں۔ انسان نے سب سے پہلے گپھاؤں، درختوں اور پتھروں کی چھاؤں میں مزاج فطرت کی سفاک نیرنگیوں سے بچنے کے لئے پناہ لی۔ مدنیت کے آداب سیکھنے کے بعد اُس نے بستیاں بسائیں اور پھر گپھاؤں جنگلوں اور بیابانوں کی راہ لی تا کہ وہ مہذب بنے اور خالق کل کی پیدا کردہ دنیا کو انتشار واضطراب سے بچایا جاسکے انسان زاہدوں، عابدوں، قلندروں اور راہبوں کو ''بابا'' کے محبوب ومرغوب نام سے پکارتا آیا ہے۔ ''بابا'' کا لقب اپنا سفر کہاں شروع کرتا ہے۔ یہ بتانا قدرے مشکل ہے کیونکہ اسے بیک وقت کلیسا کے پادریوں سے لیکر ہمارے یوگیوں اور سنیاسیوں کے لئے برتا گیا ہے۔ سنسکرت میں اس کا ''ویرا'' یا ''ویرہ'' دِکھایا گیا ہے۔ ''رشی'' لفظ اصلاً سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی تارکِ دنیا عابد اور تلاش حق میں ہمہ تن ریاض کے ہیں اب یہ بات عیاں ہوگئی ہے کہ ریشیت اُس عارفانہ زہد و اِتقا اور وجدان ربانی میں سرمستی کے ہیں، جسے عرفان ذات اور خالق کائنات کُل کے صفات سے قربت نصیب ہو۔ ہندوستان میں سادھوؤں اور ریشیوں کے قطعۂ دلپذیر کو آج بھی آشرم کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی وہ آشرم ہیں جنہیں ہندوستان کے ذہنی وروحانی سفر میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ جنگلوں اور دلپذیر پہاڑی خلوت گاہوں کی اہمیت بھی مسلم ہے چنانچہ اس ضمن میں کہا گیا ہے:۔

"The ASRAMAS OF RSIS Were the centres for Development of philosphical thought in india ............!

The part played by the forest in the evolution of Indian thought has deservedly received recognition in modern times"[1]

ادھر نیل مت پُران میں اسی بات کو یوں بیان کیا گیا ہے۔ کہ جلو بھو کے مٹ جانے اور ''ستی سر'' کے خشک ہونے کے بعد یہاں کشمیر میں ناگاؤں کے مروجہ رسوم کے مطابق مندر استھاپن تعمیر ہوئے۔ رشیوں، مُنیوں کے متاعِ بے بہا یعنی تزکیہ نفس سے متعلق صریح اشارے بھی وضاحت طلب نہیں:-

''Aferwords, other Gods, erected their Hermitages, each one separately, in the lake or on the waterless place. The sages whose wealth is penance erected Hermitages, and the rivers created several places of pilgrimage. So did the gaudharvas, the Apasaras, the Taksas and the mountain kings along with the Guhyakas"[2]

قدرت نے کشمیر کی وادیٔ گلپوش جنت قطعہ ارضی کو فلک بوس پہاڑوں مرغزاروں برف پوش چوٹیوں اور جنگلوں سے اس طرح گھیرے رکھا ہے کہ جیسے صناعِ ازل نے اسے عبادت گذاری اور خدا شناسی کا قطعہ دلپذیر چنا ہو، شاید یہی وجہ ہے کہ اسے پہلے شیو بھومی، پھر بودھی ستوہ استھاپن اور اب ریشی باڑی یا پیر باڑی (ریش دأ ر، پر دأ ر) ہونے کی سعادت حاصل ہے کنشک کے عہد میں یہاں چوتھی بودھ کونسل منعقد ہوئی اور مہاتما گوتم بدھ کے زریں اقوال کو سنسکرت زبان میں تفسیر کے ساتھ جاری کیا گیا، یہ اقوال تابنے کی تختیوں پر کندہ کرائے گئے۔ ناگ ارجن، ناگ سین و دیگر ایسے بودھ مفکرین کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔ بودھ بھکشو یہیں سے بودھ صداقت وعرفان کا

---

[1] History of philosophy Eastern and Western

[2] The nilamata purana:vol 2nd :P: 51

ابرِ گوہر بار بن کر چین و دیگر ممالک پر خوب برسے۔

اُن سیماب پا شخصیات میں کمار اجیوا، دھرمہ یشا، گنہ ورمن، پنیا یاترا خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جنہوں نے یہاں سے اُٹھکر دور دور تک عرفان کی فضاؤں میں اپنے رُوحانی کمالات بکھیر دیئے۔ چنانچہ کشمیر کی علمی سیاحت کو عزت و توقیر کی نظر سے بڑھانے کے لئے چن ہن چی مانگ، فاہیان، ہیون سانگ سوان ہے اور اوکانگ ساتویں، آٹھویں صدی کے آس پاس یہاں تشریف لائے ہیں اور یہاں کی مدنی، معاشرتی اور مذہبی زندگی کا بغور جائیزہ لیتے ہیں۔ اسی دوران یہاں (کشمیر میں) شیومت کی تجدید شروع ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ سرکاری عدم سرپرستی کی وجہ سے بدھ مت کا زور گھٹنے لگتا ہے، نویں صدی عیسوی میں واسوگپت شوسوتروں سے کشمیر مین جدید شومت کی بنیاد ڈالتا ہے جس پر بھٹ کلٹ سومانند، اَبھنوگپت، اُتپل دیو اپنی ذہانت وخلاقی سے اپنے رُوحانی تصورات کی بلند وارفع عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ کشمیر شومت کی تجدید میں بدھ مت کو بڑا دخل ہے، کیونکہ اس کی برکت سے اسے ذات پات کی غیر فطری درجہ بندی سے اپنا دامن چھڑانے کی ہمت ہوئی کیونکہ بدھ مت کی اساس ہی انسانی مساوات پر ہے۔ اس نے عبادات میں روا رکھے گئے بندھنوں کو بھی توڑا اور مایا واد سے بھی نجات پائی۔ یہ کچھ ایسے اقدام تھے جو یہاں کی بودھ آبادی کو قابل قبول ہو سکتے تھے۔ کشمیر شومت کثرت سے وحدت کی طرف بڑھا اور ادویت واد (Monoism) کی بنیادیں استوار ہوئیں جس کے عناصر ترکیبی اِگمہ شاستر، سپند شاستر اور پریہ بجنیا شاستر کہلاتے ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں اَبھنوگپت آچاریہ جنہیں کشمیر شومت کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے جنہیں فلسفی اور مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ ناٹہ شاستر کے مفسر کی

حیثیت بھی حاصل ہے۔ اپنے بارہ سو چیلوں سمیت بیرو کی گپھا کی راہ دنیا کو چھوڑ کے چلے جاتے ہیں۔ چین، ایران و عرب کے ساتھ کشمیر کے رشتے تجارت و سیاحت کی حدود تک قائم تو تھے ہی، لیکن چودھویں صدی عیسوی تک یہ تعلقات سیاسی اور معاشرتی سطح تک اتنے بڑھے کہ یہاں کے سازگار ماحول میں اشاعت اسلام کا سلسلہ زور و شور سے شروع ہوا، اور والیٔ تبت کا بیٹا شہزاد رینچن، سید شرف الدین بلبلؒ کے ہاتھوں دائرہ اسلام میں آیا۔ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ شومت اکثریت کا مذہب نہیں بلکہ یہ ایک برہمن طبقہ تک محدود تھا۔ جس کی وجہ سے دائرہ اسلام میں پہلے پہل نادار بودھوں اور پسماندہ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے شمولیت کی۔ سید شرف الدین بُلبلؒ نے اپنے زورِ بیان حسنِ اخلاق سے اسلام کی روح پرور تحریک کو شاہی محلات میں پہنچا دیا۔ اور حضرت شاہ ہمدانؒ نے اسے وادی کے دور دراز علاقوں تک عام کیا۔ لیکن اُن سے قبل جن کشمیری مبلغوں نے تبلیغ کا کام ہاتھ میں لیا تھا، اُن میں سے اکثر گمنامی کے عالم میں ہی رہے۔ مگر ریشیت کے مسلک پر رہ کر اپنی زندگی گزاری:

علم تصوف کی تاریخ میں بھی بہت سے حوالے ایسے درج ہیں جن سے ہمارے مؤرخ یہ ثابت کر چکے ہیں کہ مادی لذات سے کنارہ کش ہو کر عرفان حاصل کرنا بہت آسان ہے۔ چنانچہ عہد نبویؐ میں کبھی اصحاب صفہ کی اور کبھی جناب آنحضور صلعم کے باطنی مصاحبین کی سی زاہدانہ زندگی بطور ثبوت پیش کی جاتی ہے۔ بلال حبشیؓ، بلال رومیؓ، سلمان فارسیؓ اور اویس قرنیؒ کے طریقہ سلوک سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ کہ ریشیت اصل میں قرون اولیٰ ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب ہم اموی عہد حکومت سے عباسی خلفاء کے ابتدائی دور پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور کے صوفیائے کرام اگرچہ

کلیتاً تارکِ الدنیا نہ تھے لیکن پھر بھی وہ عام طور دنیاوی جاہ وحشم سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ الٰہی فیوض وبرکات کا نتیجہ ہے کہ اکثر ایشائی اور افریقی ملکوں میں اسلام کی مشعل روشن ہوئی۔ مسٹر آرنلڈ کی شہرۂ آفاق کتاب Preaching of Islam کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ لوگوں کے رشد وہدایت کیلئے جو رول شہشاہوں کی تلواروں اور عسکریت ودبدبے سے ادا نہ ہوسکا۔ وہ اولیائے اسلام نے محض اپنے خلوص، اخلاق اور بے لوث نفس کشی سے آسانی کے ساتھ کر دکھایا۔

ہر قوم کا اپنا مزاج ہوتا ہے جو اپنا الگ تاریخی، لسانی اور تمدنی پس منظر لئے ہوتا ہے، قبل از اسلام یہاں کے غیر مسلم بزرگ ہستیوں کو ''ریشی'' کے پیارے نام سے پکارنے کا چلن قدیم ہے، کشمیری تاریخ کی شروعات ہی کشپ رشی کے نام سے ہوتی ہیں۔ یہاں کے ریشیوں کے تین گروہ تھے اول دیو ریشی، دوم برہم ریشی، سوئم راجہ ریشی یا رازہ ریشی۔ اسلئے فروغ اسلام کے بعد یہاں مسلمانوں کی بزرگ ترین ہستیاں بھی ریشی کہلائیں[1]۔ یوں تو شیخ نورالدین ریشیؒ سے پہلے بھی تبلیغ اسلام کا سلسلہ جاری تھا لیکن ریشیت کو نئی جہتیں عطا کرنے میں اُن کی دیو پیکر شخصیت اولیت رکھتی ہے وہ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو اپنے عارفانہ کلام سے لوگوں کے دلوں میں جاگزین کیا۔

لا رہبانیۃَ فی الاسلام: اسلام میں رہبانیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں پیغمبر آخرالزمان ختم المرسلین کی حیات طیبہ جہد وعمل، زہد واِتقا حسن خلق کا اعلیٰ ترین مرقع ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اسلام ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت سے نہ پھیلتا۔ قرآن کریم میں اپنے نفس پر فطری بساط سے زیادہ بوجھ نہ ڈالنے کی

---

[1] ابتدائی ریشی سلسلے کا ایک تاریخی جائزہ پروفیسر محی الدین حاجنی۔ علمدار صفحہ ۲-۳

تاکید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ہم کسی پر اس کی بساط سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور نا ہی تمہیں اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ اذیت دینی چاہئے یہ وہ بنیادی فرق ہے جو اسلام کے فطری تصور حیات کو اُجاگر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دنیا کی جملہ مخفی و آشکار النعمتوں سے فیضیاب ہونے کے لئے انتھک جدو جہد کی ترغیب دیتا ہے۔ رزق حلال کو عشق خداوندی و مہذب زندگی کے لئے اولیت دی گئی ہے دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنا اسلام کی بنیادی روح کے عین منافی ہے، چہ جائیکہ کوئی ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور محبت الٰہی کا دعویٰ کرے۔ ازدواجی زندگی سے کلیتاً کنارہ کش ہونے کے لئے بھی کوئی جواز نہیں۔ ہاں تو نفسانی خواہشات، بہیمی صفات کو اپنے بس میں کرنے کے لئے نماز، روزہ وغیرہ جیسے اسلامی مبادیات کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ عبادتِ الٰہی کے ساتھ ساتھ اطاعت رسول بھی ضروری ہے ارشاد ربانی ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ!

''یا محمد اُن سے کہہ دیجیے کہ اگر خدا کے ساتھ تمہاری محبت کا دعویٰ سچا ہے تو میری تابعداری کرلو'' قرآن کریم کی دوسری سورہ کی پہلی آیت ہی خدا سے ڈرنے اور متقی بننے کی طرف صریح اشارہ کرتی ہے۔ آلـم. ذالک الکتاب لاریب، ج فیہ ھدی للمتقین ۔۲۔ آلم یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں کہ (کلامِ خدا ہے) خدا سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے حقانیت الٰہی سے قرب حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ: وما امرو الّا لیعبدو اللّٰہ مخلصین لہ الدین حنفآء ویقیمو الصّلٰوۃ ویوتو الزّکٰوۃ وذالک دین القیمۃ پارہ عمہ۔ البنیۃ آیۃ (۵) یعنی لوگوں کو اس بات کا حکم دیا گیا کہ اخلاص عمل کے ساتھ اللہ کی بندگی اختیار کریں۔ (اور

ایک سو ہو کر) نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی سچا دین ہے۔ اس سے یہ مراد نہ لیا جائے کہ دنیوی اور عملی زندگی (جس میں رضائے الٰہی شامل ہو) سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ ہاں تو جاہ وحشم، مال واولاد، عیش تنعُّم سے احتراز بھی لازم ہے۔ خشوع وخضوع کے بارے میں حدیث نبویؐ ہے کہ ''نماز اس طرح پڑھو کہ گویا تم دنیا سے جا رہے ہو۔''

پارہ عمہ سورہ ''عبس'' میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یوں مخاطب ہے اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور جی کو خواہشوں سے روکتا رہا اُس کا ٹھکانا بہشت ہے (آیات۔ ۴۰۔ ۴۱)

واَمَّا من خاف مقام ربہٖ ونہی النَّفس عن الھوای (۴۰)

فانَّ الجنَّة ھی الماوٰی (۴۱)

یہ ہے اُس ریشیت کا تاریخی، تمدنی اور اِمتزاجی لیکن اجمالی پسِ منظر جس کے میرِ کارواں شمس العارفین حضرت شیخ نورالدین ولیؒ ہیں اور جن کی حیات طیبہ ریشیت واسلامی زہد و اِتقا کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ وہ سیروفی الارض کے قائل رہے، انہوں نے کہیں اپنا ٹھکانا نہ بنایا۔ ٹھکانا بناتے تو ایک ہی جگہ رُکتے جو ایک رحمت کی دھارا کی فطرت کے خلاف عمل کہلاتا۔ ان کے سیمابی نقشِ پا ہر طرف بکھرے ہیں جو آفتاب ومہتاب بن کر ہماری تاریک راہوں کو منور کئے ہوئے ہیں۔ حضرت شیخ کی عارفانہ و مجتہدانہ افتادِ طبع ہر رُکاوٹ کو پھاندتی، روندتی چلی، انہوں نے ماِمتا کو ٹھکرایا، پدرانہ شفقت کو آڑے آنے نہ دیا، ازدواجی زندگی سے دامن جھاڑا اور جادۂ عشق کی طرف والہانہ بڑھے۔ شیویوگی لل دید بھی اسی ڈگر پر چل کر ذاتِ کل سے جا ملی تھیں۔ چنانچہ وہ خود بھی ایسے ہی جامِ معرفت کے لئے اللہ تبارک اللہ

کے سامنے دستِ سوال بلند کرتے ہیں اُن کی دعا قبول ہوئی اور وہ بھی منزل عشق کو جالئے ۔

رہرواں را خواستگی راہ نیست
عشق ہمراہ است وہم خود منزل است

رہے خامکارانِ راہ محبت ، نام کے سنت سادھو، نفس پرست اور بوالہوس صوفی وکلاء اُنکے بارے میں مولانا رومؒ فرما گئے ہیں ۔

برسماعِ راست ہرکس چیر نیست
طعمہٗ ہر مرغکے انجیر نیست

☆☆☆

# راجہ میگو اہَن

اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ حیاتِ انسانی خاصکر قدیم انسان کی زندگی اساطیری کہانیوں اور مافوق الفطرت کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ ہم اپنے قدیم تہذیبی خدوخال کا نظارہ نیل مت پوران کے دیو مالائی جھروکوں سے کر سکتے ہیں۔ کشمیر نہ صرف قدرتی نظاروں اور فطرت کے حسن فراواں کیلئے مشہور ہے بلکہ یہاں کی ثقافت کے بانیوں میں عدل گستر راجاؤں اور شہنشاہوں کے دوش بدوش مابہ الامتیاز و خلاق شعراء، فلسفی، مؤرخ اور اطباء بھی گزرے ہیں جنہوں نے ہماری ثقافتی فضاؤں کو اور وسیع تر کر کے کشمیر کے نام کو درخشندہ و تابندہ کر دیا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ کسی بھی قوم کی تہذیبی عظمت کے مظاہر فلک بوس عمارتیں نہیں بلکہ خلاق و ذہین دانشور ہیں تو ہمیں کلہن پنڈت پر بجا طور پر فخر ہونا چاہیئے کہ اُس نے ہماری قدیم تاریخ کو اعلیٰ پایہ آفاقی و عالمگیر شاعری کا روپ دیکر نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ جاوداں بھی بنا دیا۔ موضوعی اور معنوی اعتبار سے متضاد متخالف ہونے کے باوصف یہ برصغیر ہند کی اولیں تواریخ میں اپنا مقام پا چکی ہے۔ وادیٔ کشمیر کا قطعہ بہشت ارضی اس حیثیت سے بھی خوش بخت ہے کہ اسکی تواریخ ضبط تحریر میں آئی ہے۔

راجہ آریہ رائے (جے یندرا) سنتالیس سال حکومت کرنے کے بعد تارک الدنیا ہو کے بُمہ زُو کی گپھا میں اپنے چیلوں سمیت غار نشین ہوا، جسکی وجہ سے آج بھی بُمہ زُو کی گپھا کو غارِ آری رائے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ راجہ آریہ رائے (جسے یندرا) کی شرافت نفسی اور خلوت پسند و سکون جو یا اُفتادِ طبع کی

وجہ سے رعایا کو بھی آرام میسر نہ ہوا اور نہ ہی امور سلطنت میں کوئی بہتری آئی۔ اس لئے وہ بالآخر''ایک اداکار کی حیثیت سے حکومت وسلطنت کے سٹیج پر مدت مدید کے لئے فخریہ رول ادا کر کے چل دیا۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ تخت وتاج چھوڑنے تک بھی تماشہ بینوں کی دلچسپی کا مرکز رہا''۔

"Like an actor while i played my part proudly for a long time, upon the stage of the realm ......unto the very Denouement the spectators fortunately did not loose interest"۱

زندگی ایک سٹیج ہے اور ہم سب اسکے اداکار ہیں کلہن کی جادو بیانی کی وجہ سے جملہ انسانی کوتاہیوں کے باوجود کشمیر کے راجے مہاراجے پست فطرت پیکروں کے رُوپ میں ہمارے سامنے نہیں آتے۔

کلہن میگھواہن کو گوانداخاندان کی اولاد میں شمار کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ قندہار کے بادشاہ کی سرپرستی میں یدھشٹر کا بڑا پوتا گوپادِتیا رہتا تھا تاکہ وہ اُسی کی رہنمائی میں سلطنت کشمیر کو اپنے زیر نگین کرسکے۔ قندہار میں اپنے قیام کے دوران اسکے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جو کئی ناقابل تسخیر الوہی صفات کا مالک تھا۔

> For this time the great son of Yudhisthira named gopaditua was kept as a prostage with a view to gain victory over the sovereign of kashmir by the king of Gandhara . This prince while residing there with out securing imperial power in course of time had a son who had the infallible divine marks۲

گوپادِتیا کا یہی جوان بیٹا پریاگ جیوتشا کی شہزادی امرت لیکھا کے

---

۱ Kalhans Rajatrangni:-Tarang ii 156 Eng. Translation:R.S.Pandit

۲ Ibid : v : p 145- 146

سوئم ور کی رسم شرکت کرتا ہے، جہاں شہزادی امرت لیکھا اُسے شوہر کے طور چن لیتی ہے۔ اسکے سر سایہ ابر کا ہونا اس کے نظر انتخاب کا مرکز بنتا ہے۔

That truth at the behest of his father proceeded to the REALM of the ruler of pragjyotisa descended from the line of visnu during the srayamavara of his maiden daughter . There with the parosol Varuna to shade him in the presence of rajas the Royal maiden Amritalekhe honoured him with the garland of the chosen one۲

......انہی آسمانی صفات کی بناء پر راجہ آریہ رائے کی رعایا میگھواہن کے ابر گوہر بار کی منتظر تھی۔ آخر کار وہ گھڑی آن پہنچی جب اس کے وُزراء اسے کشمیر آ کے گدی سنبھالنے کی دعوت دیتے ہیں اور اسطرح وہ چوبیس قبل مسیح میں تخت نشین ہوتا ہے۳۔ مورخ حسن میگواہن کے بارے میں رقمطراز ہے کہ ''می گویند کہ سایہ ابر ہمیشہ برسرِ او بوقتِ بارش کالای اوتر نمی شُد۔ موجب آں اورا میگواہن می گفتند'' میگ بمعنیٰ ''ابر'' داہن بمعنیٰ ''سواری'' یہ دونوں لفظ سنسکرت زبان کے ہیں۔ ژنداوستا اور پہلوی زبان میں بھی بادل یا ابر کے لئے میغ برتتے تھے۔ ''بادل کی سواری'' ہونے کے کارن وہ بارش کی صعوبتوں سے بچ جاتا تھا۔ یہی ہے وہ درویش صفت عدم تشدد کا پیکر ہے۔ جو چونتیس سال کشمیر پر حکومت کرتا ہے۔

دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر یہاں بھی حیوانی قربانیوں کے دوش بدوش انسانی قربانیوں کا رواج تھا۔ میگواہن نے پہلی بار چوپائیوں کو ذبح کرنا ممنوع قرار دیا۔ بدھ مت کے عروج کے باوجود یہاں گاؤ کشی

۱ وشنو پران کے مطابق پراگ جوتشا آج کے آسام کی راجدھانی تھی۔

Kalhans Rajtarangni:Tarang ii v: 147. 148: Eng Translation R.S .Pandit ۲

۳ مؤرخ حسن اسے سن جلوس ۳۴ مانتا ہے۔

جاری تھی ۔ اس بات کا جگہ جگہ اعلان کیا گیا کہ گاؤکشی و دیگر چوپائیوں کو ذبح کرنا قانوناً جائز نہیں ۔ قصائیوں اور گوشت کا کاروبار کرنے والے دوسرے لوگ بے کار ہوئے میگھواہن نے اُن پر جبر و ظلم روا نہیں رکھا، اس نے انہیں اپنے خزانے سے روپیہ پیسہ فراہم کیا تاکہ وہ روزگار کے دوسرے ذرائع تلاش کرسکیں ۔ رہے دیوی دیوتاؤں کے نام چڑھاوے، اُن کیلئے مکھن میں ڈبوئی ہوئی حیوانی پتلیاں جائز قرار دی گئیں ۔ یہی نہیں کسی بھی جاندار کے درپئے آزار رہنا عدم تشدد کے اصول کے خلاف عمل تصور کیا گیا ۔ میگھواہن کے عہد کو بجا طور پر عدل وانصاف کا عہد قرار دیا جاسکتا ہے ۔ وہ بھیس بدل کر رعایا کی عام زندگی اور ملکی حالات کا جائزہ لیتا تھا ۔ ایک دن ایسے ہی گشت کے دوران راجہ کے کانوں میں زور سے چورا چور! کی آواز آئی ۔ کوئی حاضر ہے جو چور کو پکڑے؟ راجہ نے حکم دیا ۔ شوروغل تو تھم گیا، لیکن کوئی چور نظر نہ آیا ۔ اور کئی دن گزرنے کے بعد راجہ کا پھر وہاں سے گزر ہوا ۔ تین پری چہرہ عورتیں اُس کے سامنے نمودار ہوئیں اور دست بستہ التجائیں کرنے لگیں کہ ''اے جہاں پناہ! عفو و رحم کے پیکر، تمہارے ہوتے ہوئے خوف ودہشت کا وجود باقی رہنا محال ہے ۔ اس وقت جب ہمارے ناگا شوہر بادل کی صورت فضاؤں میں پھیلے تھے، تو کسانوں نے صرف اس خوف سے کہ کہیں وہ اُن کی فصلوں کو نقصان نہ پہنچائیں چور چور! چلانا شروع کیا ۔ آپ کے چین بجبیس ہونے پر انہیں گرفتار کیا گیا ۔ کیا ہم یہ امید کرسکتے ہیں کہ اب وہ رہا کئے جائیں گے ۔ ناگاؤں کی پری وش بیویوں کی فریاد سُن کر راجہ میگھواہن کا دل پسیج گیا اور اس نے اُنکی رہائی کا حکم دیا[1]۔ ازاں بعد راجہ میگھواہن تشدد ظلم و جبر اور اذیت پسندی کا قلع قمع کرنے کیلئے، سلطنت کشمیر کی سرحدوں کو پھاندتے ہوئے برصغیر ہند ولنکا کو مطیع

[1] Raj Tarangni :Kalhan Eng.Taranslation.R.S.Pandit iii v 21to 25

کرنے چلا۔ اسکے قدموں کو کامیابی و کامرانی نے چوما، جہاں کوئی اس سے منحرف ہوا تو وہ قدرت کے ہاتھوں زمین بوس ہوگیا۔ یہ ہے اپنے آپ اپنے نفس پر قابو پانے اور فتحیاب ہونے کی کرشمہ سازیاں، جو راجہ میگواہن کے عزم صمیم میں جلوہ گر ہوئیں۔ ایسی ہی عدم تشدد پر مبنی مُہم جوئی کے دوران راجہ کسی جنگل سے ہوتے ہوئے سمندر پار کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اُس کے کانوں میں ایک درد بھری آواز آئی، مجھے میگواہن کے عہد عدل میں مارا جارہا ہے، مجھے میگواہن کے عہد عدل میں قتل کیا جارہا ہے۔ راجہ کے دل کو جیسے آتشین بھالا چبھ گیا۔ وہ جھٹ ابر کی سواری پر اُس طرف چل دیا جہاں سے یہ درد انگیز آواز آئی تھی۔ اُس نے کیا دیکھا کہ چنڈ کا کے مندر میں ایک آدمی گردن جھکائے، شبار ا جنگجو قبیلہ کے لیڈر کے ہاتھوں جان سے ہاتھ دھونے کیلئے بادِل ناخواستہ کھڑا تھا۔ راجہ کے خوف سے شبرا قبیلہ کا سردار کانپتے ہوئے بولا ''کہ میرا بیٹا بستر مرگ پر ہے۔ اور اس انسانی قربانی سے اُسکی جان بچ سکتی ہے''[1]۔

راجہ میگواہن پُر وقار لہجے میں بول اُٹھا ''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس بے گناہ کی قربانی کا مطلب اُسکی فوری موت ہے لیکن اسکے احباب و اقارب مستقل عذاب میں گرفتار ہونگے۔ قبیلے کا سردار پھر ملتجی ہوا کہ ''میرے بچے کو بھی کیسے نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ اسکے بھی رشتہ دار ہیں۔'' راجہ میگواہن پُر جلال لہجے میں پھر بولا ''اے کرتا[2] حواس باختہ مت ہوجا میں تمہارے لئے بیٹے کو اپنی جان دیکر چنڈ کا کے نذر کرکے بچاؤنگا۔ اس لئے مجھے اور میرے ان دو رفیقوں پر پر قاتلانہ حملہ کرکے اپنی انسانی قربانی کی رسم پوری

[1] Rajatrangni :Kalhan : Eng.Translation R.S.Pandit iii v 30. 35p.7

[2] مورخ حسن نے شبارا اور کرتا کی جگہ برہمن لکھا ہے یہ لوگ وندھیا اور راجپوتانہ کے پہاڑی (مقامی) قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔

کرلو" پہاڑی قبیلہ کا سردار راجہ کو ایسا کرنے سے باز رکھنا چاہتا ہے کیونکہ پرجا اور اُسکے عدل گستر خاندان کو اُسکی اَشد ضرورت ہے یہاں پر کلہن کا زورِ قلم فطری انسانی کوتاہیوں سے پردہ ہٹاتے ہوئے راجہ سے یہ تلیخ حقیقت آشکارا کراتا ہے۔ "نا ہی جاہ وحشم، عیش وتنعم، شان وشوکت، دولت وثروت، چہتی بیویاں، لاڈلے شہزادے، احباب اور نہ ہی قوانین زندہ رہنے کی تمنا پوری کرنے میں بادشاہوں کے کام آتے ہیں۔"

پہاڑی قبیلہ کا سردار پھر بھی راجہ میگواہن کو اپنی قربانی سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن امن وشانتی کا مجسمہ بالآخر اپنی ہی تلوار سے اپنا کام تمام کرنے کیلئے ہاتھ اُٹھانے والا ہی تھا کہ آکاش کی پھول مالاؤں نے اُسکے سر کو ڈھانپ لیا اور ایک نورانی پیکر اُس کے سامنے آموجود ہوا، جس نے اُسکے ہاتھوں کو روک لیا۔ اُس نورانی پیکر کے بغیر اسکے سامنے اور کوئی صورت موجود نہ تھی۔ نورانی شخص نے اُسے اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا کہ یہ سب کچھ تمہارے بلند وارفع ارادوں کی آزمائش کے سوا اور کچھ نہ تھا[1]۔ مؤرخ حسن اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے۔ شخصے روحانی پیدا شُد، راجہ بگرفتہ ازکشتن خودش باز داشت، دراں آں ہمہ کساں از نظر راجہ غائب شدند، وراجہ در ورطہ حیرت افتادہ آں شخص روحانی گفت کہ ایں جماعہ از عالم غیب برای امتحان تو آمدہ بودند ومنم مؤکل بحار وانہار شفقت رحمتِ تو بر خلق خدا دیدہ مطیع ومنقاد گشتم اکنوں مدعائے خود از من بخواہ[2] " وہ اُسے یہ بھی بتاتا کہ تمہارے پیش رو واسوکول[3] نے جانداروں کی زندگیاں لی تھیں اور تم

---

۱۔ راج ترنگنی۔ کلہن ترنگ۔ سوئم، انگریزی ترجمہ، آر، ایس، پنڈت

۲۔ تاریخ حسن۔ جلد دوم۔ صفحہ ۶۰ ۳۔ واسوکول ۶۷ ق م سے ساٹھ سال کے لئے کشمیر کا حکمران رہا۔ اسکے بعد مہر کل نے ستر سال حکومت کی جسے تین کروڑ لوگ قتل کیے۔

عدم تشدد سے اُسکا کفارہ کیئے جارہے ہو۔ قانونِ قدرت بھی عجیب ہے کہ اسی خاندان سے انتہائی ظالم وجابر حکمران بھی پیدا ہوا اور عدل گستری وعدم تشدد کا سہرا بھی اسی کے سر بندھے۔ یہاں انسانی لاشعور کی کارفرمائی ہے جو بالآخر میگواہن کا روپ دھار لیتی ہے اور کائنات کے غیر مرئی قوانین بھی انسانی دُکھوں کا مداوا کرتے ہیں۔

ایک دن ایک برہمن اپنا اکلوتا علیل بیٹا گود میں لئے پادشاہ کے دربار میں حاضر ہوکر مؤدبانہ عرض کرنے لگا کہ میرا یہ لختِ جگر مدت مدید سے بیمار چلا آرہا ہے، نجومیوں کا کہنا ہے کہ چوپائے کی قربانی کے بغیر اسکا روگ دوُر نہیں ہوسکتا۔ چونکہ حیوانات کا ذبح کرنا ممنوع ہے اسلئے قیمتی انسانی جان ضائع ہونیکا احتمال ہے۔ راجہ نے برہمن کی فریاد غور سے سُنی اور جواب کل تک اُٹھا رکھا۔ اس ساری رات اسی معاملہ کے بارے میں سوچ سوچکے گذاردی، آخرکار وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ میری یہ پیاری جان بھی اک دن بھی ایک دن جانی ہے کیوں نہ اسے برہمن زادہ کی نذر کیا جائے اور برہمن کے لئے دُرگا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ صبح جب برہمن بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے اُسے اپنے فصیلہ سے آگاہ کیا کہ وہ جہاں پناہ کہ یہ فعل کسی جان کے بدلے میری جان لے سکتا ہے۔ برہمن نے التجا کی کہ اے جہاں پناہ کہ یہ فعل کسی کو پسند نہیں ہوگا۔ بادشاہ نے اپنی تلوار سے اپنا سر قلم کرنے کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ وہ وار کرنے کو ہی تھا۔ کہ ایک نورانی شخص نمودار ہوا اور اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ روحانی پیکر نے اُسکی (راجہ کی) علو ہمتی کو خراج تحسین ادا کیا۔ رضائے شفائے مولا سے برہمن زادہ بھی روبہ صحت ہوا۔ راجہ میگواہن کی عزت وتوقیر اور بڑھی[1]۔

کلہن نے اس کے برعکس لکھا ہے کہ اُسے درگا نے اپنی جان برہمن

[1] تاریخ حسن جلد دوم ص ۶۰

زادے کی نذر کرنے سے باز رکھا اور اُسکی راجہ میگواہن کی رحم دلی و عالی ہمتی کو دیکھتے ہوئے برہمن کے لاڈلے اکلوتے بیٹے کو چاک و چوبند کر دیا۔ کچھ بھی ہو دونوں صورتوں میں فطرت کی غیر مرئی قوتوں کو متصف کرنے میں انسانی ذہن کی اختراعی صلاحتیں کارفرما ہیں۔

ایک دن راجہ میگواہن ولر کی سیر کر رہا تھا کہ بادصرصر نے کشتی کو آگھیر اور بادشاہ کے ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہوا۔ سانپوں کی بھاری تعداد دریں اثنا نمودار ہوئی جنہوں نے کشتی کو صحیح سلامت کنارے لگایا۔

مارواڑ کا راجہ، میگواہن کی اطاعت سے منحرف ہو کے، جانور کشی میں مصروف ہوا۔ راجہ میگواہن نے اسکی اطلاع پاکر اسے راہِ راست پر لانے کی ٹھان لی۔ شاہی لشکر کو پانی کی قلت کا سامنا ہوا۔ ناگاہ، ناگوں کی بھاری تعداد سانپوں کی صورت میں حاضر ہوئی اور ان گنت چشمے پھوٹ پڑے کہ طغیانی آگئی سارا لشکر سیراب ہو کر آگے بڑھتا گیا۔ راجہ مارواڑ کو گرفتار کیا گیا۔ مارواڑ کو اپنے قبضہ میں کر کے راجہ میگواہن نے سورت کا رُخ کیا اور قنوج کو بھی فتح کیا۔

راجہ میگواہن بدھ مت کا سچا پیرو تھا جس نے اپنی تمام تر قوت عوام کی فلاح بُہبود اور بدھ مت کی اشاعت کیلئے وقف رکھی۔ اس نے بودھ بھکشوؤں کی سہولیات کے لئے میگواہن۔ مینہ گام و میگہ مٹ نامی وہار تعمیر کرائے۔

راجہ میگواہن کی رانیاں کسی طرح پیچھے نہیں رہیں امرتا پربھا نے امرتا بھون، نام کا فلک بوس وہار تعمیر کرایا۔ راجہ میگواہن نے اپنے والد گوپادتیا کے بدیشی گرو کے نام سے ل ''وستونپا'' نامی سٹوپا بھی تعمیر کیا۔

''ندہ ون'' میں راجہ کی ایک اور رانی یوکا دیوی نے ایک اور وہار یادگار کے طور چھوڑا۔ رانی اندرا دیوی نے اپنے نام سے ایک چوگوشہ عالی شان

محل اور سٹوپا تعمیر کرایا۔ اُس کی دوسری رانیوں، کھادنا اور سمانے بھی اپنے ناموں سے یادگاری وہار بنوائے۔[1]

راجہ میگواہن کی عملی زندگی حکمت عملی اوراس کے حسنِ تدبر سے یہی عیاں ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ ذہنی وروحانی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ بدھ مت عرفان ذات کے سوا جملہ رسومات سے عبادات کو پاک ومبرا گردانتا ہے۔ لیکن صدیوں پرانے انسانی اوراجتماعی لاشعور کی مضبوط گرفت کا کیا کیا جائے کہ راجہ کو بھی دیوی دیوتاؤں کے قہر سے بچانے کے لئے پرجا کی خاطر اپنی قیمتی جان بھی کئی دفعہ قربانی کے طور پیش کرنا پڑی۔ حُسن اتفاق سے وہ ہر بار سرخ رو ہو کر بچ نکلے۔

سرکاری سرپرستی کسی بھی مذہب یا تحریک کی اشاعت کیلئے نہایت ہی کار آمد اور مؤثر ترین ذریعہ ہے، مثبت ذرایع اور وسائل سے کام لیا جائے تو عوامی ایجاب وایقان کے وسیع تر امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ راجہ میگواہن بدھ مت کے مسلک اہنسا کو عام کرنے میں تادم آخر سرگرم عمل رہا۔ راجہ کے بارے میں اور بھی کئی محیر العقول روائیتیں عام ہیں، جنہیں تھوڑے سے تغیر وتبدل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

راجہ میگواہن کی بظاہر معجز نما شخصیت صحیح معنوں میں ذوق عمل وعرفان کا پیکر تھی، جسنے عدم تشدد پر مبنی برصداقت اصولوں کو قائم ودائم رکھنے کے لئے تشدد سے کام تو لیا لیکن اپنی ذات کو اس سے ملوث ہونے نہ دیا۔ کلہن نے میگواہن کی فتوحات کا ذکر خیر تو کیا ہے لیکن اس نے تشدد کو محیر العقول واقعات کا روپ دیا ہے جو اسکی جادو بیانی سے سچے دکھائی دیتے ہیں۔

راجہ میگواہن راہبانہ زندگی کا پرچارک یا سرپرست نہیں تھا بلکہ وہ خالق کائنات کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے کا قائل بھی تھا۔ یہ بات اس لئے

[1] راج ترنگنی۔ کلہن انگریزی ترجمہ۔ آر۔ ایس۔ پنڈت۔ ترنگ ۳۔ صفحہ ۶۹

پایۂ ثبوت کو پہنچ پاتی ہے کہ اسکی کئی بیویاں تھیں جن کے بطن سے اسکے کئی بچے بھی تھے، جو ایک عالی شان وہار میں پرورش پاتے تھے یہی وجہ ہے کہ گوننداخاندان کی حکومت میگواہن کے بعد پونے چھ سال قائم رہی۔

کوئی بھی رسم، رواج پانے سے سماجی قانون کی حیثیت حاصل کرتی ہے۔ اسی طرح عوامی خواہشات کے عین مطابق لاگو کیا گیا قانون اجتماعی طور فطرت ثانیہ کی صورت میں جاری رہتا ہے۔ گو کہ مدنی وتہذیبی سطح پر تبدیلیاں جاری رہتی ہیں عدم تشدد اور اہنسا کے زریں اصول انسانی سماج کی خاطر پہلے بھی مشعل راہ کا کام دے چکے ہیں اور آج بھی روپ بدل بدلکر انہیں بنی نوع انسان کے دُکھوں کا مداوا سمجھا جاتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہماری حریص و بوالہوس نگاہیں ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہیں...... جسکا نتیجہ رنگ ونسل اور مذاہب پر مبنی قوموں اور قومیتوں کے باہمی حرب وتصادم کی بھیانک صورت اختیار کرتا رہتا ہے۔ کوئی بھی صورت کسی خاک میں پنہاں صورت کا مُبدّل نہیں ہوسکتی۔ میگواہن کی عدم تشدّد واہنسا کی روشن کی ہوئی قندیل آج بھی فروزاں ہے، اُسکے آباءواجداد نامساعد سیاسی حالات کی وجہ سے قندھار[1] میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے لیکن قریباً دوسو سال گزرنے کے بعد وہ پھر وطن مالوف کو لوٹ آتا ہے اور ایک عہد ساز شخصیت کا روپ دھار کر حسین وجمیل انسانی سماج کے خواب بُنتا ہے، شاید اسی لئے میر کو کہنا پڑا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

[1] وادی کابل تقریباً ایک ہزار سال تک بدھ مذہب کا گہوارہ رہی رگ وید اور ادستا کے مطابق قندھار (مشرقی افغانستان) ہند آریا اور ایرانیوں کی ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کا اہم مرکز رہا ہے راج ترنگنی کلہن۔ انگریزی ترجمہ آر۔ایس۔پنڈت صفحہ ۲۸ (xx viii) اور (۶۸۔۷۴۲)

# عبدالاحد آزاد

کشمیری زبان بڑی سخت جان واقع ہوئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ آج تک سرکاری سرپرستی سے محرومی اور عوام کی بے توجہی کے باوجود ہمہ جہت ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی آگے نہ بڑھتی۔ بھلا ہو فطرت کا جس کی داخلی قوتیں ہمارے چاہنے یا نہ چاہنے سے الگ مصروف کار ہوتی ہیں۔ یہی وہ دیو پیکر، غیر مرئی عوامل ہیں، جن کی کارفرمائی سے دبی قومیں اُبھرتی آئی ہیں اور جن سے زندہ زبانوں کے خدوخال سنورتے آئے ہیں۔ کشمیری زبان وادب کے ان ہی فطری مشاطوں میں عبدالاحد آزاد کی سیمابی شخصیت انتہائی اعلیٰ وارفع مقام رکھتی ہے عبدالاحد آزاد ایک بڑا شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بلند مرتبہ نقاد اور محقق بھی ہے جس نے ایک خلاق و پیشرو فنکار کی حیثیت سے کشمیری زبان وادب کے ارتقائی امکانات کی نشاندہی کر کے، شعروادب کی نئی راہیں متعین کیں۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ کشمیری زبان کا یہ بے مثال محسن و مشفق کون تھا اور کہاں رہتا تھا۔ کس طرح پروان چڑھا اور عشق کی بے نام راہوں پر چلتے چلتے کدھر کا ہو چلا۔ بقول حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ

آیا ے یوٗت تہٕ گوٗھو کوٗتو — زوٗنم نہٕ منزٕ ماوٗوٗت ییٚر
تس کیا کرٚو اُسی للہٕ پوٗتو — پکاں !پکاں !پکاں گیٚے

آنے کو تو ہم یہاں آگئے لیکن یہ نہ جانا کہ کدھر کو چلیں، یہ بھی نہ سمجھا کہ کہیں راہ میں دوراہا تو نہیں آئے گا۔ اُس خداوند عزوجل کی خوشامد ہم للو پتو کیا

---

ہمارا ادب :۷۷۔۱۹۷۶ء مشاہیر نمبر ا۔ مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی سرینگر ص:۲۶۔۲۰۱

کریں یعنی ہماری اُس کے سامنے بساط ہی کیا ہم تو بس چلتے رہے! چلتے رہے! بس چلتے بنے!

حافظ شیرازی کا یہ شعر بھی بے ساختہ زبان پر آتا ہے ؎

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی

بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

علاقہ بڈگام کی خوش بختی ہی سمجھ لیجئے کہ سالار دین کا بیٹا شیخ العالم شیخ نورالدین نورانیؒ اپنی جای پیدائش کھی جوگی پورہ (تحصیل کولگام) کو چھوڑ کر اپنی دائمی خواب گاہ چرار شریف کو بنا کر اُسے مرجع خاص و عام کا شرف بخشتا ہے۔ شمس فقیر اور صمد میر عرفان و آگہی کے نغمے یہیں سے بلند کرتے ہیں۔ جواں مرگ دلسوز یہیں سے عشق و محبت کی لے فضا میں بکھیر دیتا ہے۔ بُلبل ناگامی کی خلاقانہ ذات بھی اسی قطعۂ مردم خیز کی مرہون منت ہے۔ آغوش فطرت میں جھولتی ہوئی سبزہ زاروں، جنگلوں اور آبشاروں سے آراستہ گوشۂ فطرت میں آباد یہی وادی ضیا بار عبدالاحد ڈار المتخلص بہ آزاد کی جنم بھومی ہے۔[1]

سرینگر سے تقریباً بیس کلو میٹر کی دوری پر جنوب مشرق میں رانگر (تحصیل چاڈورہ) نام کا ایک گاؤں ہے۔ آزاد یہیں پر ۱۳/جون ۱۹۰۳ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے والد بزرگ کا نام خواجہ سلطان ڈار تھا وہ صوفی منش آدمی ہونے کے علاوہ فارسی زبان پر بھی خاصی دسترس رکھتے تھے۔ اُنہیں مذہبی امور پر بھی بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ عبدالاحد ڈار کی حساس و نازک شخصیت کی ابتدائی تربیت گاہ یہی مشفق ذات تھی اس کے بعد وہ ایک مقامی مکتب میں داخل کئے گئے

[1] کیگام کے رہنے والے کشمیری زبان کے ترقی پسند اور انقلابی شاعر عبدالستار ڈار، رنجور، آزاد کے ہم نسب تھے۔

جہاں وہ اپنے بڑے بھائی خواجہ علی ڈار سے تیسری جماعت تک پڑھتے ہیں چنانچہ وہ خود بھی اس بات کی طرف صریح اشارہ کرتے ہیں۔ ۱۹۷۳ ب (۱۹۱۶ء) میں میرے بڑے بھائی غلام علی نے پرائیویٹ مکتب کھولا۔ میں نے اسی مکتب میں ابتدائی اُردو، فارسی تعلیم پائی۔ چونکہ مطالعہ کا شوق تھا۔ رفتہ رفتہ نوشت وخواند میں تھوڑی بہت مہارت حاصل کی۔ ادبیات کا مطالعہ ہمیشہ میرا مرغوبِ خاطر مشغلہ رہا۔ صاف ظاہر ہے کہ اُن کے کسبِ علم کی پہلی کڑی یہیں پر ٹوٹتی ہے وہ بعد ازاں چھوٹے پیمانے پر دُکانداری کرنے لگے۔ یہ سلسلہ اُن کے ۱۹۱۹ء میں عربی مدرس بننے کے بعد بھی ۱۹۲۵ء تک جاری رہا۔ درس وتدریس کے دوران وہ منشی کا امتحان بھی پاس کرتے ہیں۔ منشی فاضل کے امتحان میں ناسازی صحت کی وجہ سے شامل نہ ہوسکے۔

۱۹۱۹ء میں وہ زوہامہ کے مقامی سکول میں عربی مدرس کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ ۸/اگست ۱۹۳۱ء تک وہ اسی سکول میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۱ء میں یہاں کی تحریک حریت نے بیداری کی نئی کروٹ لی، جس کی پاداش میں وہ ۹/اگست ۱۹۳۱ء کو زوہامہ سے ترال تبدیل کئے گئے۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں وہ گپرو (نورپورہ) تبدیل ہوئے جہاں وہ ۱۹۳۳ء تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ اپریل ۱۹۲۴ء وہ نارمل ٹریننگ کے لئے انت ناگ بھیج دیے گئے۔ ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد وہ پھر زوہامہ آئے۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء سے جولائی ۱۹۴۶ء تک ہیڈ ماسٹر پرائمری سکول برنہ وار رہے۔ اس کے بعد وہ سورسیار تبدیل ہوئے جہاں وہ تادم حیات فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آزاد کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ دائم المریض تھے حاکمانِ وقت کی ریشہ دوانیوں،

زندگی کی دیگر کٹھنائیوں اور اپنی غیر موجودگی میں اکلوتے بیٹے کی بے وقت موت کا صدمہ جانکاہ کب تک سہتے- آخر کار اپینڈ سائٹس کے سلسلے میں ڈاکٹر اومکار ناتھ (رتن رانی ہسپتال) کی ممکنہ مستحسن کوششوں سے کامیاب آپریشن بھی ہوا لیکن بیماری کا زہر خون میں سرایت کر چکا تھا جس کے نتیجے میں اُنہوں نے ۴/اپریل ۱۹۴۸ء کو ۴۵ سال کی عمر پا کر داعی اجل کو لبیک کہا انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون ۔ بقول غالبؔ ؎

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے مہجور جو آزادؔ کو کشمیری زبان کی بکھری زُلفیں سنوارنے کا کام سونپ چکا تھا، اُسکی تاریخ وفات کہنے پر مجبور ہوا ؎

آہ! آزاد از چمن روپوش شُد
یا کہ از جامِ بقا بے ہوش شُد
بہرِ سال رحلتش مہجور گفت
بُلبُل شیریں بیاں خاموش شُد

کشمیری میں بھی ہجری سنہ کے حساب سے تاریخ وفات یوں باندھی ہے ؎

کأشرِ بن ہُند عٔلمہٕ ادبک باغ از برباد گو
باغ وُچھنے حسر تھا ہتھ باغہٕ وول شداد گو
سرفدا کوٗر باغوانو دزٕ اوٕ سالِ وفات
بولہٕ وُن زن بُلبُلا تزٕ اُوتھ چمن آزاد گو

آزاد جسداً ہمارے درمیان نہیں لیکن اُنہیں زندگی کی حرکی حقائق کا عرفان حاصل تھا جس کی وجہ سے دم واپسیں تک دم نہ لیتے ہوئے کشمیری

دبستان علم وادب کی خونِ جگر سے چمن بندی کر کے انہوں نے بقائے دوام پایا تھا۔اس بات کا احساس اُنہیں خود بھی تھا۔وہ کہتے ہیں۔

عالم ہا کرِ یاد آزاد آزاد

دوہہ اکہِ وچھتہِ یاد پاوے مدِ نو

دیکھنا میرے محبوب، تمہیں ایک دن یاد دلاؤں گا کہ دنیا ایک دن آزاد! آزاد! پکارے گی، یعنی آزاد کی شہرت دُور دُور تک جا پہنچے گی۔ حقیقت بھی یہی ہے لیکن اُن کی شاعرانہ، محققانہ اور نقادانہ تاریخی اولیت کے اعتراف کے ضمن میں بخل سے کام لیا جا رہا ہے۔ لیکن آزاد کی روح حافظ کا یہ شعر رہ رہ کر دہرا رہی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دِلش زندہ شُد زعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

مردحق آگاہ آزاد رانگر کے آبائی قبرستان میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں محوِ خواب ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آزاد کلچرل فورم چاڈورہ اس بات کے لئے مبارکباد کا مستحق ہے جس نے ۱۹۷۳ء میں کسی سرکاری وغیر سرکاری معاونت کے بغیر ہی آزاد کا مقبرہ اپنے طور تعمیر کیا اور سنگ مزار بھی نصب کیا، جس پر آزاد کا یہ شعر کُندہ ہے۔

عالم ہا کرِ یاد آزاد آزاد

دوہہ اکہِ وچھتہِ یاد پاوے مدِ نو

آزاد کلچرل فورم ذہین طلباء کو کشمیری امتحانات میں امتیاز حاصل کرنے پر آزاد میموریل ایوارڈ دیتا ہے۔افسوس کا مقام ہے کہ یہاں کی عوامی حکومت

نے بھی ابھی تک آزاد کے نام کوئی یادگار قائم نہیں کی۔

زندگی سب سے بڑی آزاد و پابند شاعری ہے اس لئے کسی بھی شاعر کی شاعری یا ادیب کے ادبی محرکات محدود کرنا کوئی دانشمندی نہیں۔ ماحول کا اثر مسلم لیکن صرف اتنا ہی کافی نہیں بلکہ ادیب کی ذات اور اُسکی انفرادیت مقدم ہے زلف گرہ گیر کا اسیر ہونا فطری ہے لیکن ع

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

جیسا کہ بعد میں آزاؔد کو بھی احساس ہوا۔ آزاد کے والد بزرگ خواجہ محمد سلطان ڈار شعر و سخن کے شیدائی تھے۔ کشمیری مثنویاں اُن کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ پڑھ کر سنانے کا حکم آزادی ہی کو ہوا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کے وجود میں سویا ہوا فنکار بیدار ہوا اور وہ سولہ برس کی عمر ہی سے ساز ازل چھیڑ کر شعر کہنے لگے۔ بقول شیخ سعدؔی شیرازیؒ۔

جمال ہم نشین در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ایک مبتدی فنی روایات کی تقلید کے بغیر اور کر ہی کیا سکتا تھا تخلص کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں:

''میں ابتدائی ایام شعروں میں اپنا نام احد ہی تخلص کی جگہ لکھتا تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جانباز تخلص اختیار کیا۔ ۱۹۳۱ء میں الزام لگایا گیا کہ میں سیاسی معاملات میں حصہ لے رہا ہوں۔ حاکمانِ وقت آزاد سے اُلجھ کر ناراض ہوئے اور تعزیر کے طور میں ترال کے مڈل سکول میں تبدیل ہوا۔ میرے گھر کی تلاشی لی گئی۔ وہاں کیا تھا؟ شاعری کے مسودے اور کئی ادبی کتابیں اور رسالے ان ہی ایام میں میرا چار برس کا اکلوتا بیٹا فوت ہوا۔ مصیبت میں خدا زیادہ یاد آتا

ہے۔ ترال میں روزانہ صبح کے چار بجے شاہِ ہمدانؒ صاحب کی خانقاہ فیض پناہ میں حاضر ہونا میرا معمول رہا۔ ایک دن وہیں بیٹھے آزاد تخلص کرنے کا خیال آیا اور مستقل طور یہی تخلص اختیار کیا۔ ان ایام کی لکھی ہوئی ایک غزل کے مقطع میں اسی واقعہ کی طرف اِشارہ کر چکا ہوں

ترٲلۍ مٔنزی جانباز ژھالہٕ نیوٲنی　　　ہا لہٕ ہٕندی پاٹھی نیوٗ لانی ییٚ

آزاد وٕنِنس شاہِ ہمدٲنی　　　　　ییہٕ نا چھم نا مہربٲنی ییٚ

''مقدر نے جانباز کو گیند کی طرح ترال پہنچا دیا۔ اُسے یہاں پر بھی کہیں قرار نہیں۔ شاہِ ہمدانؒ نے آزاد کہہ کر پکارا۔ وہ (محبوب) آتا تو بڑا اکرم ہوتا''۔

آزاد نے اپنے مُشفق ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کی روایت کے مطابق (مرثیہ نما گیت) یہ غزل اپن اکلوتے بیٹے کی وفات پر لکھی ہے۔ اسے غزل کہنا صحیح نہیں کیونکہ یہ گیت (وژُن) کی صنف ہے، جسے آزاد نے دمِ تخلیق یہاں برتا ہے۔ ہاں تو اس کے مرثیہ ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن یہ مرثیہ کے سوز و گداز، جذبات نگاری و دیگر خوبیوں سے مبّرا ہے۔

حیرانی کا مقام ہے کہ غزل کی روایات اور صنف سے واقف ہونے کے باوجود کس طرح آزاد گیت کو بھی غزل کہہ گئے ہیں۔ شعوری و غیرہ شعوری طور یہ مغالطہ کلیات آزاد پر حاوی ہے۔ انسانی فطرت سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی آزاد کی شاعری میں عورت عاشق کی حیثیت سے کیوں در آئی؟ یہ ایک الگ بحث ہے۔

جب آزاد نے آنکھ کھولی تو کشمیری شاعری کی فضا مہجورؔ کے منفرد رومان پرور نغموں سے گونج رہی تھی۔ اگر یوں کہا جائے کہ اقلیم سخن و ساز میں مہجورؔ کا

طوطی بول رہا تھا تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اسلئے اُسکے (آزاد کے) سامنے شاعری کی قدیم روایات کے پہلو بہ پہلو مہجور کی قریب ترین نئی امتزاجی اور امتیازی روایت بھی موجود تھی۔ مہجور نے کشمیری شاعری کو نئی جہتیں بخشیں۔ آزاد نے انہیں وسیع تر کردیا۔ اُن کی روایتی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی اس بات کا گہرا احساس ہوتا ہے کہ آزاد کے سیمابی وجود میں ایک نیا شاعر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ ذرا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔

وُنہِ چھِم نہٕ بَلاں تم آکھ پیٛیہٕ تازٕ خنجر ہتھ آکھ
وُچھ وارٕ مےٚ کن کوٚت دزاکھ آوارٕ کرن والے

اور پھر غالبؔ کا یہ شعر بھی ساتھ ہی گنگنایئے اور مے سہ آتشہ کے آتشیں تجربے کو پھرِ تازہ کیجیے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز  پھر تیرا وقتِ سفر یاد آیا

عشق و محبت کا جذبہ ہمہ گیر اور آفاقی ہے، جو ہر حال میں اپنی دنیا آپ آباد کرتا ہے۔ آزاد نے اسی جذبے کو یوں زبان بخشی ہے۔

عشقن تیر لیس وأنجہ سنہٕ نےٚ  کرِتس عالم قصہٕ تےٚ نیاے
برِ کیا چھو کہٕ لد دِلہٕ کبن کتھہٕ نےٚ  ٹاٹھی یاونہٕ نے گرنم گژاے
گامن تہٕ شہرن پیٛیہٕ پرگنہٕ نے  جایہ جایہ ژھانڈن یاوٕن راے
بُلبلہٕ سٔندی پأٹھی پھیرٕ دونہٕ نےٚ  ٹاٹھی یاونہٕ نے گرنم گژاے

مطلب یہ کہ عشق کا تیر جس کے دل وجگر کے پار ہوا، اُس پر سارا عالم ٹوٹ پڑتا اور آوازے کستا ہے۔ بسملِ مہر و محبت دل کے گھاؤ کیسے بھرے۔ مجھے پیارا مدھ بھرا شباب لبھا کر بہکا گیا۔ میں اپنے محبوب (یاوٕن رائے) کو جگہ جگہ شہر و دیہات کے پرگنہ میں تلاش کروں، جیسے کوئی بُلبُل گلزاروں میں ٹوہ لگاتا

پھرے ۔مہجورؔ کی شاعری قدیم وجدید کی درمیانی کڑی ہے۔ اس سلسلے کو آگے لے جانے میں آزادؔ کا بہت بڑا ہاتھ ہے یہاں یہ بتا دینا کافی ہے کہ آزاد کی اولین اور ابتدائی کاوشیں کسی بھی طرح مہجورؔ کے گیتوں اور غزلوں کے ہم پلہ قرار نہیں دی جاسکتیں۔ گو کہ اُس نے آگے چلکر سنگلاخ زمینوں کو آباد کر کے جدید کشمیری شاعری کے عظیم پیشرو کا مقام پایا۔ شاہد رحمان راہیؔ نے اسی لئے کہا ہے:۔

گوڈنی وچھتو کمو سنگلاخ ژٹۍ کمۍ آب پھیر جوین
پتو اِد شالمارَن لالہٕ زارَن ہنٛز کتھا کَرِ تو

شالماروں اور لالہ زاروں کی بات کرنے سے پہلے ذرا یہ بھی تو دیکھئے کہ کس نے سنگلاخ زمینوں کا سینہ چاک کر کے چشمے اور ندیاں جاری کیں۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مہجورؔ اور آزادؔ ہم عصر ہوتے ہوئے بھی الگ الگ اسلوب و آہنگ کے مالک ہیں۔ ایک رومان پرور نغموں سے لوگوں کے دل موہ لیتا ہے اور دوسرا انقلاب آفرین لے سے ہمیں طبقاتی شعور سے آگاہ کرتا ہے۔ مہجورؔ کے یہاں جذبے کی کارفرمائی ہے اور آزادؔ کے یہاں جذبہ وشعور کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ مہجورؔ کے یہاں رُومانیت ہے اور آزاد کے یہاں عقلیت۔ مہجورؔ نے عشق کو ارضیت بخشی اور آزادؔ نے اس میں زندگی کے حرکی عنصر کا اضافہ کردیا۔

حیات و کائنات کی وسیع فضاؤں میں کوئی بھی شے چشم زدن میں ترقی کے منازل طے نہیں کرتی۔ ایک شاعر یا ادیب کے شعوری اور فنی ارتقاء کے بھی مدارج ہوتے ہیں۔ فنی شباب کی دنیا ہی ایک نرالی دُنیا ہے ایک فنکار اور شاعر کے جسمانی شباب کے ڈھلتے ڈھلتے فنی شباب کی سرحد شروع ہوتی ہے شیب و شباب

کا یہ عالم گونا گوں تجربات کی بنا پر شعوری اور فنی پختگی کے لئے بہت ہی اہم ہے۔
قطع نظر اس کے کہ آزادؔ نے کب کیا لکھا، اُن کی شاعری کے مطالعہ ہے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اُنہیں فنی اور شعوری بالیدگی کے تین مراحل طے کرنا پڑے ہیں ابتدائی، درمیانی اور آخری۔ پہلے دور میں وہ کشمیری شاعری کی روایات کے تتبع میں غزل سرائی کرتے ہیں۔ درمیانی دور میں زندگی کے قریب تر آتے ہیں۔ یہاں بھی غمِ جاناں اور غمِ دوراں باہم دست و گریباں ہیں۔ آخری دور میں ہم اُن کی شاعری میں شعور و ادراک کی گرفت مضبوط تر دیکھتے ہیں یہی وہ دور ہے جب آزاد ترسیل کے نئے ذرائع تلاش کرتا ہے۔ ہم اُسے نئی حقیقتوں اور نئی قدروں کا خیر مقدم کرتے ہوئے یوں دیکھتے ہیں۔

مُبارکھ تازٕ دورانس مُبارکھ
مُبارکھ سازٕ سامانس مُبارکھ
گٹہٕ گیہ دۆر نۆو روشنی وٲژ
نۆس ژٔندرس تہٕ اسمانس مُبارکھ

( دورِ جدید کے نئے خدوخال مُبارک، اندھیرا دور ہوا، صبحِ نو کی ضیا باریاں ہوئیں، نیا چاند اور نیا آکاش مُبارک ہو)۔

وہ سراپا نگاری اور گل وبُلبُل کی شاعری کو کھوٹا سونا گردانتے ہیں، اُنہیں دعویٰ ہے کہ وہ زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر پرانی ڈگر سے ہٹ کر نغمہ سنج ہیں، اس بات سے قطع نظر کہ روایتی فنی پیمانوں کے دلدادہ سخنوروں کی نظر میں، اس کی کوئی وُقعت بھی ہے کہ نہیں۔

تُلن قلم تے لیکھن سراپا نتہٕ خوشامد سوخن وٚری چھا
پران آزاد چھ یم ترانہ ہیچھتھ تہٕ زٲنتھ وُچھتھ زمانہ

نہ گُل نہ بُلبُل نہ مے نہ مطرب          یہ شاعرن نش تہِ شاعری چھا

آزادؔ بنی نوع انسان کی مخفی قوتوں کے قائل ہیں وہ احساس غیرت وحمیت سے مبرا غلام قوم کو یہ کہتے ہوئے احساس دلاتے ہیں کہ جبین نیاز کا ایک سجدہ عرش وفرش میں حشر بپا کر سکتا ہے۔لیکن تمہیں غیر کی چوکھٹ پر جبہ سائی کر کے ایسا اعلیٰ رتبہ نہیں گنوانا چاہئے تھا۔

یُس ڈیکہٕ اُلراوِ عرشس فرش ہیتھ وقتِ نیاز

سُے ڈیکہٕ درواز نٕے پیٹھ کیازِ ترٛووتھ تی پزیا

آزادؔ کا شعر پڑھتے ہی علامہ اقبالؒ کا یہ ارشاد بھی قلب وذہن کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہے۔

پانی پانی کرگئی مجھ کو قلندر کی یہ بات

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

ہماری وادیٔ گلپوش و جنت آغوش کی زریں روایت مذہبی اور فرقہ وارانہ رواداری ہے۔آزادؔ بھی آہنگ بدل بدل کر اسی ابدی انسانی قدر کی آبیاری کرتے ہیں۔وہ رہ رہ کر انسان کو اپنے ازلی مقام کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور بقولِ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اُس کا

یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

وہ بے جا مذہبی زنجیروں کو توڑ کر کھلی فضاؤں میں پرواز کرتے فخر محسوس کرتے ہیں۔

نہ منز کعبس نہ بُتخانس چھُ آزادؔ

پتھس مردِ مسلمانس مُبارکھ

حافظ نے اسی مضمون کو فلسفیانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است

با دوستاں مُروّت باد شمناں مدارا

یہ ایک حقیقت ہے کہ افادیت و مقصدیت پر زیادہ زور دینے سے فن اخباری اور اشتہاری پروپگنڈا بن جاتا ہے۔ آزاد کی شاعری میں بھی خطیبانہ لہجہ کھٹکتا ہے لیکن روحِ عصر کے پیش نظر ایسا ہونا بھی ناگزیر تھا۔ آزاد فطرتاً شاعر تھا اور ازل ہی سے ایک حساس دِل اور نگاہِ جمال پرست بھی لیکر آیا تھا۔ اسلئے وہ عاشقانہ مضامین باندھنے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں

خشمہٕ چوٗنے چھ محشرُک ماَدان

محشرس منز ؤلی تہِ ہارَن دِل

یعنی تمہار بگڑنا جیسے حشر بپا ہونا ہے۔ روز حشر اولیاء اللہ بھی دل ہار بیٹھیں گے

نیرِ بہٕ سینہٕ داَری داَری زِندٕ یہ پان ماَری ماَری

تیرِ کمان چاَری چاَری میرِ شکار کیا کرے

(آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں

عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا)

کوئی الہڑ دوشیزہ اپنے عاشق سے ملنے کو بے تاب دنیا و مافیہا سے بے خبر محوِ آرائش ہے، نہ معلوم اُسے کیا یاد آتا ہے کہ آنسو اُمڈ آتے ہیں اور اشک سیماب آنکھوں کا کاجل دھوڈالتے ہیں۔ کیا یہ کچھ یاد آنے کا اِخفاہی شعرِ کے حسن کو دوبالا نہیں کرتا ہے۔؟

کمہِ شوقہٕ آسیس سنز کران کیا ہتام ژ تس ییوم

بےَ تاب اَوٗتس بادام چشمن سورمہٕ چھُلِتھ گوم

ادب زندگی کا آئینہ ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کی تنقید بھی ہے۔

اس لئے ہم آزادؔ کی شاعری میں روحِ عصر کی کارفرمائی جا بجا دیکھتے ہیں۔ ادب زندگی کی بوقلموں حقیقت کی تاریخ ہے اور تاریخ ہماری مدنی زندگی کی یک رنگ اور محدود تر جمانی۔ آزادؔ کی زندگی جہد مسلسل کا ایک بے مثال پیکر تھی۔ وہ غم روزگار کو غم جاناں بنا کر آساں بناتا رہا۔ بقول اصغرؔ گونڈوی ؎

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غم جاناں بنا دیا

آزادؔ کی شاعرانہ بلوغیت کا زمانہ ہماری قومی بیداری کا زمانہ ہے۔ سارے برصغیر میں بیرونی سامراجیت اور ہمارے یہاں جنت بدامن قطعہ ارضی میں شخصی اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف قومی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ ایک شاعر وادیب کے لئے عصر آگہی کے باوجود رُوحِ عصر کی بلا واسطہ تخلیقی ترجمانی سے جی کترانا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جب متحد اور ملک گیر سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ ادبی وسماجی اصلاحی تحریکیں بھی جنم لیتی ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں پریم چند کی صدارت میں انجمن ترقی پسند مصنفین وجوُد میں آتی ہے۔ اور اس بات کا برملا اعلان ہوتا ہے۔ کہ ''ہمیں حُسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا''۔ صاف ظاہر ہے ادب برائے زندگی کا نعرہ زور پکڑنے لگتا ہے اکثر ادیب وشاعر سیاسی نظریات خاصکر اشتراکیت کی ترویج واشاعت میں شدومد سے شریک ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح اُردو ادب بھی طبقاتی شعور سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اُردو زبان ایک ترقی پسند زبان کی حیثیت سے قومی تحریک کو آگے لے جانے میں حسب سابقہ پیش پیش رہی۔

علامہ اقبالؒ اس سے قبل ہی عظمتِ آدم کے نغمہ سرا کی حیثیت سے اُردو شاعری کے اُفق پر نمودار ہو کے ہمارے دلوں کے نہاں خانوں کو منور

کر چکے تھے۔ آزادؔ بھی اسی برق سوزاں سے اپنے دِل کی قندیلیں روشن کرتے ہیں۔ انہیں کشمیری شاعری کو طبقاتی اور سماجی شعور سے روشناس کرانے میں اوّلیت حاصل ہے۔ حالانکہ مہجور بھی آزاد سے پہلے تحریک حُریت کی نغمہ خوانی کی ابتدا کر چکے تھے۔ نظم کو وہ مالائیں روشن ہوئیں، کو قبولِ عام مِل چُکا تھا۔ مہجور کی شاعری میں ہمیں سیاسی اشارات تو ملتے ہیں لیکن بھرپور سماجی اور سیاسی شعور نہیں ملتا۔ مہجور بُنیادی طور جنسی رومان کا شاعر ہے جبکہ آزادؔ کے یہاں جنس و رومان کے پہلو بہ پہلو زمانے کی نئی تُند و تیز ہوا کے جھونکوں کے لئے بھی قلب و شعور کے دریچے کھُلے ہیں۔ آزادؔ نے موضوعاتی نظموں کو معنوی اور صوری دونوں لحاظ سے وسُعت بخشی۔ اُس نے روایات کی زنجیروں کو توڑ کر فلسفہ حیات کو سادگی و پُر کاری سے پیش کیا۔ اُن کی نظمیں اخبار ہمدرد میں (جو اُن دِنوں پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں شایع ہوتا تھا) شایع ہوا کرتی تھیں۔ اِن ہی دِنوں اُنہوں نے حُب وطن سے مملو بہت ہی پیاری نظم ''میون وطن،، (میرا وطن) لکھی۔ اُس کی دوسری رجزیہ نظم ترانہ وطن میں بھی حُب وطن کا فطری جذبہ کارفرما ہے۔ آزادؔ کو یہ احساس تھا کہ ادیب و شاعر قلم چھوڑ کر تلوار نہیں اُٹھا سکتا، اِس لئے وہ زندگی کو جہد مسلسل سمجھ کر تحریک حُریت کے نغمے گا گا کر اپنی اہم ترین ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ مذہب انسانیت کا پرستار ہے۔ ماں کی کوکھ میں جنم لینے کی فطری حقیقت سے وہ انکاری نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ پُکار اُٹھتا ہے کہ جنّتِ ارضی کے جس فیض بے پناہ سے کلہن، غنؔی اور صرفی جیسے مشاہیر بہرہ ور رہوں کیا اُسی قطعہ ارضی کا پانی ہمارے لئے زہر ہلال ہوگا، ہم سے یہ دیکھا نہیں جا سکتا۔

کلہن، غنؔی تہٕ صرفی سارٕ اب گُری تیمی آبن

سُے آب سانہٕ باپتھ زہر ہلال آسیا!

''مناجات'' پڑھ کر علامہ اقبالؒ کی نظم ''لینن خدا کی حضور میں'' یاد آتی ہے۔ ترسیل جذبات ہماری فطرت ہے جب کوئی ہمدم وہمراز نہ ملے تو آدمی اپنے آپ کو فطرت کے حوالے کر دیتا ہے۔

آزاد نے آبشار (پاں ژادر) ''وتستا'' (وبتھ) آرول (پہاڑی چمبیلی)، تودۂ برف (شینہٕ مائنی)، شمع ودیگر نظمیں لکھ کر اظہار کی نئی راہیں کھولی ہیں وہ آغوشِ فطرت میں رہ کر، مستقبل کے حسین خوابوں کی دنیا آباد کر کے زندگی کو اور زیادہ حسین بنانے کے اسباب بھی بہم کرتا ہے۔ اُن کے یہاں زندگی کا درد لئے منظر نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اُن کی شاہکار نظم ''دریا'' زندگی کی جیتی جاگتی علامتی تصویر ہے۔ آزاد نے دریا کی زبانی تغیر پذیر زندگی کے نغمے گائے ہیں جہد البقا کی اساس جہدِ مسلسل ہے۔ جمود زندگی نہیں موت ہے۔ زندگی روپ بدل کر پیہم رواں دواں ہے۔ اِس کی کوئی بھی منزل آخری منزل نہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ۔

چو نظر قرار گیرد نگارِ خوبروئے

تپد آن زماں دِلے من پئے خوبتر نگارے

کئی اور ایسی نظمیں پڑھ کر اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ موضوع اپنا آہنگ ساتھ لے آتا ہے گو کہ اس میں تخلیقی آمادگی کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ موقعہ نہیں کہ آزاد کی منفرد منظر نگاری کا بھرپور جائزہ پیش کیا جائے پھر بھی نظم ''بہار'' کے یہ دو شعر پیش کرنا بے جا نہیں ہوگا۔ یہ اشعار پڑھتے پڑھتے بہار کی سیمیائی کیفیت رقصاں نظر آتی ہے۔

ہٕلم بُری بُری چھکِنٛی دُردانہٕ ہیٚتھ اوٚ برن تہٕ بارانن

جہانن سأنی عالم آسمانک تنٛبہٕ لاوُن ہیوٚت

گُلن ہٕنٛدی کاروانن خٕمہٕ دیُت باغن بیابانن
پٔنن دامانہٕ سبزارو تہٕ ئڈی کڈی واش تھاوٕن ہیوٚت

بہار کا موسم ہے باد و باران بھی زوروں پر ہے۔ ابرو باراں دامن بھر بھر کے دھرتی پر موتی بکھیر رہا ہے۔ ہماری دھرتی کی یہ حالت سرمستی دیکھ کر آکاش بھی مچل رہا ہے۔ باغ و بیاباں میں پھولوں کے قافلے خیمہ زن ہوئے۔ اور سبزہ زار بھی دامن پھیلائے ہیں۔ ایک اور جگہ نالہ بُلبُل کو پھولوں کے مرجھا کر جھڑ پڑنے، سروسہی کے ایستادہ ہونے کو پاکدامن محبوب سے گریباں چاک کر کے کچھ گوش گُذار کرنے کا نتیجہ گردانتے ہیں۔ پھر ہمیں یہ بھی باور کرایا جاتا ہے کہ آبشاروں کی گھن گرج اور دریاؤں کا سیل سیماب یہ سب کچھ اُسی کے بندِ گریباں کھولکے پتھریلی وادیوں سے دردِ دل کہنے سے وقوع پذیر ہوا ہے حُسن تعطیل کی یہ ایک اچھی مثال ہے

بُلبُلو وٕد گُل ہٕرتھ ییٚ، سرٕ وٕ گُلی گے رٕوزی رٕوزی
چاکھ جامن دِتھ مے کیا سنہٕ پاکھ دامانس وٕنیوم
شورتل پاں ژادر وتے روو ڈری یاوَن اَرام
تنہٕ ہٕوٚ رأوتھ یہ دردِ دل کوہستانس وٕنیوم

دِیۓ سے دیا روشن ہوتا ہے۔ آزاد نے بڑی فراخدلی سے علامہ اقبالؒ کی شمع سوزاں سے زندگی کی قندیلیں روشن کر کے کشمیری شاعری کو نیا اسلوب و آہنگ عطا کیا۔ فلسفہ حیات ہو، یا عشق کا تصور، عقل و دِل کا معاملہ ہو یا بے خودی کا فلسفہ اور ابلیس کی عظمت رندانہ کا اعتراف، آزاد بڑی فنی چابکدستی سے اقبال کی خوشہ چینی کرنے میں کوئی باک نہیں کرتے۔ عظمت آدمؑ کی نغمہ خوانی میں بھی آزاد رطب اللسان ہیں اس سلسلہ میں ''لول تہٕ گاٹہٕ جار'' مکالمہ ''عشق و خرد'' قابل غور

ہے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ اقبال کی رؤح رہ رہ کر آواز دے رہی ہے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مکالمہ ''عشق وخرد'' کے ابتدائی اشعار بہاریہ و مدحیہ انداز لئے ہوئے ہیں۔ یہ نظم پڑھ کر آزاد کی تردستی، خیال آرائی اور بے مثل تراکیب الفاظ کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ یہ نظم پہلے ۱۹۴۰ء میں لکھی گئی، جنوری ۱۹۴۱ء میں ''سواستکا'' میں ''سازخاموش'' کے عنوان کے تحت جزواً شایع ہوئی پھر دسمبر ۱۹۴۲ پھر کسی قدر اضافہ کے ساتھ ''ہمدرد'' میں شائع ہوئی۔ آزاد نے اس نظم کا عنوان ''مناظرہ عقل وعشق'' بھی رکھا تھا۔

بے خودی، خودی، شکوہ ابلیس، نالہ بڈشاہ، شکوہ کشمیر، سرمایہ داری نغمہ بیداری، پیامِ انقلاب، انقلاب، سون (سونا) شباب وشیب، (یاوُن تہٕ بُجر) اور ایسی کئی دوسری نظمیں پڑھ کر یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ آزاد نے ایک بڑے شاعر کی طرح کشمیری شاعری کی نئی طرح ڈالی۔ آزاد نے صحیح معنوں میں جدید شاعروں اور ادیبوں کے لئے راہ ہموار کی۔ اقبالؒ کشمیریوں کی غلامی کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

کشپری کہ بابندگی خو گرفتہ
بُتے می تراشد زسنگ مزارے

شاید آزاد کی سیمابی شخصیت کے بارے میں حُسن وعشق اپنی اپنی جگہ یہ سوچنے میں بھی حق بجانب ہونگے۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

مثنوی کی طرف بھی آزاد نے اپنے شاعرانہ سفر کے ابتدائی ایام میں توجہ کی۔ کشمیری شاعری کا بہت بڑا حصہ مثنوی پر مشتمل ہے جس میں رزمیہ اور بزمیہ دونوں طرح کی مثنویاں شامل ہیں۔ کشمیری مثنویوں میں کوئی بھی مثنوی ''گلریز'' کے سامنے ٹک نہ سکی۔ مثنوی نگاری میں مقبول کرالہ واری کا کوئی ہم پلہ شاعر پیدا نہیں ہوا۔ آزاد نے دو مثنویاں ''چندر بدن'' اور ''قمرالزمان'' لکھی ہیں ''چندر بدن'' کا مسودہ موتی لال جیلخانی کے پاس موجود ہے جبکہ مثنوی ''قمرالزمان'' کا مخطوطہ موتی لال ساقی کے کتب خانے کی زینت ہے۔ آزاد نے اس مثنوی کا بنیادی قصہ ''الف لیلہ'' سے لیا ہے۔ یہ ایک عشقیہ داستان ہے جو اُس نے مقبول کرالہ واری کی شاہکار مثنوی ''گلریز'' کے تتبع میں لکھی ہے۔ اس مثنوی کی اہمیت یہی ہے کہ آزاد نے اسی سے اپنا شاعرانہ سفر شروع کیا جس کی وجہ سے اس کا اسلوبِ بیان فارسی آمیز ہے پھر بھی بہت سی مثنویوں کے مقابلہ میں اس کا رتبہ بُلند ہے۔

آزاد کی فارسی شاعری کے نمونے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنا فارسی کلام ''خرام صبا'' کے نام سے ترتیب دیا ہے جس میں دو سو چونتیس اشعار پر مشتمل ایک طویل قصیدہ اور خواجہ نقشبند مُشکل کُشا کے حضور مناقب بھی شامل ہیں۔ ان تخلیقات کا الگ سے جائزہ لئے بغیر آزاد کے اس رنگِ سخن کو پرکھنا یا کوئی حتمی رائے قائم کرنا اسوقت ممکن نہیں۔

ازلی اور عظیم فنکار فطرت ہے۔ ردوقبول کا سلسلہ بہر رنگ جاری و ساری ہے۔ متضاد و متخالف ہونے کے باوجود مظاہر فطرت میں داخلی تطابق و توازن پایا جاتا ہے۔ سمٹ کر بکھرنے اور بکھر کر سمٹنے کا عمل بھی کہیں رُکنے والا نہیں۔ چکبست کے اس شعر میں اسی بات کا اشارہ ملتا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے ان ہی اجزا کا پریشاں ہونا

غرضکہ کائنات کا ہر ذرہ صناعِ حسن ازل کی منہ بولتی تصویر ہے۔ گلاب کی عطر بیز پنکھڑی ایک خاص ترتیب سے متشکل ہوتی ہے۔ سرو صنوبر کو دیکھئے تو خمیدگی کا کہیں نام نہیں۔ انسان ہی تو ہے جو حسن فطرت میں اضافہ کرتا آیا ہے۔ علامہ اقبالؒ انسان کو خدا کے حضور اس طرح گستاخی کراتا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یہیں سے انسان کی خلاقانہ اور ناقدانہ حیثیت شروع ہوتی ہے۔ بچہ جننے کے بعد وحشی اور پالتو جانور بھی اُسے (بچے کو) چاٹ چاٹ کر سُندرتا بخشتے ہیں۔ ایک شاعر و ادیب تو حُسن کار جو ٹھہرا وہ بھی اپنے طور اپنی تخلیق کی نوک پلک درست کر کے ہی دم لیتا ہے۔ آزاد ایک خلاق شاعر ہی نہیں بلکہ ایک باشعور اور وسیع النظر نقاد بھی ہے۔ ''کشمیری زبان اور شاعری'' کی تینوں جلدیں اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ آزاد کی یہ صلاحیت اُس وقت نقطہ عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ جب وہ ''کشمیری زبان اور شاعری'' کی تیسری جلدیں پر مانند، مقبول کرالہ واری اور مہجور کی شاعری، فن اور شخصیت پر سیر حاصل بحث و تنقید کرتے ہیں اس معرکتہ الآرا تصنیف کا اول سے آخر تک مطالعہ کرتے وقت شبلی نعمانی کی شعرالعجم رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ آزاد کی عظیم شخصیت جا بجا اپنی اختراعی قوتوں کا لوہا منواتی ہے۔ آزاد کا یہ تذکرہ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعراء کے کلام کا

جائزہ لیتے ہوئے افراط وتفریط سے دامن بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ''کشمیری زبان اور شاعری'' کوتاہیوں سے بالکل مبرا ہے۔ نعمہ صاب، عمہ خوجہ سوپوری، رحیم صاب، احمد بٹہ واری، صمد میر، کرم بلند، شاہ قلندر، مولینا انورؔ، لسہ خان اسلام آبادی، اسد پرے، احد زرگر اور دیگر کئی شعراء کی غیر حاضری کھٹکتی ہے۔ انتہائی قلیل دستیاب ذرایع اور اُنکی بے وقت موت کے پیش نظر کتاب کی اولیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ یہ کتاب کشمیری زبان وادب کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو اقلیم سخن کے رہ نوردوں کے خاطر مشعل راہ ہے۔ اب بھی تلاش و تجسّس کی قندیلیں روشن کر کے مخفی جواہر پاروں سے کشمیری زبان اور شاعری کے شیدائیوں کو روشناس کرانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جبھی تو ممکن ہے کہ یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچے اور مرحوم آزاد کی روُح کو بھی ابدی سکون مل سکے۔ آزادؔ کو یہ تذکرہ تحریر کرنے کی تحریک کہاں سے ملی۔ ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو تاریخ ادبیات کشمیر کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:۔

''۱۹۳۵ء میں تمام وادی کشمیر میں کالرا کی بیماری وبائی صورت میں نمودار ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں موضع رانگر میں محکمہ مال کے کسی افسر کا کیمپ لگا تھا، جملہ پٹواریوں کے ساتھ مہجورؔ بھی حاضر تھے۔ آزاد اُن دنوں رانگر میں ہی سکونت پذیر تھے۔ وہ مہجور کی شاعری کے نئے اسلوب و آہنگ سے اُن کے غائبانہ پرستاروں میں شامل ہوگئے تھے۔ اُن سے ملنے کے بعد وہ اُن کی سوانح مرتب کرنے کی خواہش کرنے لگے تھے۔''

چنانچہ مہجور اور اُن کی شاعری پر لکھنے کے شوق بے پایاں نے اُن کے دل میں انگڑائی لے لی جو آگے چلکر کشمیری شاعری کے اولین تذکرے میں

متشکل ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ایسی کوئی مربوط روایت موجود نہ تھی۔ جسے بنیاد بنا کر آگے بڑھایا جا سکتا تھا۔ مُستشرِقین کے کچھ متفرق مضامین موجود تو تھے لیکن اُن سے کوئی ایسی مربوط ادبی تاریخ مرتب کرنا ناممکن تھا آزاد نے ان مشکلات کا اظہار یوں کیا ہے۔

''کشمیری زبان اور اُس کی تاریخ'' اس موضوع پر آج تک کسی نے لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ نئی صورتوں میں کئی نسخے پیش کیئے گئے لیکن مؤرخانہ تحقیق و تفتیش کے بغیر شاعرانہ انداز میں جو دل و دماغ یا شوق محض یا حلبِ منفعت کے جذبے کے تحت کام کر رہا ہو۔ اُس سے کسی ادبی خدمت کی توقع رکھنا عبث ہے۔''

کشمیری زبان کا یہ پہلا مستند تذکرہ اردو زبان میں تحریر کرنے کے وجوہات کچھ بھی ہوں، یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ہم ایک اعلیٰ پایہ شاعر، ادیب اور نقاد کے اعلیٰ کشمیری نثری نمونوں سے محرُوم رہے ہے۔ اگرچہ قومی بیداری نے نئی کروٹ بھی لے چکی تھی پھر بھی اجتماعی لاشعور میں چھپے احساس کمتری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ گھناؤنے بادل اب جا کے چھٹنے لگے ہیں۔

آزاد کی ناقدانہ متانت، جگر کاوی اور محنت شاقہ کے ثمر بے بہا کے بارے میں محمد یوسف ٹینگ کا یہ ارشاد ہے:۔

''آزاد کی عظمت کا نقش اس وقت اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ عظیم شاعر، اعلیٰ پایہ محقق، قدر اول کا مؤرخ اور بلند مرتبہ نقاد اپنی حیثیت کے بارے میں کس درجہ منکسرانہ رائے رکھتا تھا۔ دردمندی اور انکساری اُن کی تحریروں کی نمایاں خصوصیات ہیں اور اُن کے شفاف و بے ریا دل سے شرافت نفس اور طہارت رُوح کے انوار برستے نظر آتے ہیں۔ وہ بڑے ہی

متین ودلنواز لہجے میں کہتے ہیں کہ ''ہمیں اپنی محدود قابلیت کا اعتراف ہے لیکن کشمیری زبان کی الفت چین سے نہیں بیٹھنے دیتی''۔

شدہ است سینۂ ظہوری پُر از محبت یار
برائے کینۂ اغیار در دلم جانیست

کسی برگزیدہ اور عہد ساز شخصیت کو سمجھنے کے لئے اُس کے نجی خطوط کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خطوط میں اُسکے دل کی دھڑکنیں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ ادبی تحریکوں، نجی تعلقات، عصری سیاست، سماجی وسیاسی عوامل اور حسن فطرت کی نیرنگیوں کے صدرنگ جلوے بھی خطوط میں رقصاں نظر آتے ہیں خطوط کا حُسن اُن کی بے ساختگی ہے، تصنع آیا تو یہ نئی نویلی دُلہن مجروح ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ عبدالاحد آزادؔ کا حلقہ احباب بھی محدود نہیں تھا اُن کے اکثر خطوط اپنے بھانجے غلام نبی عارض کے نام ہیں جس سے اُن کو والہانہ محبت وشفقت تھی۔ غلام نبی عارضؔ کے نام ایک خط میں وہ اس بات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

''میں اپنی زندگی کا سرمایہ دو ہی چیزیں خیال کرتا ہوں یا سمجھتا ہوں ادبیات کے مسودے اور غلام نبی، اس میں بناوٹ اور تصنع کا شائبہ تک نہیں'۔

غلام نبی عارض سے آزاد کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اسلئے اُن کے نام اکثر خطوط شفقت ومحبت سے بھرے پڑے ہیں۔ بقیہ خطوط میں بھی وہ ایثار، بے ساختگی، انکسار، متانت وسنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ عارضؔ کے بعد اُن کے حلقہ احباب میں غلام محمد ڈار خاص توجہ کے مستحق ہیں وہ صوفی منش بزرگ ہیں جن کے ساتھ آزد کے انتہائی مشفقانہ اور دوستانہ مراسم تھے۔ انہوں نے زوہامہ میں چوبیس سال کا عرصہ اکٹھے گزارا ہے۔ ڈار صاحب فارسی زبان پر بڑی دستگاہ رکھتے ہیں۔ مجھے بھی کئی بار اُن سے ملنے کا شرف حاصل ہوا

ہے۔[1] مرزا غلام حسن بیگ عارفؔ، غلام احمد مہجورؔ، غلام احمد عشائی، پریم ناتھ پردیسی، صوفی غلام محی الدین، پنڈت پریم ناتھ بزازؔ اور ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کو بھی اُن کے احباب میں شامل ہونے کا فخر حاصل ہے۔

کشمیری زبان میں پہلا اخبار ''گاش'' نکالنے کا سہرا حضرت مہجورؔ کے سر ہے لیکن آزاد کے ایک خطوط کے اس اقتباس سے اُن کی گہری دلچسپی بالکل عیاں ہے۔ خط کے انداز بیان سے ایسا لگتا ہے کہ اخبار ''گاش'' کے شایع کرنے میں آزاد کا بھی بڑا دخل تھا۔

ہم نے کشمیری زبان میں اخبار نکالا ''گاش'' نام رکھا، ایڈیٹر محمد امین (ابن مہجور) ہے پرچہ اسی ہفتہ پہنچے گا، ڈھائی روپیہ بھجیں، خریداری میں اُن کی امداد کرنے میں دلچسپی لو''

''کشمیری زبان اور شاعری'' کا مواد جمع کرنے کے لئے اُن کو دور دور کی مسافت طے کرنا پڑی۔ اس سلسلہ میں اُن کے زخم ہائے جگر کا شمار کرنا اس وقت میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ عارضؔ کو ایک خط میں تاکید کرتے ہیں ''دورے کے دوران میرے کام کا خیال رکھیں، کہیں کسی غریب شاعر کا پتہ لگے تو کم وبیش اُن کے متعلق واقفیت بہم پہنچا کر مجھے اطلاع دیں، میرا یہ کام روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ (۵ہاڑ ۱۹۹۶ب)

کشمیری زبان اور آزاد کا معاملہ یہ تھا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

[1] غلام ڈار زوہامہ بھی کئی سال پہلے انتقال کرچکے ہیں۔

۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی ''کشمیر'' ترتیب دینے کے سلسلہ میں کشمیر تشریف لائے۔ بزاز صاحب کی وساطت سے ڈاکٹر صوفی اور آزاد کے درمیان شناسائی کا آغاز ہوا۔ بمبئی سے آزاد کے نام ایک خط میں صوفی صاحب لکھتے ہیں۔ یہ خط ۱۸/جولائی ۱۹۴۷ء کا ہے۔

جناب آزاد صاحب!

السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ بڑی دیر کے بعد مجھے یہ معلومات ملیں۔ جناب عشائی صاحب کو کئی بار لکھا۔ وہ آپ کے منتظر بھی رہے کہ آپ سرینگر اُن سے ملیں گے اور میرا مرسولہ پروف باب ہشتم کتاب ''کشیر'' جس میں آپ کا ذکر خیر ہے پڑھ کر، کشمیری اشعار کی صحت کروا کر مجھے واپس ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ آپ نہ آسکے اور آخر کار پرتھی ناتھ پشپ صاحب ایم۔اے پرتاپ کالج نے دیکھ کر واپس کیا۔ اگر آپ بھی ملاحظہ کرتے تو مجھے مزید اطمینان ہوتا۔ خیر شاید مہجور صاحب نے دیکھے ہیں آپ کے ان معلومات کو اب ضمیمہ کے طور ہی دیا جاسکتا ہے۔ مجھے آپ کا پتہ ہوتا تو آپ کو براہِ راست لکھتا۔''

پریم ناتھ پردیسی جو ''کلچرل محاذ'' کے ایک اعلیٰ رُکن تھے ۴۸۔۱۹۴۷ء میں آزاد کو اس میں شمولیت کے لئے دعوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اس سے قبل میں نے آپ کو ایک خط لکھا تھا۔ پھر ''کلچرل محاذ'' کی طرف سے بھی خط لکھوایا کہ آپ مہربانی کر کے فوراً یہاں تشریف لائیں کیونکہ اس وقت ملک کو آپ کی اشد ضرورت ہے اگر اس بار بھی آپ بے رخی سے کام لیں گے تو مجھے سخت افسوس ہوگا۔ مہربانی کر کے فوراً تشریف لایئے اور ''کلچرل محاذ'' میں شامل ہو جایئے۔ ہم آپ کی راہ تک رہے ہیں''۔

اس سے پہلے کہ وہ ''کلچرل محاذ'' میں شامل ہونے کا فیصلہ لیتے۔وہ شدید طور بیمار ہوئے اور جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے۔اوائل اپریل ۱۹۴۸ء کو اس جہانِ فانی سے چل بسے۔

اس کے علاوہ آزاد نے غلام نبی عارضؔ کے نام ۱۶/کتک ۱۹۹۷ ب (مطابق ۲۸/اکتوبر ۱۹۴۰ء) کو ایک کشمیری خط بھی لکھا ہے جو ایک اردو خط کا حصہ ہے۔طوالت کے خوف سے اقتباس پیش کرنے سے احتراز کرتا ہوں۔ اسلئے علامہ اقبالؒ کا یہ سدا بہار شعر پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

☆☆☆

# کتاب نامہ

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | کلیاتِ آزاد | مرتبہ ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو | مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی سرینگر |
| ۲ | کشمیری زبان اور شاعری | جلد اول | مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی سرینگر |
| ۳ | کشمیری زبان اور شاعری | جلد دوم | مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی سرینگر |
| ۴ | کشمیری زبان اور شاعری | جلد سوم | مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی سرینگر |
| 5 | گاشِر | موتی لال ساقی | مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی سرینگر |
| ۶ | سون ادب (۱۹۶۹ء) | موتی لال ساقی | مطبوعہ کلچرل اکیڈیمی سرینگر |
| ۷ | وولرٕکی ملر۔۳ | موتی لال ساقی | حلقہ ادب حاجن سوناواری |
| 8 | اَنکہٕ وَن | موتی لال ساقی | حلقہ ادب حاجن سوناواری |
| 9 | ماہنامہ "تعمیر" مارچ ۷۶ | شمارہ ۔۳ | نظامت اطلاعات جموں وکشمیر |
| ۱۰ | کٲشُر | ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی | نظامت اطلاعات جموں وکشمیر |
| ۱۱ | شاعر انسانیت | پریم ناتھ بزاز | نظامت اطلاعات جموں وکشمیر |
| ۱۲ | کلیات اقبالؒ اردو/ فارسی | | |

اسکے علاوہ میں اپنے محترم و مشفق دوست سرگباشی شری موتی لال ساقی (وفات: مئی ۱۹۹۹ء) کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے آزاد کے نجی خطوط کی فائل اور اُس سے متعلق دیگر ضروری مواد فراہم کیا۔

# مکتوباتِ مہجورؔ

اسے مہجور کی خوش بختی ہی سمجھئے کہ اُس کی شخصیت کے پروان چڑھانے میں تاریخ کشمیر کے پرآشوب دور کا ہاتھ رہا۔ مہجورؔ خود بھی زمانے کا نبض شناس تھا جو فنی تقاضوں کو عوامی مزاج کے مطابق ڈھالنے کو اوّلیت دیتا تھا اور عصری سیاسی مزاج سے اپنے شعری آہنگ سے ہم آہنگ کرنے کی نزاکت کو بخوبی سمجھتا تھا۔ یہاں ہمیں مہجورؔ کی شخصیت اور اُس کے فن کو موضوع بحث نہیں بنانا ہے بلکہ چند ایک مکتوبات کے تعلق سے اُس کی زندگی کے باطنی پہلوؤں کو اُجاگر کرنا ہے۔ غالبؔ کے خطوط سے اُردو، ادب میں جدید خطوط نگاری کی شروعات ہوئیں۔ یہ خطوط غالبؔ کی بلند قامت شخصیت کے اندرون کو بلا تردد تامّل ہمارے سامنے رکھتے ہیں، اس میں غالب نے کسی تکلف کو روا نہیں رکھا جس سے اُسکے اُسلوب نگارش کا حُسن دوبالا ہوگیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے جیل سے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کے نام خطوط میں ہندوستان کی تہذیب وثقافت کے گراں قدر ورثہ کی نشاندہی کی۔ حالیؔ، غالبؔ، سرسیدؔ، اقبالؔ اور سب سے بڑھکر مولانا ابوالکلام آزادؔ کے خطوط کو غبار خاطر کی صورت میں مدنظر رکھئے تو خطوط نگاری کا جادو سر چڑھ کے بولنے لگتا ہے۔ ان ممتاز ادبی وسیاسی اور ہمہ جہت

شخصیات کے خطوط کا ذکر ضمناً اس لئے کیا گیا تا کہ یہ امر واضح ہو جائے کہ ان کا اُسلوب نگارش بھی تحریک آزادی ہند کا مرہون منت ہے، یہ ٹھیک ہے کہ ایسے حالات کی عدم موجودگی میں اُن کے خطوط کا معنوی حُسن اگر زیادہ مختلف نہیں ہوتا لیکن اتنا جاذبِ نظر اور دلکش نہیں ہوتا۔

مہجورؔ کو اپنے دور کے تعلق سے اس حیثیت سے بھی اولیت حاصل ہے کہ اُس نے ۵ ر ستمبر ۱۹۳۴ء کو نمائش گاہ سرینگر میں ایک کل ہند مشاعرے میں پہلی بار کشمیری نظم پڑھی۔ اس مشاعرے میں ہندوستان بھر کے صفِ اول کے شعراء کے علاوہ اُس وقت کی کابینہ کے سبھی ارکان اور ریاستی انتظامیہ کی سر برآوردہ شخصیات بھی موجود تھیں۔

اس ضمن میں سکرٹری مشاعرہ کمیٹی نُمائش گاہ سرینگر خواجہ غلام محمد صادقؔ کا مہجور کے نام لکھا ہوا یہ دعوتی مکتوب تاریخی اہمیت کا حامل ہے:-

نُمائش گاہ سرینگر

۱۳ ر ستمبر ۱۹۳۴ء

بخدمت جناب منشی غلام احمد مہجور صاحب۔ سرینگر

مکرمم! سلام مسنون!

نُمائش گاہ میں زیر سر پرستی نمائش کمیٹی ایک ادبی مشاعرہ کا انتظام کیا گیا ہے۔ براہ کرم شرکت فرما کر اپنے کلام معجز نظام سے ارباب ذوق کو محفوظ کریں۔ مشاعرہ بتاریخ ۱۵ ر ستمبر ۱۹۳۴ء بوقت ساڑھے چھ بجے شام شروع ہوگا۔

احقر محمد صادقؔ

سکرٹری مشاعرہ کمیٹی نمائش گاہ سرینگر

مہجورؔ کو جن ممتاز شخصیات سے سلسلہ مراسلت رہا اُن میں علامہ اقبالؔ، مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی، ڈاکٹر مفتی محمد صادق (قادیان)، عرش ملسیانی، اسد اللہ کاظمی اور عبدالاحد آزاد وغیرہ شامل ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور سے مہجور کے سلسلہ مراسلت کا ابھی تک کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوا ہے۔ مجھے دسمبر ۱۹۸۲ء میں ساہتیہ اکادمی کی وساطت سے مغربی بنگال جانے کا موقعہ ملا۔ میں نے وہاں تقریباً سبھی ثقافتی اداروں کی زیارت کی۔ بنگالی لوگ ایک صاحب بصیرت قوم ہونے کے ناتے ٹیگور کی زندگی کے ہر حرف وصدا کو محفوظ کر چکے ہیں میں نے کلکتہ میں ٹیگور سے منسوب ہر ادارہ دیکھا۔ میں شانتی نکیتن بھی گیا۔ کافی تلاش و جستجو کے باوصف مجھے ٹیگور...... مہجورؔ کو خط وکتابت کا سراغ لگانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر میں نے ٹیگور میوزیم کی مطبوعہ یادگاری فہرستیں بھی دیکھیں۔ یہاں بھی میں اس رشتہ کی ٹوہ لگانے میں ناکام ہی رہا۔ اس نشست میں صرف وہ خطوط نقل کیے جا رہے ہیں جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

ڈاکٹر مفتی محمد صادقؔ قادیان (پنجاب) مہجور کو قطعہ تاریخ لکھنے کی یوں فرمائش کرتے ہیں۔

قادیان

۲۵ر ستمبر ۱۹۴۰

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

عزیز مکرم غلام احمد صاحب!

ع کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ مجھے معلوم ہوا

ہے کہ آپ شعرو اشعار کے اشغال کے سبب بہت شہرت رکھتے ہیں۔اس واسطے مجھے خیال ہوا کہ میں آپ کو ایک خط لکھوں کہ آپ میری نوزائدہ دختر کی پیدائش کے متعلق ایک نظم بزبان کشمیری لکھ کر ارسال کرادیں۔ جب آپ قادیان میں تھے، اُسوقت جو میری بیوی تھی وہ فوت ہوگئی۔اُس کے بعد میں نے مالا بار (جنوبی ہند) کی عورت سے پچھلے سال شادی کی۔اُس کا نام رقیہ ہے اُس کے بطن سے ۱۹ر مئی ۱۹۴۰ء کو لڑکی پیدا ہوئی، جسکا نام رضیہ رکھا گیا۔کئی دوستوں نے رضیہ کی پیدائش پر نظمیں، قطعات اور تاریخیں لکھ کر بھیجی ہیں میرا ارادہ ہے کہ ان سب کو کتابی صورت میں چھپوالیا جائے۔اور مجھے خیال آیا ہے کہ بلحاظ پُرانی محبتوں کے اس میں آپ کا بھی حصہ ہو۔

والسّلام

خادم: مفتی محمد صادقؔ

ایک خط جو یہاں درج کیا جارہا ہے، مہجور کاشمیری اور گنگا دھر بٹ دیہاتی کی جانب سے کسی انڈین لٹریچرس کانفرنس کے بے نام مہتمم کے نام باالخصوص جب یہ کشمیر کے ممتاز ادیب اور شاعر کیطرف سے لکھا گیا۔اس خط کی صحت پر شک گزرنا بعید از قیاس نہیں، کیونکہ اسکا متن مہجورؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں۔اس ضمن میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ گنگا دھر بٹؔ دیہاتی کا نوشتہ ہے کہ نہیں خط حاضر ہے معزز قارئین خود ہی فیصلہ کریں۔

پیارے دوست!

انڈین لٹریچرس کانفرنس میں دعوت کے لئے شکریہ۔ سچ مچ ایسی کانفرنس کی بے حد ضرورت اور اُس کے لئے آپ کی کوششیں ملک اور قوم کے مبارکباد کی مستحق ہیں۔ہمیں خوشی ہوتی اگر اس میں شامل ہونے کا فخر ہمیں

حاصل ہوتا۔ مگر یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے جس سے شاید آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ ہندوستانی ادیب کی قسمت میں ہی افلاس اور تنگ دستی لکھی ہے۔ اور تو اور اس بارے میں خود پریم چند کی زندگی درسِ عبرت ہے۔ ہم راقمان میں سے ایک کشمیری ایسی پسماندہ زبان کا شاعر ہے۔ اور دوسرا اُردو زبان کا ادیب۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے کہ ہماری بہت محدود آمدنی اس سفر خرچ کو برداشت نہیں کر سکتی اور بادل ناخواستہ ہم درد بھرے دل سے آپ کی دوستانہ دعوت کو قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ بدقسمتی تو دیکھئے کہ ایک معمولی رقم نہ ہونے سے ہم زندگی کے ایک سُنہری موقعہ ہاتھ سے کھو رہے ہیں جس موقعہ سے مستفید ہونے کے لئے ہم ہزاروں روپے خرچ کرنے پر تیار تھے۔ کیا آپ کی کانفرنس سامنے ہندوستانی ادباء کی تنگدستی مدِ نظر نہیں تھی؟ اگر تھی تو اُسکا حل اس نے کیا سوچا ہے؟ یا اس کانفرنس کے بلانے والوں نے ہندوستان میں بھی برنارڈ شاہ اور پرل بک ایسے ادباء کی توقع رکھی تھی جو دولت میں کھیلتے ہیں اور اکثر اوقات سونے کے چمچے منہ میں لیکر پیدا ہوتے ہیں۔ ہم آپ کی کانفرنس کی کامیابی کے دُعا گو ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اس مشکل کا بھی آپ کوئی مؤثر حل تلاش کرینگے۔

آپ کا مخلص

مہجور کاشمیری دیہاتی کشمیری

معرفت پوسٹ ماسٹر پلوامہ کشمیر

کشمیر کے بارے میں لکھی گئی تاریخ ''کشیر'' کے مصنف ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی جو ابتداء میں دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان میں صوبہ سندھ کے گورنر رہے، بھی بسلسلہ تحقیق سرینگر میں مقیم

رہے، کا ایک پوسٹ کارڈ بھی مُلاحظ فرمائے جس میں کشمیر کا یہ ممتاز دانشور اور مؤرخ مہجور اور محمد امین ابن مہجور سے کچھ استفسار کرتا ہے۔ مختلف امور میں اُلجھے بغیر جو اس خط میں اُبھارے گئے ہیں، اس بات کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے صوفی صاحب سے میاں محمد امین معاوضہ کی توقع ہی نہیں تقاضہ کا دامن بھی پھیلائے ہوئے تھے۔ ع

حق مغفرت کرے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں لیجئے خط بھی مُلاحظہ فرمائے۔

سرینگر۔ شنبہ ۱۱رنومبر ۱۹۴۴ء

پتہ: ڈاکٹر صوفی

معرفت پوسٹ ماسٹر سرینگر

جناب مہجور صاحب!

السلام علیکم!

مزاج شریف آپ کی ہمراہی سے آدن پور، خان پور، حیات پور اور بہرام پور معلوم ہوئے۔ لیکن کئی ایک مسائل ابھی بھی حل طلب ہیں۔ حیدر ملک کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ قلعہ خانپور نہ تھا بلکہ آدن پور تھا۔ لیکن ہم دونوں کو قلعہ کا کوئی نشان نظر نہیں آیا۔ آپ نے یہ زمین چپہ چپہ چھانی ہے۔ آپ کو کچھ معلوم ہے؟ محمد کوٹ کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ میں نے تاریخ جموں از حشمت اللہ خان صاحب دیکھی، لیکن مظفر آباد میں اُسکا بھی پتہ ندارد۔ چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما؟ تاریخ حسن میں آپ نے اُس دن بربل پڑھا تھا، لیکن آپ بتا نہ سکے کہ کہاں ہے؟ آج سٹائن میں بربل کا پتہ چلا۔ ہربل توسہ ٔ مادان کا برج تھا۔ سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قراء بہادر عمزادہ

حیدر کاشغری ادھر ماموٗر رہوا تو ہر بل کے خیال سے محمد کوٹ بھی اُسی جانب ہوگا مظفر آباد نہیں ۔ گو کہ ایک راوی قراء بہادر کا بارہ مولہ جانا بھی لکھتا ہے اس لئے شاید ادھر بھی امکان ہو۔ سٹائن دانگل قلعہ کا پتہ جنوبی وتستہ پر بتلاتا ہے۔

۲۔ گنڈِ نعمت کا پتہ چلا ؟ آپ کے جواب کا اب منتظر ہوں ؟ ۳۔ میاں امین نے ابدال رینہ سپہ سالار شہاب الدین بتایا تھا، مگر کوئی تاریخ اس نام کا کوئی ذکر ہی نہیں کرتی ۔ صرف سید حسین ہراوٗل فوج بتلاتے ہیں ۔ میاں امین سے دریافت فرمائے ۔ آزاد صاحب کا انتظار ہے۔ اپنا انتخاب ہمراہ لادیں تاکہ درج کرسکوں ورنہ دیر ہوگئی تو ناممکن ہوگا۔ ستیارتھی صاحب کل شام آئے تھے آج لاہور پدھارے ہیں ۔ آپ سے ملنے کے مشتاق تھے نیز آزاد سے۔

آپ نے فرمایا تھا کہ میاں امین آوینگے ۔ ابھی تشریف نہ لائے اُنکو بول دیجئے کہ میں کوئی محمود نہیں کہ فردوسی کو صلہ دے سکوں ۔ میں خود مفت کام کرتا ہوں اور احباب سے بھی مفت ہی کی اُمید رکھتا ہوں ۔ یہ صرف وطن کی خدمت ہے اور بس ! خدا کرے کہ یہ عریضہ آپ کو جلد ملے اور جواب آپ کے مجھے جلد ملے !

والسلام

غلام محی الدین صوفی

مہجورؔ کی کے شعری کا ناموں کا شہرہ دوٗر دوٗر تک پہنچ چکا تھا چنانچہ اُردو رسالہ " آجکل " کے اُسوقت کے مدیر جناب عرش ملسیانی اُس سے تین چار نظموں کے اُردو، تراجم کی درخواست کرتے ہیں کہ رسالہ " آجکل " میں شائع کر کے اُردو دان طبقہ کو کشمیری شاعری کے جدید تر رجحانات سے روشناس کرایا جا سکے۔

Publication Division Ministry of
Information And Broadcasting

اولڈ سکریٹریٹ دہلی

۲۱؍مئی ۱۹۶۹ء

محترمی تسلیم!

کشمیری زبان پر آپ کے احسانات ہیں اس زبان میں آپ کی شاعری کو اردو دان طبقے سے روشناس کرانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کا کلام شائع کیا جائے۔ کشمیری زبان میں اپنی تین چار نظمیں اُردو ترجمے کے ساتھ ارسال فرمایئے۔ ایک نظم تو ''آج کل'' کے سالنامے میں شائع کردی جائیگی۔ اور باقی ممکن ہوا تو کسی اور شمارے میں ...... میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ آپ کی شاعری پر ایک بسیط مضمون لکھا جائے اور آپ کی تصویر کے ساتھ اُسے ''آج کل'' میں شائع کیا جائے۔ اس کیلئے اگر آپ مصالا ارسال فرمادیں تو عین نوازش ہوگی۔ نظم شائع ہوگی تو اُسکا حسبِ قواعد معاوضہ بھی ارسال کیا جائیگا۔

نیازمند

عرش ملسیانی

جنابِ مہجور

کشمیری نظمیں ترجمے کے ساتھ آجکل میں شائع بھی ہوئی تھیں کہ نہیں یا مضمون کے لئے مصالا بھیجا بھی گیا تھا کہ نہیں؟ اس ضمن میں وثوق سے کچھ نہیں کیا جاسکتا۔

محمد حبیب الرحمان خان شیروانی سے بھی مہجور کے آپسی مراسم تھے۔ اُن کا ایک جوابی مکتوب (پوسٹ کارڈ) پیشِ خدمت ہے۔

جنابِ من!

تسلیم! عنایت نامہ پہونچا۔ نظام الدین صاحب فوق کی جو خدمت میں

کرسکوں گا، اُس سے انشاء اللہ دریغ نہو گا۔ اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہونگے۔

والسلام!

۳/شعبان المعظم حیدرآباد محمد حبیب الرحمان شیروانی

اسی طرح شری موتی لال دھر کا انگریزی میں جوابی خط اس بات کا غماز ہے کہ مہجورؔ تاریخ کشمیر مرتب کرنے کا منصوبہ باندھ چکے ہیں خط کا ترجمہ حاضر ہے!

شری ایم۔ایل۔دھر

ایم۔ایس۔سی، پی۔ایچ۔ڈی، ایف۔آر۔آئی۔سی

آپ کے عنایت نامہ کا شکریہ۔کاش مجھے اردو، لکھنا آتی! لکھنے کو تو لکھ سکتا ہوں لیکن ایسا نہیں کہ آپ کو پسند آجائے۔ مجھے اُن غلطیوں کا بھر پور احساس ہے جو مجھ سے اُردو میں سرزد ہو سکتی ہیں۔

مجھے بلاشبہ یہ جانکر انتہائی مسرت ہوئی کہ آپ کشمیر کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے یہ ایک عظیم کام ہوگا۔آپ نے لکھا ہے کہ آپ لکھنؤ آرہے ہیں۔برائے کرم تشریف لائیے اور میرے ہاں قیام کیجئے۔

آپ کو اپنے درمیان پا کر ہمیں بے حد شادمانی ہوگی۔لکھیئے کہ آپ کب اور کس تاریخ کو آرہے ہیں تا کہ میں سٹیشن جا کر آپ کا استقبال کرسکوں۔

بصد احترام واکرام

آپکا مخلص

موتی لال دھر

جناب محمد یوسف ٹینگ کلیاتِ مہجورؔ کے ایک باب "مہجور کی

تصنیفات وتالیفات، کے آخر میں یوں رقمطراز ہیں ''مہجور تاریخ کشمیر کا مسودہ ترتیب دے رہے تھے ، اس سلسلہ میں وہ خاکہ (Synopsis) کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ مہجور اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد وزیر اعظم ونائب وزیر اعظم جموں وکشمیر دونوں نے یہ مسودہ دیکھا۔ اُنہوں نے اس میں گہری دلچسپی دکھائی۔ شاید شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۵۰ء میں اُسے اسی سلسلہ میں دہلی اپنے ساتھ لیا جہاں مہجور نے بہارستان شاہی کا مسودہ نقل کیا۔ شیخ صاحب نے اُسے کچھ اہم کتب بھی مہیا کیں جنکا ذکر مہجور کرتا ہے۔ نہ معلوم پھر یہ تالیف کیا ہوئی؟

اپنے فرزندار جمند محمد امین کے نام ایک نجی خط میں دیکھئے کہ مہجور کتنے گھریلو مسائل کو چھیڑتے ہیں۔ مشاعرے کی اہمیت اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لئے دیکھئے کہ وہ تقریب کی جزئیات کا ذکر کس انہماک واحتیاط سے کرتے ہیں، باالخصوص اہم سیاسی شخصیات کے ساتھ۔

ٹنکی کدل سرینگر

۲۰ کاتک ۲۰۰۸ ب

عزیزم محمد امین سلمہ اللہ تعالیٰ!

میں آپ سے رخصت ہوکر پلوامہ سے جیپ کار پر شام کو سرینگر پہنچا۔ کھانا کاظمی صاحب کے گھر کھایا۔ ۹ بجے رات نیڈو ہوٹل ہال میں شامل مشاعرہ ہوا مشاعرہ صرف اُردو زبان میں ہوا۔ مشاعرہ کی صدارت راقم نے بہ تحریک مولوی سعید اور بہ تائید جناب شیخ صاحب قبول کی۔ مشاعرہ میں اکثریت ہندوستانی شعراء کی تھی۔ مشاعرہ کامیاب رہا۔ جوش ملیح آبادی کا کلام جوش وخروش

سے سنا گیا۔ کشمیری شعراء میں سے مرزا کمال الدین صاحب کا گلِ زعفران بے حد پسند کیا گیا۔ یہاں سے فراغت حاصل کر کے ۱۲ بجے رات سرکاری موٹر پر ٹنکی کدل آیا۔ دوسرے دن چار بجے شیخ صاحب نے ایمپوریم میں شعراء کو ٹی پارٹی دی، راقم بھی شامل ہوا۔ وہاں سے کاظمی صاحب کے مکان پر مع نفر پھر شام کا کھانا کھایا۔ اور نو بجے رات ایس پی کالج ہال کے مشاعرہ میں شامل ہوا۔ کاظمی صاحب کی صدارت میں اُردو، اور کشمیری زبان میں مشاعرہ میں شامل ہوا۔ راقم نے نوٗ کشیر (نیا کشمیر) کی نظم پیام نمبر ۳ سے سنائی ۔ بہت پسند ہوئی۔ جناب بخشی صاحب اور شیخ صاحب ہال سر پر اُٹھایا۔ ۹ اور ۱۰/ نومبر ۱۹۵۱ء کو یوم حبہ خاتون کا جلسہ ہے اس جلسہ کے بعد انشاء اللہ متریگام آؤنگا۔ حامل ہذا قفل کے متریگام میں رہ جانے سے لاعلم ہے۔ اس کو بے خبر ہی رکھیں۔ حامل ہذا احمد ڈار قیصر لولہ کے ہاتھ بکس ارسال ہے چونکہ حامل ہذا ایک نقل انگریزی ٹائپ، یعنی نقل فیصلہ رام چند راز دان زیر نگرانی احمد ڈار وہاں متریگام میں رہ گئی ہے۔ تلاش کر کے ارسال کریں۔ رشید احمد کو شاید معلوم ہوا۔ براده چار پائی پر تھا۔ ضرور تلاش اور جد و جہد سے دستیاب کر کے حامل ہذا کے حوالہ ایک۔ اسکی اپیل اسی نقل کے لئے رُک گئی ہے۔ بکس کیساتھ اسکو جلدی واپس کریں۔ اگر ممکن ہو سکے تو عزیز وائیں کو جلدی سرینگر بھیجدیویں۔ اور جن چیزوں کی ضرورت ہوگی، اسکے ہاتھ بھیجدونگا۔ میرا ارادہ ہے کہ آج یا کل ویٹرنری والوں کے ساتھ بیل کا فیصلہ کر لونگا۔ اُن سے تین ماہ کا خرچ بھی وصول کرنا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے آدمیوں کے ذریعہ بیل واپس لینگے۔ ۳ انچ قبضہ جات کی تلاش جاری ہے، اگر دستیاب ہوئے تو ارسال کرونگا۔ محمد شعبان آری کش آج یارِ کلان جائیگا، پرسوں آپ کے پاس معہ آرہ پونچیگا۔ عبدالرحیم نوٗر باغ ابھی تک نہیں مِلا۔ آج

نفر وہاں جائیگا۔ اگر ممکن ہوا تو اُس کو کل یا پرسوں روانہ متری گام کرونگا۔ اُس صورت میں اپنی والدہ وغیرہ کو روانہ سرینگر کر دے ویں۔ عزیز شاہ صاحب سرینگر میں ہے۔ پرسوں بدھ وار کو روانہ گھر ہوگا۔ عزیز شاہ بانو کے لئے مضطرب ہے باقی خیریت۔

مہجورؔ کاشمیری

ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو عبدالاحد آزادؔ اور مہجورؔ کا وہ سخن فہم و سخن شناس ہم عصر ہے۔ جسکے تعلقات مہجور کے مقابلہ میں آزاد کے ساتھ نہایت گہرے تھے۔ یہی وہ ذاتِ مشفق ہے جو آزاد کے دُکھ سُکھ میں برابر کا شریک رہی، اور آخرالذکر کے دمِ واپسیں تک اُس کے دل کی دھڑکنیں صدا بند کرتی رہی۔

ڈاکٹر صاحب نے آزاد کی کلیات (مطبوعہ کلچرل اکادمی) ترتیب دیکر اپنی دوستی کا کماحقہ حق ادا کیا ہے، مہجور کے ساتھ بھی ڈاکٹر پدم ناتھ گنجو کے مراسم تھے اپنے خط میں وہ بڑی بے ساختگی سے مہجورؔ سے ہم کلام ہے کہیں کوئی غیر متعلق معاملہ نہیں چھیڑا گیا ہے۔ پیشہ کے تضاد کے باوجود ادبی ذوق کی آبیاری قابل تحسین ہے۔

کولگام کشمیر

۴رجنوری ۱۹۵۰ء

مکرمی مہجور صاحب! آداب عرض ہے۔

یہاں آئے تین ہفتہ گزر گئے طبعیت ناساز رہی، دل پریشان رہا۔ پورے تین سال تک ایک جگہ ساکن رہ کر وہاں سے اُٹھ جانا اور پھر ایک اجنبی

جگہ میں جڑ پکڑنا ایک اجنبی کا، کہیے کیا کوئی آسان بات ہے؟ نتیجہ یہ کہ آپ کے ''نیم مُلاقات''، یعنی خط نہ لکھا جائیگا۔ آپ کے صحت کی فکر لگی رہتی ہے سنائیے کیسے گزرتی ہے؟ خون کے دباؤ کی کیا صورت ہے؟ پرہیز جاری ہوگا۔ ہاں جاری رہے وہی ایک صوُرت طبعیت ٹھیک رکھنے کی ہے مجھے کولہ گام آکر یہ بات معلوم ہوئی کہ میں سرینگر سے اُتنا ہی دوُر ہوں جتنا کسی فرنٹیر والی جگہ سے ہوسکتا تھا۔ سرینگر آنا جانا یہاں سے مشکل ہے۔ راستہ ۱۲ میل انت ناگ تک کچا ہے اور یہی خصوصی مشکل ہے دوسرے یہ کہ سفر دو منزلوں میں طے ہونا ضروری ہے پہلے انت ناگ جانا پھر سرینگر۔ پہلا حصہ ٹوٹے پھوٹے ٹانگہ میں دوسرا لاری میں۔ پورا دِن یہ سفر کھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے میں اور رنجیدہ خاطر ہوں۔ لوگ یہاں مجھ سے ناواقف ہیں اور میں لوگوں سے ناواقف زمستان ہے۔ ادھر اُدھر جانا نتیجتاً مشکل۔ ان تاثرات کے زیر اثر طبعیت کا پریشاں نہ رہنا عجب ہوتا۔

ہاں! گھر میں سب سے کو میرا پرتپاک سلام کہیے گا۔ سب چھوٹوں کو اور بڑوں کو خصوصاً والدہ صاحبہ محمد امین کو میرا مؤدبانہ سلام عرض ہو۔

کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں۔ یوں تو جی چاہتا ہے کہ اب سے آئندہ آپ سے برابر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھوں۔ دُنیائی تفکرات کے ذکر سے بالا ہو۔ روز روز کے بلند و پست حادثات کی تاثیر سے پرے ہو۔ محض ادب اور ادبیات سے متعلق ہو۔ لیکن کیا ایسا ہوسکتا ہے۔ کیا ہمت باندھ کر بھی ارادہ پوُرا ہوسکتا ہے۔؟ کیا مجھ جیسا درمیانی عمر کا بشر آپ جیسے پختہ سِن بزرگ کے ساتھ عشق و محبت کی اَن گنت اور دوُر دراز داستان کی جھلکوں کو چھیڑ سکتا ہے؟ ایسا نہ ہو کہ بقول آپ کے کہنا پڑے ؎

لیکھتھ دردِسوزٕ کی غزل سوزٕ ناوے ووٚلو ژھس نہ مہجوراتھِ لولہٕ والنی

پھر خیال آتا ہے کہ نہیں ۔مہجور صاحب کا ادبی وجُود ایک تبرک ہے ہو سکے تو اسکو ادبی چھیڑ چھاڑ میں ضرور اُلجھانا چاہیئے کچھ نہ کچھ یادگار کے طور پر پس ماندہ گان کے لئے رہ جائیگا ۔اس خیال کو زیر نظر رکھکر اب سے آئندہ میری کوشش یہ ہوگی کہ آپ سے خط وکتابت مسلسل اور متواتر کرتا رہوں ۔ چہ جائیکہ آمنے سامنے ہوکر ملاقاتوں کا سلسلہ کم ہی کیوں نہو۔

ہاں ! ''نیا کشمیر'' کا ترجمہ کدھر پہنچا۔ کیا کوئی حصہ مکمل ہوا۔ کیا کیا ادبی مصروفیت ہے ان دنوں ؟

میں ۲۳/پوہ شام کو پلوامہ پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہوں یعنی پرسوں جمعہ ۲۴/پوہ کو میری ایک سرکاری شہادت تحصیل میں قلمبند ہونی ضروری ہے اُس کے بعد سری نگر جاؤنگا۔ کیا عجب کہ آپ سے بھی اچانک ملاقات ہوجائے ۔ بشرطیکہ اتفاقاً آپ پلوامہ میں ۲۳/پوہ کو ہوں ۔ بہرحال میں خط کے انتظار میں یہاں رہونگا۔ بھوشن لال سامنے بیٹھا ہے یہ معلوم کر کے میں مہجور صاحب کو خط لکھ رہا ہوں ،خوش ہوا، کچھ ہنسا اور کہا کہ ''عبدمتو'' کو ''خش'' کرنے والے مہجور صاحب کو میرا بھی سلام لکھیں ۔

آپکا

پدم ناتھ گنجو

۱۹۵۱ عیسوی میں مہجور شیخ صاحب کے ساتھ دہلی چلے جاتے ہیں ، غالباً تاریخ کشمیر مرتب کرنے کے سلسلہ میں جسکا ذکر پہلے بھی آچکا ہے ۔ اسد اللہ کاظمی ، جواُسوقت ریاست جموں وکشمیر کے ناظم تعلیمات تھے ، کے خط

سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے ورنہ محمد امین سے فہرست مکتب مکنوانے کا مقصد ہی کیا ہوسکتا تھا۔

جموں توی

۱۵/مارچ ۱۹۵۱ء

لیجیے صاحب ہم اس زمانہ میں آپ کے کشمیر بھی ہو آئے۔ ۸/مارچ کو گیا اور ۱۳/کو واپس ہوا۔ میرا قدم کچھ ایسا ثابت ہوا کہ میرے پہنچتے ہی برف باری شروع ہوئی اور ۱۱/کیا بلکہ ۱۲/مارچ تک برابر جاری رہی۔ میں نے جموں کا رُخ کیا اُدھر برف باری بند۔ ابن مہجورؔ سے ملاقات نہ ہوسکی اُسکا افسوس رہا۔ ویسے میں نے اُن کو کتابوں کی اُس فہرست کیلئے کہلوا دیا تھا جسکا تذکرہ آپ نے اپنے خط میں کیا تھا، اُمید ہے کہ یہ اطلاع اُنہوں نے آپ کو بھجوا دی ہوگی۔

آپ کی سیاحت کا تھوڑا سا حال تو شیخ صاحب کی زبانی معلوم ہوگیا تھا۔ تو یوں کہیے کہ آپ ہندوستان کے چوٹی کے اہل اللہ کے مزاروں کی زیارت کر آئے۔ خدا کرے اس زیارت کے تاثرات کشمیر کے شاعر اعظم کی تخلیقی کیلئے مہمیز کا کام کریں۔

مجیب صاحب کا بھی خط ملا۔ اُنہوں نے کام شروع کر دیا ہے۔ اُن کے قلم سے اُمید تو ہے کہ شایانِ شان چیز نکلے گی۔ معلوم نہیں کہ آپ کی اُن سے ملاقات ہوئی یا نہیں۔ اگر ایک بار پھر آپ جامعہ ہو آتے تو کم از کم اتنا معلوم ہو جاتا کہ ڈرامہ[1] کس منزل پر ہے۔

آپ کب تک واپس آئینگے۔ اب تو بہت دن دہلی میں رہ لئے۔ اب

---

[1] یہ حوالہ ڈرامہ حبہ خاتون کا ہے

ادھر کا رخ کیجیے۔ آنکھیں ترس گئیں۔ آپ کے کپڑے حفاظت سے ہیں اطمینان رکھیئے۔

خان بہادر اور بچے آداب کہتے ہیں!

نیاز مند

اسد اللہ کاظمی

اسد اللہ کاظمی صاحب ایک اور خطہ میں مہجورؔ کو پروفیسر مجیب کو ڈرامہ حبہ خاتون تیار کرنے اور یوم حبہ خاتون مناتے کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی درخواست کرتے ہیں۔ کاظمی صاحب ایسے علم دوست، محبِّ وطن اور ادب شناس حضرات سے ہماری ہی بساط خالی ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

جموں توی

۱۱/اپریل ۱۹۵۱ء

یا حضرت مہجورؔ! آپ پر خدا کی سلامتی ہو!

چلتے وقت آپ کہہ گئے تھے کہ جاتے ٹیلیفون ہی کے ذریعہ اپنی خیریت سے پہونچ جانے کی اطلاع دینگے۔ آپ کو گئے ہوئے آج پورے تین دن ہوئے ہیں۔ خیریت کا آج تک منتظر ہوں۔ آپ کے یہاں سے روانہ ہونے کے بعد قبلہ شیخ صاحب سے معلوم ہوا کہ جموں ہوائی اڈے پر پہنچ کر آپ کو معلوم ہوا کہ آپکا ٹکٹ نہیں خریدا گیا۔ گھر آکر پوری کیفیت عبدالخالق سے معلوم ہوئی۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ راعنا صاحب سے یہ طے ہوا تھا کہ آپ جانے سے پہلے اُنکے یہاں سے ٹکٹ لیں گے اور وہ اپنا ایک آدمی آپ

کے ساتھ کرینگے۔ لیکن حضور آپ شاید سرینگر جانیکے لئے اتنے بیتاب تھے کہ یہاں سے فوراً اڈے روانہ ہوگئے۔ یہ سب کیفیت راعنا صاحب سے معلوم ہوئی آپ کو جو تکلیف ہوئی اُسکا افسوس ہوا۔

ہم لوگ ہر روز شام کو مہجور صاحب کا ذکر کر کے اُس خلاء کو پورا کرنا چاہتے ہیں جو آپ یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ کھانے کے وقت آپ بہت ہی یاد آتے ہیں۔ خیر انشائاللہ ایک ماہ کے اندر ہی ملاقات ہوگی۔ مجیب صاحب کے خط کا مضمون میں نے آپ کو بھی سُنا دیا تھا۔ اُمید ہے کہ آپ اپنی پہلی فرصت میں اُس کے متعلق کاروائی شروع کردیں گے اور وہاں جاکر مقامی کمیٹی یوم حبہ خاتون بنالینگے۔ میں نورالدین کو لکھ رہا ہوں کہ وہ قوالوں کی تلاش میں آپ کی مدد کریں اور جیپ کی جب آپ کو ضرورت ہو اُسکا بندوبست کریں، خانصاحب کو بھی خط بھیج رہا ہوں۔ حبہ خاتون کی قبر کی مرمت کرائیں۔ جن غزلوں کیلیے مجیب صاحب نے لکھا ہے اُسکا خاص دھیان رہے۔ دو حافظ کی ہیں۔

۱۔ اے نسیم سحر آرام گہہ یار کجاست

۲۔ صبا بہ لطف بگوآں غزال رعنارا

اور ایک حضرت امیر خسروؒ کی

۱۔ نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم

میں بہت بے چینی سے آپ کے خط کا انتظار کرونگا۔ خان بہادر اور بچے سلام کہتے ہیں۔ پُرسان حال کو سلام مسنون۔

خیر طلب

اسداللہ کاظمی

ریاست کی ثقافتی اور کشمیری زبان وادب کی تاریخ میں مہجور کے حق میں حکومت جموں وکشمیر کی جانب سے تاحیات سو روپے وظیفہ حُسن خدمت (pension) کی منظوری ایک اہم واقعہ ہے کاظمی صاحب مہجور کواس ضمن میں سرکاری احکامات کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

جموں توی

۲۶/دسمبر ۱۹۵۱ء

یا حضرت مہجور! السلام علیکم

شرمندہ ہوں کہ آج تک آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ داستان طوٗلانی مختصراً عرض کرونگا۔ ۵/دسمبر کو یہاں پہنچا۔ ۸/دسمبر کو جناب شیخ صاحب قبلہ کیساتھ دس دن کے دورے پر پونچھ چل دیا۔ وہاں سے ۱۹/دسمبر کو بیمار ہو کر لوٹا۔ دو تین دن تک صاحب فراش رہا۔ اب فضل خداوندی ہے۔ اچھا ہوں اور پہلی فرصت میں آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ آج جناب شیخ صاحب اور اُن کی حکومت نے ادب نوازی کی جو مثال پیش کی ہے وہ ذرا مشکل سے کہیں اور ملے گی۔ الحمد للہ! آج کابینہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کشمیر زبان کے شاعر اعظم کو مبلغ سو روپے ماہوار کی پنشن تاحین حیات دی جائے۔ خدا اس حکومت کے وزیر اعظم کو عمر نوحؑ بخشے اور اُن کی توفیقات میں اضافہ کرے۔ آمین ثمہ آمین۔ کشمیری زبان اور اُسکے تمدن سے محبت کرنے والے جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ احکامات انشاء اللہ جلد ہی صادر ہونگے۔ میری طرف سے اور خان بہادر کی طرف سے جناب ابن مہجور صاحب اور اُنکی والدہ ماجدہ صاحبہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کردیجیے۔ ہم لوگ سب دست بدعا ہیں کہ آپ اس پنشن سے برسوں فائدہ اُٹھائیں۔

اب ادھر کب آیئے گا۔ مجھے اس سال جناب صراف صاحب کا مکان ملا

ہے۔ یہ کافی کشادہ ہے اور اس میں باغ بھی ہے۔ آپکو پسند آئیگا۔ خدا کرے کہ اب آپ کی صحت بالکل اچھی ہو۔ عارف صاحب[1] پرسوں آئے ہیں۔ اُن سے یہ سن کر مسرت ہوئی کہ اب بفضلہٖ آپ بالکل اچھے ہیں۔ کیا پرہیز اب تک جاری ہے۔ یہاں سب آپکو آداب کہتے ہیں۔ ابن مہجور صاحب کو میرا اسلام پہنچا دیجئے۔

نیاز مند

اسد اللہ کاظمی

کاظمی صاحب کا ایک اور خط جو مہجور کے نام اُن کے واصل بحق ہونے سے صرف چالیس دن پہلے کا ہے اس لحاظ دلچسپ ہے کہ اس میں بھی وہ مجیب صاحب سے ڈرامہ حبہ خاتون تیار کرنے کے لئے بیحد مضطرب ہیں۔ اُن کی صحت کے بارے میں اُن کی تشویش اُنکے خطوط سے عیاں ہے۔

جموں توی

۲۶ رفروری ۱۹۵۲ء

صاحب! یہ کیا انداز ہے۔ امرتسر کے بعد سے جو آپ نے چُپ سادھی، تو کل تک ہمیں یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ آخر مہجور صاحب کا کیا ہوا۔ خدا خوش رکھے قبلہ شیخ صاحب کو کل اُن سے آپ کی خیر و عافیت معلوم ہو کر ذرا اطمینان ہوا۔ لیکن یا حضرت مہجور ہم لوگوں سے ایسا کون سا قصور سَر زد ہوا کہ آپ نے اتنی تکلیف بھی گوارا نہ فرمائی کہ دو سطر کا خط بھیج کر ہم لوگوں کو

[1] مرزا غلام حسن بیگ عارف

یہی بتا دیتے کہ آپ خیریت سے ہیں۔ آپ کے اخلاق کریمانہ سے ہمیں یہ توقع نہ تھی۔ شاید ہم ہی لوگوں [1] سے کوئی قصور ہوا ہے جو آپ نے ایسا برتاو روا رکھا۔

اُمید ہے کہ مجیب صاحب سے آپ کی ملاقات ہوگئی ہوگی اور اُنہوں نے حبہ خاتون کو زندہ کرنے کا انتظام شروع کر دیا ہوگا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یوم حبہ خاتون کیلیئے میں کس درجہ مضطرب ہوں۔ اگر ڈرامہ طیار نہ ہو سکا تو سارا مزہ کرکرا ہو جائیگا۔ زیادہ زیادہ۔

نیازمند

اسد اللہ کاظمی

اس سے قبل موتی لال ساقؔی کے ترتیب دیئے گئے۔ مہجور کے دس پندرہ خطوط جو اُنہوں نے عبدالاحد آزادؔ کو مختلف موقعوں پر لکھے ہیں، رسالہ ''نیب'' کے اپریل ۱۹۷۱ء کے شمارہ نمبر ۱۴، اور شیرازہ اُردو، جلد ۱۹۔ جنوری، فروری ۱۹۸۰ء شمارہ ۱۔۲ میں جگہ پا چکے ہیں۔ اُن سبھی خطوط کو یہاں درج کرنا باعث طوالت ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مہجور کی مراسلت کو یکجا کیا جائے تا کہ اُس کی شخصیت کے مختلف پہلو، کسی نہ کسی حد تک ہمارے سامنے آسکیں اور ہم خطوط کے جھروکے سے اُس کے اندرون کو کسی نہ کسی رنگ میں اور اپنی ثقافتی تحریک کے مختلف مراحل سے بھی آشنا ہوسکیں کیونکہ

تازہ خواہی داشتن گر زخمہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

---

[1] میں ایڈیٹر شیرازہ کا سپاس گزار ہوں کہ اُنہوں نے اپنی وساطت سے مہجور کے ہم عصر اکابرین کے اُن کے نام خطوط یہ مضمون ترتیب دینے کے لئے فراہم کئے۔ اس بات کا یہاں اعادہ کرنا مناسب رہیگا۔ کہ مقالہ پہلے شیرازہ اُردو کے مہجور نمبر ہی میں شائع ہو چکا ہے۔ (س۔ ر۔ پ)

# مہجور کی شاعری اور عصری سیاست

مہجور ۱۹۲۰ء کے بعد فارسی اور اُردو میں شعری کاوشیں ترک کر کے اپنی مادری زبان کشمیری کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ایک استفسار کے جواب میں اُس نے کہا کہ ''جب میرا وطن اور قومی شعور پختہ تر ہو گیا، میں نے دیکھا کہ کشمیری زبان کو ناقابل اعتنا سمجھا جاتا ہے، اور یہ بڑی پسماندہ ہے۔ ضمیر نے میری ملامت کی کہ میں اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر دوسری زبان کی خدمت کرتا ہوں۔ گذشتہ حالات و واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے میری آنکھیں کُھلیں کہ اس قدیم زبان نے بڑے بڑے صاحبِ طرز اور با کمال ادیب و شاعر پیدا کئے ہیں اور آج غیر زبان بولنے والوں کو کیا، کشمیریوں اور کشمیر زبان بولنے والوں کو بھی اس کی نفرت ہے۔ اسی امر کے پیش نظر میں نے عہد کیا کہ میں کشمیری زبان و ادب کی تہہ دل سے خدمت کرونگا۔ میں نے رسول میر اور حبہ خاتون کے مروجہ طرزوں پر طبع آزمائی شروع کی۔ مجھے جلد ہی اسبات کا احساس ہوا کہ میری ایسی غزلوں اور گیتوں کی صدائے بازگشت ہر طرف گونجنے لگی۔ اسی بات کی جانب بلراج ساہنی یوں اشارہ کرتے ہیں ''اگر مہجور آج کوئی گیت کہے تو کل وہ زبان زدِ عام ہوگا۔ بچے سکول جاتے جاتے، دیہات کی عورتیں دھان کاٹتے کاٹتے، مانجھی ناو کھیتے کھیتے، اور مزدور، کام کرتے کرتے

یہ گیت خوش الحانی سے اپنی اپنی لے میں گاتے ہیں۔ ناخواندہ اور پسماندہ ملک میں جہاں کسی بڑے شاعر کی چند ہی کتابیں خریدی جائیں وہاں مہجور کی شہرت ومقبولیت ایک بہت بڑا معجزہ ہے"۔

یہ اعجاز مہجور کے لوک آہنگ کا تخلیقی اور فنکارانہ برتاو تھا، جو اُسکی رومانی وعشقیہ شاعری تک ہی محدود ہے، سیاسی شاعری کرتے وقت سیدھے سادھے تجربات کا یہ جمال پرست شاعر زیادہ کامیاب ہوتا دکھائی نہیں دیتا ۱۹۱۴ء کے عالمی جنگ کے بعد سارے ہندوستان میں آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی۔ ۱۹۲۹ء لاہور کے کانگریس کے اجلاس میں مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کو چمن زارِ آزادی کو شہیدانِ وطن اپنے خون سے سینچ کر نئے صبح کے اُفق کی مانگ میں سیندور بھرتے ہیں۔ صدیوں تک غلام رہتے رہتے اب کشمیریوں کے صبر کا جام لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اپنی پابہ جولانی کو خاطر میں کیا لاتے۔ زنجیریں گرمیٔ رقص سے خود ہی پگھل گئیں۔ زوردار سیاسی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادیب اور شاعر اپنے زورِ قلم سے زندگی کی نابرابری کو مساوات میں بدل دینے کے لئے نکلے۔ حُسن وعشق کا معیار بدل گیا۔ علامہ اقبال کو یہاں تک کہنا پڑا۔

ہند کے شاعر وصورت گر وافسانہ نویس\
آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت سوار

۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین وجود پذیر ہوتی ہے اور پریم کو بہ بانگ دُہل یہ اعلان کرنا پڑتا ہے، کہ ہمیں حُسن کا معیار بدلنا پڑیگا۔ حیرانی کا مقام یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے وہ کب کا بدل دیا تھا، اُنہیں پھر بھی ترقی پسندوں کے صفحوں میں شامل کرنے کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ کیونکہ اُنہیں دِنوں

ادب اور ادباء پر ترقی پسندی کا بھوت اس طرح سوار ہو چکا تھا کہ سرمایہ دار کے خلاف اور مزدور کے حق میں کچھ نہ کہنا کفر کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اقبالؒ بھی عصری آگہی کا ثبوت دیتے ہوئے ''خدا کا فرمان'' فرشتوں تک پہنچا چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسا ادب بھی تخلیق ہوا جسمیں نہ تازگی و پُرکاری تھی، نہ آفاقیت و سدا بہاریت کا تیکھاپن جسے ادب و شاعری لافانیت سے ہم کنار ہوتی ہے۔

اسی سیاست سماجی و تاریخی پس منظر میں پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ کی سیاسی شاعری جنم لیتی ہے۔ وہ نئے رمز و کنایات سے کشمیریوں کو آزادی کی بشارت دیتے ہیں۔ ''سنگر مالن پھو پڑاگاش'' اسی قبیل کی نظم ہے، جسے کشمیری زبان کی جدید شاعری کا مبہم آغاز ہوتا ہے۔ جب قرصِ خورشید نمودار ہوتا ہے۔ تو کوہ مالائیں سب سے پہلے روشن ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ اس نظم سے کشمیری عوام کے شعور کی بلندیاں مُنور رہوئیں۔ مہجور نئے زمانہ کے خورشید تاباں کا اس انداز سے سواگت کرتے ہوئے ہمیں بھی شریک کرتے ہیں چراغان لالہ ہائے صحرا نظروں کے سامنے رقصاں نظر آتا ہے

| | |
|---|---|
| گٹہٕ ژج گاش آو گاہ تزوو لالن | گھپ اندھیرا رخصت ہوا، صبح طلوع ہوئی گل |
| سنگر مالن پھو پڑاگاش | لالہ نے دل کے چراغ جلائے اور کوہ |
| باغکی ریزل وارلبن گالن | مالائیں روشن ہوئیں۔ باغِ کی بُلبلیں شکرے پر |
| بُلبلہ غم تراوکُڈ پکھن واش | پنجہ زن ہونگیں اس لئے اے بُلبل پر پرواز تول، |
| ییتہٕ یور چوئے مذہب ژالن | اب تیرے ہی مذہب کی فرمانروائی ہوگی، کوہ |
| سنگر مالن پھو پراگاش | مالائیں روشن ہوئیں |
| ہرُدک طوٗفان پوشہٕ تھرٕ ژالن | خزاں کی خنک ہوائیں پھول کی |

سونتھ ییہ دوہہ اکہ ژلہ پُر خاشِ
سُے پھولہِ تن یُس دِیہِ جنجالن
سنگر مالن پھو پڑاگاش
گُل آفتابن موہر لیٔ تھالن
لولکہِ اسمانٔ ہیتھ آو راش
اسبند زولُس اُمٔ گُلِ لالن
سنگر مالن پھو پڑاگاش
مانہِ ژار مہجورؔ سخن مثالن
نٔرتھ ونہٕ ہے سر گوٚتھ فاش
دانا بوزن نادان نالن
سنگر مالن پھو پڑاگاش

بلبلیں سہہ لینگی، بہار ایک دن آ کے رہیگی اور درد کا مداوا ہوگا وہی کِھل اُٹھے گا جو دکھوں سے سینہ سپر ہوگا کوہ مالائیں منور ہوئیں گلِ آفتاب نے اشرفیوں کے خوانوں کے خوان بھر دئے اور آکاش سے محبت کا سوغات لئے حاضر ہوا، گل لالہ نے اسُبند جلاتے ہوئے اُسکا سواگت کیا۔ کوہ مالائیں منوّر ہوئیں۔ مہجور کی تمثیلوں اور تشبیہوں میں چھپے معانی سمجھ کھول کھول کر بیان کرتا لیکن ڈر ہے کہ راز فاش نہ ہوجائے دانشمندوں کے عقل کے دریچے کُھل جائینگے اور کم ظرف آسمان سر پر اُٹھائیں گے۔ کوہ مالائیں منور ہوئیں۔

اس نظم میں اِشاروں اور کنایوں میں مہجورؔ نے شخصی دورِ حکومت کی گھٹن کو اُجاگر کرتے ہوئے آزادی کے لئے مصائب جھیلنا لازمی قرار دیا ہے تاکہ آزادی کی بہاریں دیکھنا نصیب ہوں اور وطن مالوف کے ماتھے پر حریت کا جھومر سجایا جا سکے۔ کشمیری شاعری میں موضوعی نظمیں غزلیں وغیرہ تخلیق کرنے کی روایت کوئی نئی نہیں کیونکہ ان اصنافِ سخن کی قدیم ترین روایت، للہ عارفہ اور حضرت شیخ العالم نورالدین ریشیؒ کے بعد بھی ہمارے ہر بڑے شاعر نے آگے بڑھائی ہے۔ اس سلسلہ میں پرکاش کُری گامی، کرشنہ داز دان، پرمانند، وہاب پرے، صمد میر، شمس فقیر، محمود گامی، مقبول کرالہ واری اور رحمان ڈار وغیرہ قابل ذکر ہیں جنہوں نے اپنے تخلیقی پیرائے میں اس

شعری کہکشاں کی درخشندگی کو دوبالا کردیا۔ زندگی اور ادب میں چولی دامن کا ساتھ ہے، جب زندگی بے معنی اور بے مقصد نہیں تو شاعری کو اس سے کیسے مستثنیٰ قرار دیا جا سکے۔ کشمیری شاعروں نے ہر دور میں زندگی کو گلے لگایا ہے، مہجور بھی یہ فرض بخوبی انجام دیتا ہے اور ایک دورا ہے پر کاروانِ ادب کو گمراہی سے بچاتا ہے وہ مشاطۂ حُسن بھی بنتا ہے اور زندگی کا ترجمان بھی ۔ وہ انفرادی تجربات کے پہلو بہ پہلو اجتماعی لاشعور کی گتھیاں بھی سلجھاتا ہے۔ ''گل لالہ'' ایک علامت کا رُوپ دھار لیتا ہے اور مہجور غلامی کے صدیوں سے جاری وساری اثرات کا پردہ چاک کرتا ہے۔ وہ کشمیریوں کو اپنے چمنستان مینو نظیر کی آرائش میں شریک ہونے کی یوں دعوت دیتا ہے ؂

| | |
|---|---|
| ہا منو شہِ پوشن کیا چھکھ ژ چھان | ارے او ربھولے بھالے پھولوں تو کیا دیکھ رہا |
| پأدٕ کرپننے باغٕچ زان | ہے اپنے باغ کی ماہیت وکیفیت سے واقف |
| ییلہِ کھسہِ نوِ سمسارُک رَو | ہوجا۔ جب نئے جہاں کا خورشید طلوع ہوگا |
| گوڈٕ پیٖہِ چأنی ڈبہِ پرتو | تو پہلے تیرے ہی بام و در روشن ہونگے اُس کے |
| اِدٕ گوژھ روشن باقٕے جہان | بعد باقی دنیا کو روشنی نصیب ہوگی۔ اپنے باغ کی |
| پأدٕ کر پننے باغٕچ زان | ماہیت وکیفیت سے واقف ہوجا۔ |

''نالۂ کشمیر'' نظم میں مہجور ہمیں اپنے آباؤ اجداد کی عظمت وذکاوت کی یاد تازہ کرتے ہوتے اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ یہی تہی دست، نادار اور نہتے عوام اپنے تقدیر کے خود مالک ہونگے ۔ اس نظم میں یہاں کے فراواں حُسنِ فطرت کی نقاب کُشائی بھی کیگئی ہے لیکن اس میں غیرت وحمیت کا جذبہ بازیافت بھی انگڑائیاں لے رہا ہے ؂

تنبہِ لاواں پوشہِ نۄلن بلبلن گلزار میٲنۍ
سَنبہِ لاواں رٲوی متیٖ گُل آبشار سبزار میٲنۍ
بوتہِ یتھے اوسُس نہ اوسس وقتہِ اکہ بااختیار
دن گوٲہی میانہِ کنہِ یم پرٲنی کنہِ دیوار میٲنۍ
میانہِ گرِیو دآسہے کانہہ میانہِ بچنگ انتظام
پھیرہن ما وَندِ رٲژن در بدر نادار میٲنۍ
آے دوہ نزدیک جلدے نیر گژھِ پچھ پھیر نۄر
زۄنہِ ہندی پٲٹھی درینٛٹھی ہن وونی دۄرکوہ تے غار میٲنۍ

میرے گلستان وطن پوشنولوں اور بلبلوں کے دل موہ لیتا ہے، میرے سبزہ زاروآبشار کھوئے ہوؤں کو سوز دروں عطا کرتا ہے۔
میں بھی ایسا ہی تو نہ تھا، میرے بھی ایک وقت اختیارات تھے، میں بھی مختار کل تھا۔
میرے بدلے اس بات کی گواہی پتھروں کی یہ دیواریں دینگی۔ میرے اپنے گھر میں میری زندگی کے اگر اسباب ہوتے تو سرما کی ٹھنڈی راتوں کو میرے نادار کام کے لئے وطن سے باہر در بدر نہیں پھرتے۔
وہ دن دور نہیں جب اندھیرا پاکھ انجام کو پہنچے گا اور ہر طرف روشنی ہی روشنی ہوگی۔
دور ہی سے میرے غار اور میری گپھائیں مثل مہہِ تاباں بُقعہ نور بن کر اُبھرینگی۔و

یہ بات عیاں ہے کہ وادی کشمیر اگلے وقتوں سے ریشیوں اور منیوں کا مسکن رہی ہے۔ غاروں اور گپھاؤں کو عرفان ذات وکائنات میں خاصا دخل ہے۔ ان اشعار میں کشمیر کے تہذیبی آثار اور ثقافتی ورثے کی طرف صریح اشارے ملتے ہیں۔ مہجور کو اِس لئے ایسا کرنا پڑتا کہ وہ ہمیں عظمت رفتہ کی یاد دلاکر اپنی تخلیقی کاوشوں کی معنویت میں اضافہ کرسکیں یہ اشعار مہجور کی تاریخ شناسی کے بھی غماز ہیں۔

آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے ہر قوم کو قربانیاں دینا پڑی ہیں۔ مہجور کشمیری عوام کو اس بلیغ پیرائے میں تلقین کرتا ہے۔

تیلہِ لبکھ نزدیکھ پوشن جاے گلزارس اندر
نیہہ گٹہ بیلہِ پوشہِ تھرِتل رٗوٹ کنڈو دامانہِ چون

پھولوں کے پہلو میں تجھے جب ہی جگہ ملیگی جب اندھیرے میں پھولوں کو نگہداشت کرتے وقت کانٹے تیرا دامن تھام لینگے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ آسائشوں کے حصول کی خاطر غم وآلام کا سامنا کرنا مقدم ہے۔

کشمیری عوام نے اَن گنت قربانیاں دیں۔ قید وبند کے مصائب جھیلے۔ اور آخر کا شخصی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو عوامی طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبوُر ہونا پڑا۔ آزادی کا سورج طلوع ہوا تو مہجور نے ......اس عہد ساز واقعہ کا بجا طور یوں سواگت کیا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اُس نے عوامی احساسات وجذبات کو زبان عطا کی ہے۔

پوشن کرٗاو کر چھا وِ گلزار
آزادرٗ زتھ کم کھیون چھُ بہتر
پوشن کرٗاو کر چھا وگلزار
آلوس چائنس اوس درٗدُک اثر
مشتاق تتھ اُسی کھُلہِ جانہِ وار
آوازِ اوسے بندگی ہُند پھبھر
پوش کرٗاو کر چھا گلزار
مہجورِ مُشراو بندگی ہُند کمر
یپتہ چھکھ ژٕے ووٗنی خود مختار
دل چھُے حاکم تہِ زبو چھے نوکر
پوشن کرٗاو کر چھاو گلزار

ارے! او بُلبُل آزاد ہونے پر خوشیاں منا۔ پھولوں پرلوٹ اور گلعذار سے بھرپور تمتع اُٹھا۔ آزادرہ کر کم خوری بہتر ہے، پھولوں پر لوٹ اور چمن سے بھرپُور تمتع اُٹھا۔ تیری صداؤں میں درد کی تاثیر تھی، سبھی پرندے اُس کے مشتاق تھے۔ تیری آواز میں غلامی کی لکنت تھی ۔ پھولوں پر لوٹ اور گلعذار سے بھرپُور تمتع اُٹھا۔ اے! مہجور غلامی کی پیٹی کھول، یہاں اب تیرا ہی راج ہے، تو اب خودمختار ہے، تمہارا فرمانبردار تیرا دل ہے اور زبان تمہاری خادمہ۔ پھولوں پر لوٹ اور چمن سے بھرپُور تمتع اُٹھا۔

اس کے ساتھ ہی اُسے یہ احساس بھی اندر ہی اندر کُڑھتا ہے کہ کمزور اور ناتواں بے بسوں کی فریاد کوئی نہیں سنتا، یوں سمجھئے کہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کوئی نہیں سنتا ؎

چھُنہٕ نوتوانن کانٛہہ تہٕ واتن دادِ فریادس
کن کونہٕ تھوان بُلبُلن گُل آلوٕن نالن

اُسے قدرت کے اٹل الوہی قانون پر پورا بھروسہ تھا، اُسکا ارشاد ہوتا ہے۔ وقت پر چمن زارِ وطن ضرور کھِل اُٹھیگا، پھول چمن کی دعوت شگفتگی کا منتظر نہیں رہتا ؎

بے تاب مسالاگ وقتس پیٹھ چھُ پھولان باغ
چھِنہٕ پوش پڑاراں چمنہٕ کِمن سالن تہٕ سوالن

ہلکے ہلکے اندھیرے میں، میں جاگ اُٹھا تو ابابیلوں کی چہچہاہٹ میں نے سُنی ۔ میں نے جان لیا کہ موسم سرما کی بساط اُلٹ چکی ہے اور بہار ابابیلوں پر تو فگن ہے۔ ایسا کہتے ہوئے، مہجور اپنے وقت مقررہ پر زمانہ منقلب ہونے کی توقع کے سہارے زندہ ہے کیونکہ موسم سرما کے بعد بہار کی آمد لازم ہے ؎

ییہہٕ گٹہِ گوس بیدار کَن گُتی جہٕ بوُلن گوم
زونم زِ وَندٕ سور یئو پرتو ترٛ ووسونتہٕ کالن

اسی لئے وہ زمانہ سازی کے ساتھ ساتھ زمانہ شناسی پر بھی زور دیتا ہے تاکہ ہم دورِ جدید کی برکتوں سے بہرہ ور ہوسکیں۔

اس بات کا ارشاد اُس نے اپنی ایک اور نظم ”پتے کی بات سُن“ زمانے سے ہم آہنگ ہوجا” پےٚ بوٗزلے تھاوزمانس ستیٚ“ میں کیا ہے۔ سرسید احمد خان” مولانا حالی و دیگر اکابرین وقت نے اپنے اپنے زمانے میں زمانے کے نبض پر ہاتھ رکھنے کی تلقین کی ہے۔

پھر نہ پوچھئے کہ صبح آزادی طلوع ہونے کے بعد بھی عام آدمی کی حالت جوں کی توں رہی اور ۱۹۴۷ء کے عقب میں حاصل ہوئی برکتیں چند ہی گھرانوں تک محدود رہیں تو مہجور جیسا حساس شاعر یہ سب ایک تماشائی بن کر نہیں دیکھتا۔ ایک تخلیق کار کی آنکھ خون بہائے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔ اُسکے توقعات وجذبات کو بڑی ٹھیس لگی۔ وہ طنز کے تیر ونشتر سے لیس ہو کر میدان میں آنکلا۔

ثناسأری پٲروسانٮن گرن منز ژاىہِ آزأدی
سبتھاہ یُوگأنٕ اَسہِ کُن جلوٕ ہاوان آیہِ آزأدی
غریبی مفلسی بے بوج، ہستی ہیتھ خانہ وأرأنی
امی رٕژِ تراىہِ اَسہِ پیٹھ سایہ تراوان آیہِ آزأدی
یہ آزأدی گوڈٕنی ٲنی دژ ایہِ ییٚلہِ ہندوستانس منز
لچھو پأٹھی آیہِ انسانن تلان تلہٕ کرأیہ آزأدی
یہِ آزأدی چھےٚ تراوان مغربس کُن رحمت باراں
کران سأنس زٕمینس پیٹھ ژھرے گگرایہ آزأدی
یمے چیز اَسہِ غولامن اُسی ظأٖلم زورٕ مٕلی ہیاوان
کنان تی بازرن اندر گرتھ مُل ملیہِ آزأدی
یہِ آزأدی چھےٚ کو کراہ جان سونہٕ ہند ٹھوٗل کینہ تراو!ن
تمے کینہ ٹھوٗل ہیتھ ووٕنی بیٹھ موٗبنیہِ پرأیہِ آزأدی

خدا کا شکر بجالاؤ کہ ہمارے گھروں میں بڑی دیر وقت کے بعد آزادی جلوہ افروز ہوئی آزادی ہم پہ اس طرح سایہ فگن رہی کہ غریبی، ناداری، انارکی اور خانہ ویرانی مسلط ہوئی۔ یہ آزادی جب ہندوستان میں پہلے پہل نمودار ہوئی تو لاکھوں انسان جیسے تیل کی کڑاہی میں تل دِے گئے۔ یہ آزادی مغرب پر بارانِ رحمت بکھیر دیتی ہے اور ہمارے مقدر میں صرف بادل کی گھن گرج بجلی کی کڑک ہے بارش نہیں۔ جو چیزیں ہم غلاموں اور محکوموں کو ظالم حکام خریدنے پر مجبور کرتے تھے، وہی اب بازاروں میں ملمع کر کے دستیاب ہیں۔

ان اشعار سے ایک دردمند انسان اور شاعر کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ سارے برصغیر میں انسانی خون کی ہولی کھیلی گئی، جس کے نتیجہ میں مہتا تما گاندھی کو صرف کشمیر میں روشنی کی کرن دکھائی دی۔ لیکن یہاں پر بھی

آزادی کی مرغی کے سونے کے انڈے معدودے چند لوگوں کے حصے میں آئے اور وہی اس کی برکتوں سے فیض یاب ہوتے رہے۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحرانی اور تاریخ کے عبوری ادوار میں شعروادب دامن بچا کر سماجی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ یہ ضروری نہیں کہ قلمکار اپنا قلم چھوڑ کر تلوار ہاتھ میں لے، بلکہ وہ اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لا کر سماجی اور سیاسی زندگی پر دیرپا اثرات چھوڑ سکتا ہے، جو باتیں لوگ نہیں کہہ سکے وہ مہجور نے بلا خوف وتردد کہہ کر اپنا تاریخی فریضہ انجام دیا۔ مہجور ''آزادی'' نظم میں آگے چل کر لکھتا ہے، کہ یہ آزادی عام لوگوں پر کوئی پربت ٹوٹ پڑا جب کہ کچھ معدوُدے چند لوگوں کیلئے پھول کی دو پتیوں جیسی ہلکی ہے۔ آزادی خلوت گزیں ہے، آزادی موٹروں میں دوڑ رہی ہے، آزادی عام لوگوں کی خاطر خوف ودہشت کا ایک پیکر ہے۔

لُکن پیٹھ گئے یہ آزاۤدی سبٹھاہ گوٚب ہارِ پر بتھ زن
چھےٚ کینٛژون خوش نصیبن پوشہِ تُلی زِ ےڈلیہ آزاۤدی
لُکن ماتم گرن اندر بہتھ مہراز ہی حائم
ہموٗ رٛٹموٗ چھےٚ پانس ستی خلوتھ شاہِہ آزاۤدی
گمتی دم پھٹی چھِ ساری بے قراٗری چھکھ دِلن اندر
دپن ونہِ ہو پتُن احوال اَسہِ مالایہِ آزاۤدی

عوام دم بخود ہو کر مضطر ومضطرب ہیں، لب کھولنے کیلئے لیکن اُنہیں اندیشہ ہے کہ آزادی اُنکی سرکوبی کرے گی۔

ایسی ہی ایک اور نظم ''لالولالو ہاگلِ لالو حالِ دِل کرو اظہار'' ہے جسمیں مہجور نے گل لالہ مخاطب ہو کر جملہ سماجی اور سیاسی عدم مساوات اور عدم انصاف

کوطشت از بام کیا ہے۔ عبوری دور میں بے اعتدالیاں ضرور واقع ہوتی ہیں، جس کے باوجود ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزادی نے ہم کو بہت کچھ دیا ہے اگرچہ بہت کچھ حاصل کرنا اب بھی باقی ہے۔

یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ سیاسی نظمیں اکثر ہنگامی ہوا کرتی ہیں، ہم مہجور کی ایسی بلند آہنگ شاعری کی تاریخی، ثقافتی اور لسانی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتے۔ دل کی یہ صدا بند دھڑکنیں آج بھی ہمیں شعلہ نوائی کیلئے اُکسا کر ہم نوائی پر مجبور کرتی ہیں۔ یہ بلند آہنگ نغمے ہمارے خون کو رگوں میں شعلہ زن رکھیں گے۔

کشمیری ہمیشہ سیاسی بالا دستی اور ظلم و جبر کے خلاف سینہ سپر رہے ہیں۔ وہ محمود غزنوی تھا یا اکبر اعظم ہم نے ہر وقت اپنے قومی وقار کو مقدم سمجھ کر جان کی بازی لگادی ہے۔ ہمیں اپنے اسلاف سے یہی ورثہ ملا ہے جسکی حفاظت کرنا آج بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری اُس وقت تھا جب ہم پر مسلط ہونے کی کوششیں ہوئیں۔ مہجور ہماری ماضی کی شجاعت و ذکاوت کی روایت کی یادیں تازہ کرتا ہے، کہ ارے اور بہادر دوڑ، آگے دوڑ رُکنے کا نام نہ لے، اپنی بہادری وشجاعت کا لوہا منوا، دشت و جبل تیری راہ میں حائل ہونگے، شیر کی طرح ایک ہی جست میں اُنہیں پائمال کردے پائمال کردے۔

جو رُکیں تو کوہِ گراں ہیں ہم
جو چلیں تو سیل رواں ہیں ہم

(فیض احمد فیض)

☆

# اقبال اور کشمیری شاعری

ایک عہد ساز اور نادر روزگار شخصیت نہ صرف اپنے دور کی بلکہ تغیر پذیر زمانے اور مسلسل بدلتی زندگی کی دیو پیکر علامت ہوتی ہے۔ جب ہم کسی ایسی شخصیت کی بات کرتے ہیں تو ہم اعلیٰ انسانی قدروں، زندہ و پائندہ روایات، حیات آفرین وضو، فشاں عقائد و اساطیر کے پرنور و پر اسرار چہرے سے نقاب سرکتے ہیں۔ یہی حالت اس وقت مجھ پر طاری ہوتی ہے جب میں کشمیری شاعری کے حوالہ سے علامہ اقبال جیسی ہمہ جہت شخصیت کی دلاویز و دلربا معجزۂ فن سے مترنم و مملو شاعری کی بات چھیڑتا ہوں۔ خواجہ غلام السیدین اسی امر کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں "جس طرح طلوع آفتاب کا جمال اور غروب آفتاب کا جلال، چاند کی روپہلی روشنی اور کہکشاں کا حُسن، بہتے پانی کا ترانہ اور سر بفلک پہاڑوں کی عظمت ہر انسان کی دولت ہے جو اُن سے لطف اندوز ہوسکتا ہے اُسی طرح گوئٹے اور شیکسپئر، کالیداس اور حافظ، ٹیگور اور اقبال، سقراط اور افلاطون اُن سب کی ملکیت ہیں جن کے دل کے تار اُن کی حکمت یا شاعری کے زیر و بم کے ساتھ لرزش کرتے ہیں۔ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں[1]۔" یہ موقعہ نہیں کہ میں اُن ضیا بار و نور افشاں صداؤں کے بے نام

[1] شیرازہ اردو۔ اقبال نمبر۔ جلد۔ ۱۶ شمارہ۔ ۳۔ ۶۔ مطبوعہ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی ص۔ ۹

جھتوں کی نشاندہی کروں۔ جن کی صدائے بازگشت کلام اقبالؒ میں کہیں پوشیدہ اور کہیں برملا سنائی دیتی ہے اور جہاں نظریاتی اساس کے باوجود اُن کے بے مثل، چابکدست جمال آفرین اردو شاعری کی تخلیقیت کی توسیع کی صورت جلوہ فگن ہے ہر صوت و آہنگ میں آدمیت اور عظمتِ آدم رقصاں ہے۔ وہ اسرار خودی کی تمہید میں اس چابکدست کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ ''شاعر فردا'' ہیں گو کہ اُن کا جنم حال کی طوفان پرور کوکھ میں ہوا ہے۔

نغمہ از زخمہ بے پروا ستم — من نوائے شاعر فردا ستم
عصر من دانندۂ اسرار نیست — یوسفِ من بہر ایں بازار نیست
نا اُمید ستم زیارانِ قدیم — طورِ من سوزد کہ می آید کلیم
نغمۂ من از جہانِ دیگر است — ایں جرس را کاروانِ دیگر است
نالہ را اندازِ نو ایجاد کُن — بزم را از ہائے وہو آباد کُن

اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ۔

غواص محبت کا اللہ نگہبان ہو — ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے یکتائی
ہے گرمئی آدم سے ہنگامۂ عالم گرم — سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

یہ شعر و ادب میں سماجی افادیت کا خلاقانہ اعلان ہے جو علامہ اقبالؒ نے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے سے بہت پہلے کیا تھا۔ یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ وہ ذہن رسا کے مالک تھے اور اُن پر آنے والے کل کے کوائف و حالات منکشف ہو چکے تھے۔ اُن کے نزدیک شعر و ادب کا بنیادی مقصد وسیع تر معانی میں انسانی محبت کی تبلیغ و ترویج ہے، جو انہوں نے بہر نوع انجام دی۔ علامہ اقبالؔ ہند کی ملک گیر تحریک حریت کے نقیب اور ترجمان کی حیثیت سے کلیدی منصب رکھتے ہیں اور یہ کہ انہیں حریت کشمیر سے بھی گہری

دلچسپی تھی جو فطری بھی تھی کیونکہ وہ کشمیری نژاد تھے جسکا ذکر انہوں نے بار بار کیا ہے اور فخر سے کیا ہے۔

موتی عدن سے لعل یمن سے ہوا ہے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستان آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور
کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے
اس باغِ جانفزا کا یہ بُلبُل اسیر ہے
ورثے میں ہم کو آئی ہے ارم کی جائداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے
تنم گلے زِ خیابانِ جنت کشمیر
دِل از حریم حجاز نوازِ شیراز ست

یہی وہ حب الوطنی کا فطری جذبہ ہے جو علامہ اقبال کو بے چین رکھتا تھا جس کا اظہار انہوں نے کشمیر کے دانشوروں اور شاعروں سے ذاتی ملاقاتوں اور مراسلت میں بے باکانہ انداز میں کیا ہے۔ ایسی شخصیات میں محمد دین فوقؔ، غلام احمد مہجورؔ اور عبدالستار رنجور کشمیری شامل ہیں۔ یہاں کی سیاسی فضا میں "اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" بول والی نظم کو نغمہ حریت کی حیثیت حاصل تھی۔

یہی وہ جذباتی، ذہنی اور تاریخی پس منظر ہے جسکے پیش نظر اقبال کی شاعری کے اثرات کشمیری شاعری پر، جس سے موضوع کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ تحریک آزادی ہند ۱۹۳۸ء میں اقبال کی وفات کے وقت ہی نازک مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی۔ جنگِ عظیم دوم جسکا آغاز ۱۹۳۹ء میں ہوا کے گھنے بادل

بھی دنیا کی فضاؤں پر منڈلا رہے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں زارِ روس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ انقلاب روس کی صدائے بازگشت علامہ اقبال کے کلام میں صاف سنائی دیتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ساری دنیا میں محکوم و مظلوم قوموں میں غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کے جذبہ نے ہمہ گیر شدت اختیار کی اور اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ادب برائے زندگی جیسے مثبت رجحان نے زور پکڑا۔ حُسن یا تخلیق ادب کا معیار بدلنا شروع ہوا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ سیاسی اُتھل پُتھل میں ادباء اور شعراء بھی بڑھ چڑھ کے حصہ لینے لگے۔ انہوں نے سیاسی غلامی، سماجی نابرابری، مالی بدحالی اور سامراجی جبر واستبداد کے خلاف زوردار آواز اُٹھائی۔ تاریخ کے اس اہم موڑ پر اردو ادب نے اپنا اہم تاریخی رول خوش اسلوبی سے نبھایا۔ دیکھا جائے تو اسبات کا ثبوت مِل جاتا ہے کہ شعر و ادب ہر دور میں زمانے کے تقاضوں کو اپنے دامن میں سمیٹتا آیا ہے۔ البتہ شدت کبھی کم تھی اور کبھی زیادہ۔ کشمیر میں بھی ڈوگرہ جاگیرشاہی کے خلاف تحریک عوام میں مقبول ہوتی جارہی تھی، جسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیری شعراء بھی نئے بدلتے زمانے کے اشاروں کو بھانپ گئے۔ اور وہ بھی ہمہ گیر آزادی کے نغمہ خوانوں میں شامل ہوئے۔ غلام احمد مہجورؔ بھی عوام کے اس اُمڈتے طوفان سے نہ بچ سکا "پیام مہجور" جو ۱۹۳۹ء تا ۱۹۵۱ء مرحلہ وار کتابچوں کی صورت میں شایع ہوا اور اب ۱۹۸۳ء میں مطبوعہ کلیات مہجور، جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کا حصہ ہے میں جابجا علامہ اقبال کے کلام کے اثرات نمایاں ہیں۔ جو بجا طور پر ملک گیر سطح کیا بلکہ عالم گیر سطح پر ہو رہی تبدیلیوں کا خوش آیندہ ثمرہ ہو سکتے ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ادباء اور شعراء نے ظلم و جبر کے خلاف ہر دور میں کہیں برملا احتجاج کر کے اپنا تاریخی رول ادا کیا ہے جس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کوئی نہ

کوئی سیاسی تحریک اُن کی پشت پناہی کرے، کیونکہ انسانی اخوت محبت کا آفاقی تصور ہی اقلیم سخن کا فرنروا ہے۔ مہجورؔ نے سیاسی اور سماجی تہذیبی افق پر ہو رہی عالمی تبدیلیوں کو اردو شاعری بالخصوص علامہ اقبال کی وساطت سے اپنی کشمیری شاعری میں جگہ دیکر ایک عہد ساز رول ادا کیا، کیونکہ یہی تخلیقی کوششیں بعد میں کشمیری شاعری کی توسیع کا نقطہ آغاز بنیں۔

| | |
|---|---|
| اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو | فاقہٕ پھرِ شوٚنگمتہِ مزٕدورو ترٲو غفلتھ گوٚھ ہُشیار |
| کاخِ اُمرا کے درد دیوار ہلا دو | ووتھ سپن اِستادِ ظُلمن چھکھ ژٕ کوٚر رُمت نابکار |
| سلطانیٔ جمہور کا آنا ہے زمانہ | ووٚنی چھُ انصافُک تہٕ پزرُک زور ظُلمُک دور گو |
| جو نقشِ کُہن تم کو نظر آئے مٹا دو | پرٛون دُنیا گو فناہ ووٚنی کر ژٕ نوو دُنیا تیار |
| آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی میں ہوا | ووتھ نظر کر گاش آو کھوٚت انقلابُک آفتاب |
| آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تک | چوٚن دۄ دُمت باغ پھولہِ پیغام ہیتھ آو نو بہار |
| سرمایہ دار خوف سے لرزاں ہیں کیوں نہ ہوں | ہا مزٕدورو گریستیو اتھو اس تھاوِو تھوٚد ؤتھِو |
| معلوم سب کو قوتِ مزدور ہو چکی | حق پنُن حاصل کُرو ترٲوو کرُن ووٚنی زارٕ پار |
| نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر | نظر شہبازٕ سنٛز چھنہٕ بستین پٹھ چھس تھز روارا |
| تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کے چٹانوں میں | پنُن رۄزی چھُ ژھاران پلنہٕ بالن سنگرن اندر |
| ودائعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گُل | گُل ہردِ ہراں سونتہٕ بیہ دُبارٕ کراں دور |
| عدم عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے | مُری مُری چھ پھیراں زندگی وسواسٕ مرنُک ترٲو |
| گُزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں | پابند چمن گُل چھِ تو ے گُنڈی چھِ تمس لٲری |
| کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی | آزاد بُلبُل باشہِ کران پوشہِ ڈلن منٛز |
| اُڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے | دۄپ قمری کس بوزِ ووٚنی میون بول بوش |
| چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری | پینٛژٕ کانٛہو ژُورِ نیو گفتار میون |

گیے دِن کہ تنہا تھا میں انجمن میں — چھکھ نہ ژے باغس اندر تنہا کلین کھسی کروان
یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں — ہتی چھے مہجور نالاں تس تہِ سے آزاد چھے
پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر — اکھ دِل ہشارا جاہلن منز روزِ کتھہِ پاٹھی خوش
مردِ ناداں پر کلام نرم ونازک بے اثر — کیا شیشہِ اُدِیل وارِ روزیا آرِ پلن منز

اور یہ شعر کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے۔

چھےٚ ہستی پوشہِ وِنی مستی، خرابی بے خودی پستی
خودی ہنز تو پھ لابِتھ بے خودی ہُند قلہِ پاوُن چھم

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں — تیلہِ لبکھ نزدیک پوشن جاے گلزارس اندر
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کرلے — یہہِ گیے ییلہِ پوشہِ تھرتل روٗٹ کنڈو دامانہ چون

اسکے علاوہ نظمیں جنکا آہنگ خطیبانہ ہے اور جن میں مہجور نے انسانی، اخوت رواداری، آزادی، سماجی نابرابری جیسے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے بھی اسی ملک گیر حاوی رجحان کا پتہ دیتی ہیں جنکی نمایندہ آواز علامہ اقبال کی تھی۔

مہجور کا جواں سال ہم عصر عبدالاحد آزاد (وفات ۱۹۴۸ء) وہ پہلا کشمیری شاعر ہے جسکی شاعری میں باضابطہ طور طبقاتی شعور وکشمکش کی ترجمانی ہوتی ہے۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود آزاد نے علامہ اقبالؒ کے شعری تجربوں اور آہنگوں سے استفادہ کیا ہے۔ وہ اس لئے کہ علامہ اقبال عظمت آدم کا نغمہ خواں بھی ہے اور پیہم بدلتی زندگی کا ترجمان بھی۔ آزاد کی بے چین روح کو اقبال کے یہاں سکوں ملتا ہے اور وہ اُس کے سحر انگیز پیغام حیات کو اپنا راہنما بنالیتا ہے تا حد نظر آزاد کے سامنے علامہ اقبالؒ کے بغیر اور کوئی بلند قامت شخصیت نہیں تھی، جو اُسکی متلاشی نظروں کا مرکز بن سکتی تھی کیونکہ اُس دور کے رائج نظریات کے مطابق اشتراکیت تن کا سامان مہیا کرنے کا دعویٰ تو کرتی تھی

لیکن من کی دولت سے اُسکا دامن خالی تھا۔ آزاد بہ ظاہر مذہب سے منکر تھا لیکن دل ہی دل میں ایسے ہمہ گیر عقیدہ کی تلاش میں تھا جو انسان کے سبھی دُکھوں کا مداوا بھی ہو اور روحانی مسرتوں کا پاسبان بھی۔ اقبال کا فلسفہ خودی اور عرفان ذاتِ کا قابل عمل نظریہ اُس کے مجروح و مضطراب انا کی تشفی کرتا ہے جس کے پیش نظر وہ اُس کے انقلابی اور حیات آفرین خیالات کو کشمیری جامہ پہنانے کی شعوری کوشش کرتا ہے تاکہ اُسکے جذبہ حُریت وحمیت کو تقویت حاصل ہو۔ آزاد کی ایسی کاوشیں بسا اوقات محض تقلیدی اور کہیں کہیں کامیاب تخلیقی تقلید کی حدوں کو ضرور چھو لیتی ہیں۔ ایسا ہونا فطری بھی تھا۔ کیونکہ زمانہ ہی تلخ نوائی کا تھا جب توازن و تناسب کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔

اقبال نے کہا۔

ہند کے شاعر وصورت گروافسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

آزاد نے یہی خیال یوں ادا کیا۔

صد حیف ہزار افسوس تس دردِ غزل خوانس
یس خام خیالن پتھ آرام پُٹن راوے
تمہِ لولہِ کھوتہِ بہتر زولانہِ غلامی ہُنْد
استادِ جواں مردس یُس لول پتھر تژ اوے!

علامہ اقبالؔ کا مردِ مومن پکار اُٹھتا ہے۔

در دشت جنون من جبریل زبوں صدے
یزداں بہ کمند آورائے ہمت مردانہ

آزاد یہی خیال اس انداز میں پیش کرتا ہے۔

برونٹھ پکٕن زندگی پردٕ ژٕٹھ دمبدم — شانِ خدائی تہٕ یوٚد برونٹھ یی برمہٕ غم
پھیرمہٕ پوٚت تٕل قدم نیرژٕٹھ یم حجاب — یی چھُ ونان انقلاب اُتھی چھِ ونان انقلاب

علامہ کشمیر کے محنت کشوں کی حالت زار کی اس دلنشیں انداز سے تصویر کھینچتے ہیں۔

بریشم قبا خواجہ از محنت او — نصیب تنش جامۂ تار تارے

آزادؔ یہی خیال اس غیر فنکارانہ انداز بیا نکے سہارے ظاہر کرتے ہیں۔

اُسی چھو کھلد جگر ہتھ ؤدی ؤدی چھِ خوٗن ہاران
تمہِ خونہٕ سون قاُتل رٕنگی رٕنگی دُشال آسیا

آزادؔ کا یہی شعر اقبال کے اسی قبیل کے ایک اور شعر کی بازگشت بھی ہے۔

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اُسکا
دیتا ہے ہُنر جسکا امیروں کو دوشالہ!

پاں ژادر (آبشار) وبتھ (وتستا) بہار، آدم گری، عقل و عشق، سرمایہ داری، خودی و بے خودی، دریا، شکوہ ابلیس اور اسی قبیل کی دوسری نظموں کے مطالعہ سے اس امر کی اور بھی تصدیق ہو جاتی ہے کہ آزاد نے علامہ اقبالؒ کا کثرت وشدت سے اثر قبول کیا ہے۔ اور اُس کے تتبع میں کہیں کامیاب اور کہیں ناکام انداز سے قلم اُٹھایا ہے جیسا کہ ذیل میں دیگئی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہاں تو اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ایسا کرتے وقت اکثر اوقات آزاد بُت گر سے زیادہ بُت شکن ہی ہیں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — گُنے پرواز طوطس بُلبلس کاوس تہٕ شہپازس
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور — وُلیکن وُچھ تفاوتھ ہٕ کوٚ پروازس تہٕ پروازس
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر — گُلن منز چھکھ ترأوتھ بچھاُوتھ تھ مخملُک بستر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں — گُلن تے گلشن اندر گوٗھان چھا شیرِ نرپیدا
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ ومردہ ذوق — مندرن خانقاہن ژلہٕ ہالن ہندی عالم

خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو | ڈولہٕ ٹے گرزتہٕ صدالولہٕ نش دِل خا لی
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی | کار کرتوت پٔنن چھے یہ جہنم جنت
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے | پانہٕ چھکھ نار تہٕ گلزار جناب عالی

پتا مبر ناتھ دھر فانیؔ ...... جو عبدالاحد آزاد کے ہم عصر اور دوست رہ چکے ہیں بھی علامہ اقبالؒ کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ وہ کشمیری زبان کے کہنہ مشق شاعر ہیں اور شعر و ادب کو اعلیٰ سماجی مقاصد حاصل کرنے کیلئے نہایت ہی اہم ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ بھی عبدالاحد آزاد کی طرح نظریاتی اختلاف کے باوجود بڑی فراخدلی سے اقبالؒ کے تصورات و خیالات اور شعری آہنگ کا استفادہ کرتے ہیں۔ فانیؔ کے کلام مطالعہ کے پیش نظر بلا خوف تردید کیا جاسکتا ہے کہ فن عروض پر انکی گرفت مضبوط ہے روانی، موسیقیت اور سادگی اُن کے کلام کا خاصہ ہے انسانی اخوت، رواداری اور محبت کا آفاقی تصور ہی اُسے اقبال سے اثر لینے کی ترغیب دیتا ہے۔ چند ایک اشعار دلچسپی کا باعث ہونگیں۔

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم | جہانکی دأدی لیس بیمار تھاوان
منزل صعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم | اُچھو کنی خٔون جگرُک ہارٕ ناوان
محفلِ نظم حکومت چہرہ زیبائے قوم | گُلنٕ ہندی کنڈی ییمس آرام نِیاوان
شاعر رنگین نوا ہے دیدۂ بینائے قوم | چھُ تمی سے مہربانس ناو شاعر
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

غلام رسول نازکی کشمیری زبان کے صف اول کے رباعی گو شعرا میں سے ہیں۔ انکی رباعیات و قطعات کے دو مجموعے ''نمرود نامہ'' اور ''آواز دوست'' شایع ہو چکے ہیں۔ آخر الذکر مجموعہ پر انکو ساہتیہ اکادمی اوارڈ سے نوازا گیا۔ ''نمرود نامہ'' کے

دیباچہ میں وہ خود ہی لکھتے ہیں کہ ''اس بات کا یہاں اعادہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اکثر خیالات علامہ اقبال کے ہیں میں نے خود تو ترجمہ کیا ہے یا استفادہ۔ اس لئے یہاں شک کی گنجائش ہی رہتی کہ غلام رسول نازکی، کی رباعیات علامہ اقبال کی تخلیقی کاوشوں کا کشمیری روپ ہیں۔ غلام رسول نازکی کا تصرف و تتبع تخلیقی ہے جس پہ اصل کا گمان گزرتا ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ میں اپنا نقطہ نظر چند مثالوں کے ذریعہ واضح کروں تا کہ محترم سخن فہم حضرات خود بھی اسبات کا اندازہ کرسکیں۔

| | |
|---|---|
| تیری دنیا جہانِ مرغ وماہی | بہٕ چھس زاناں ژٕ چھکھ مشتاق میونے |
| میری دنیا فغان صبحگاہی | نہٕ چھے ہندر نہٕ چھے یہہٕ میانہٕ دادے |
| تری دنیا میں ہیں محکوم ومجبور | بوزن ونہٕ ہاژے گوٚے ہمراز شیطان |
| مری دنیا میں تیری پادشاہی | مےٚ کیا کوٚرمے، مےٚ کتھ کوٚرتھن اگادے |

| | |
|---|---|
| خدائی اہتمام خشک وتر ہے | یہتھ اوسس بہٕ چاٗنس لامکانس |
| خدا وندا خدائی دردِ سر ہے | رٕٹنیٚ اٗسہم نہٕ کھورٕ ٔسلس تہٕ چھانس |
| ولیکن بندگی استغفراللہ | بلاے آیم پھوٚرس پانس توٚرس یور |
| یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے | پیوٚ وم دانس لوٚگس روٚ ہنس تہٕ پرانس |

| | |
|---|---|
| دِلے در سینہ دارم بے سرؤدے | نہٕ چھم سوزاہ نہٕ چھم داغاہ جبینس |
| نہ سوزے در کفِ خاکم نہ نوٗرے | خلوٗ صایٗس مےٚ کرہے صاف سینس |
| بگیر از من کہ برمن باردوش است | دِلس منٛز چھم بٔستھ معبوٗد ساساہ |
| ثواب ایں نمازِ بے حضورے | دیٚتُم سجداہ تھولاہ لاٗیم زمینس |

دگر گوں کشورِ ہندوستان است　　مےٚ وۄن نو کتاہ حکیمن نۍ نوازن
دگر گوں آں زمین و آسمان است　　طبیبن مُر شدن داناے رازن
مجواز من نمازِ پنجگانہ　　دِلس چھُم قبلہٕ ساساہ کعبہ ساساہ
غلاماں را صف آرائی گراں است　　مےٚ وتھ کیا کرکھ پانٛژن نمازن

جہان تست درد ست خسے چند　　ژٕھم پٕچ تھوٕ مُت وانس ہٕبر چھان
کسانِ او بہ بندِ نا کسے چند　　کُرِم ناٗوِد چھُ ژٕھ سٕنز تۄر وایان
ہُنر در میان کار گاہاں　　زمانے گوٚو پھرتھ سورے پھرتھ گو
کشد خود را بہ عیش کرگسے چند　　دیان گاٹلی ہلبن بانن وٕکری ٹھان

ظاہر ہے کہ میر غلام رسول نازکی رباعی کی فنی لوازمات برقرار رکھتے ہوئے اپنی رباعیات میں کشمیری روزمرہ اور محاورہ کا بھرپور و برمحل استعمال کرکے اپنی منفرد تخلیقی صلاحیتوں کا کامیاب مظاہرہ کرتے ہیں۔

امین کامل کشمیری زبان کے صاحب طرز غزل گو ہیں جو اپنی اردو شاعری میں علامہ اقبالؔ اور جوش ملیح آبادی کے نہ صرف مداح بلکہ مقلد بھی ہیں۔ ....اپنی مادری زبان کشمیری میں تخلیقی سفر شروع کرنے کے بعد انکا جو پہلا شعری مجموعہ ''مس ملر'' کے نام سے شایع ہوا وہ آغاز سے انجام تک علامہ اقبال کے تتبع اور تقلید کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔ خود امین کامل کے جائزہ کے مطابق کونسی شعری تخلیق مثال کے طور پر پیش کی جائے اور کونسی چھوڑ دی جائے[1]۔ اتنا تو ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہاں بھی کاملؔ کی تردستی اور تخلیق شعر پر اُسکی استادانہ و ماہرانہ گرفت

[1] شیرازہ۔ کشمیری: اقبال نامہ جلد ۱۳۔ شمارہ ۴ مطبوعہ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی ۱۹۷۷ء ۳۱۲۔۱۔۳

بصراحت محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہاں پر میں دو ایک مثالوں پر ہی اکتفا کرونگا۔

گیا دورِ سرمایہ داری گیا    صدا یہ لوے زمانن سکندری موکلیۆ
تماشا دکھا کر مداری گیا    چھِ آغہِ ترٛیشہِ پیمتی بند پروری موکلیۆ

پایکش در سینہ من آرزوئے انقلاب    ہُمہِ طرفہ چھے موتس نُمن سودادِلس پننس کرُن
یادگرگوں کن نہادے ایں زمین و آسمان    یٚمہِ طرفہ چھے ناراژھٹن ہستی سرٕنی لولاہ برُن
یا چناں کن یا چنیں    یا ہورکن یا یورکن

در پیرہن شاہد گل سوزن خاراست    گٔے بأے تہٕ بند چاٗنی ہتھ کرتام پلنی ساز
خاراست ولیکن زندیمانِ نگاراست    انجام تہند؟ پوشہِ چمن، لولہٕ ہٕنٛز آواز

یُس شولہٕ ناوِ عشقس یُس سورمہٕ لاگہِ حُسنس
تیُتھ لولہٕ اضطرابا تیُتھ مارٕ موٗت اَمار!
یُس لالہِ ہُند پے باوِنہٕ پرٕ بزلاوِ دِلک ژوٗنگ
تتھ لولہٕ جنونس چھُ شرف کیا تہٕ حصر کیا؟

مرزا غلام حسن بیگ عارف، رحمن راہی، غلام نبی ناظر، عبدالخالق ٹاک زینہ گیری (وفات ۔ ۱۹۸۹ء)
عبدالستار رنجور (وفات ۱۹۶۰ء)، سید رسول پونپر۔ غلام نبی تبسل۔
سلطان الحق شہیدی، ڈاکٹر مشعل سلطان پوری، نشاط انصاری، ڈاکٹر مرغوب بانہالی، غلام رسول مشتاق، غلام محمد مشتاق، عبدالغفار مجبور و دیگر شعراء نے کسی نہ کسی رنگ میں بلواسطہ یا بلاواسطہ نہ صرف اقبال کا اثر قبول کیا ہے بلکہ تصرف و استفادہ بھی۔ کیونکہ اقبال ایک انقلاب آفرین عہد کے صاحب نظر، صاحب طرز اور معتبر نمائندہ ہی نہ تھے بلکہ بذات خود ایک عہد بھی تھے، تہذیب بھی اور ہمہ جہت انجمن بھی۔

☆

# شوریدہ کشمیری

## ایک صاحب فکر شاعر

بٹ گیا اشعار میں شوریدہ غم
شاعری غمخوار ہو کر رہ گئی

اصلی نام غلام محمد ملک، تخلص شوریدہ، والد کا نام محمد عبداللہ ملک، ابن سلام ملک ابن محمد ملک، میٹرک کی سند کے مطابق ۱۸ مارچ ۱۹۲۴ء کو شوپیاں کے قریب ایک مشہور گاؤں پنجورہ میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں ایک مقامی مکتب میں داخلہ لیا۔ چھ مہینے میں قرآن مجید ناظرہ پڑھا۔ پھر گلستان سعدیؒ کے چند اوراق پڑھ کر گورنمنٹ پرائمری سکول پنجورہ میں درج ہوئے۔ پانچویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ اے۔ وی۔ مڈل سکول شوپیان میں داخل ہوئے۔ یہاں اردو کے علاوہ عربی، انگریزی اور ریاضی میں بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسلامیہ ہائی سکول سرینگر میں داخلہ لیا۔ جو اُن دنوں بڑی بات تھی۔ اپنے پسندیدہ مضامین میں دلچسپی لینے کے علاوہ اردو شعر و ادب کے مذاق سے بھی بہرہ ور ہوئے۔ اُس زمانے میں یہاں پنجاب اور کشمیر کے بہترین اساتذہ موجود تھے، ۱۹۴۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اپنا تعلیمی سفر جاری رکھنے کیلئے سری پرتاپ کالج سرینگر میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۳ء ایف۔ اے۔ پاس کر کے امر سنگھ کالج سرینگر میں داخل ہوئے۔ کیونکہ اُن دنوں بی۔ اے۔ کی کلاسیں یہیں منتقل

ہوئی تھیں ۔اب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کالج کے پرنسپل تھے۔شورید ہ پہلے ''فلاح'' تخلص کرتے تھے۔سری پرتاپ کالج میں ۱۹۴۱ء داخلہ لینے کے ساتھ ہی شوریدہ کی شعر گوئی کا آغاز ہوتا ہے۔ جہاں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اُن کے اچھے مستقبل کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر عبدالحکیم کی صدارت میں بمقام نمایش گاہ ایک مشاعرہ میں پڑھی دوغزلیں جناب عبدالسمیع پال اثر صہبائی کی نظر سے گزری تھیں اور انہیں بہت سراہا تھا۔دونوں بزرگوں کی مشفقانہ حوصلہ افزائی سے شوریدہ صاحب میں اعتماد پیدا ہوا بلکہ اولا الذکر نے طلباء کے ایک ادبی مناظرے کے اختتام پر، جس میں وہ بھی (شوریدہ) شریک تھے، انہیں ......شوریدہ کے بدلے ''انسان'' تخلص کرنے کا مشورہ دیا جو وہ بوجہ خاص اختیار نہ کرسکے۔ جہاں لفظ ''شوریدہ'' نہیں سما سکتا۔ وہاں مقطع میں اپنی کنیت ''ملک'' سے کام لیتے ہیں۔کبھی کبھی بے تخلص ہی کلام چھوڑ گئے ہیں۔

دسمبر ۱۹۴۴ء میں کالج سے فارغ ہوئے ۔ بی ۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ بیکار ہی رہنا پڑا۔دو ایک چھوٹی ملازمتوں کو ذریعہ روزگار بنانے کے ساتھ ہی بی ٹی کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ ہائی سکول شوپیان میں مدرس ہوگئے ۔ یہاں پانچ سال کام کرنے کے دوران ۵۶-۱۹۵۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ایم ۔اے ۔اردو کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج اننت ناگ ( کھنہ بل ) میں اُردو کے لکچر رہوئے۔منشی فاضل کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم ۔اے کی ڈگری بھی لی ۔ ۲۱ر مارچ ۱۹۷۹ء کو پچپن برس کی عمر میں بحیثیت پروفیسر اُردو ریٹائر ہوئے[1]۔ اُنکے نوزائیدہ بچے اور

دیباچہ: جوش جنون: (۱۹۸۰ء): شوریدہ کشمیری: ص ۶: ۱۱-۱۷۔شوریدہ صاحب زیارت حرفین شریفین سے ۱۹۸۲ میں فیضیاب ہوئے

رفیقہ حیات اول کا انتقال فروری ۱۹۶۰ء میں ہوا۔

شوریدہ مرحوم نے اپنی سیمابی زندگی کے بارے میں مربوط طریقہ سے کچھ نہیں لکھا ہے۔ خودنوشت سوانح ترتیب دینے کا ارادہ تھا لیکن وہ یہ کام انجام دینے سے پہلے ہی ۱۹۹۱ء کو واصل بحق ہوئے انا للہ و انا الیہ راجعون وہ خود ہی کیا خوب فرما گئے ہیں۔

ریاضی ، شاعری پھر عشق توبہ
مجھے شوریدہ ان تینوں نے مارا

جبکہ غالب کو صرف عشق نے لے ڈوبا تھا۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

شوریدہ کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی بیوی جو ایک سیدھی ساری عام دیہاتی متوسط گھرانے کی بیٹی تھی، کا انتقال ۱۰ر فروری ۱۹۶۰ء کو ہوا۔ اس صدمہ جانکاہ کے بارے میں وہ اپنے خطوط میں یوں اظہارِ غم کرتے ہیں۔

جناب ایک مدت کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ ہائے کیا عرض کروں۔ سال رواں میرے لئے مصائب کا ہجوم لے کر آیا۔ ایک طرف گھر میں بیماری اور تیمارداری۔ دوسری طرف تنہائی اور بے کسی۔ پھر کڑا کے کا جاڑا اور بے سروسامانی۔ آخر ۱۰ر فروری کو رفیقۂ حیات اور اُس کے نوزائید کو صیادِ اجل نے بے دردی سے چھین لیا۔ ایک نامعلوم غم کا پرتو دِل پر پہلے ہی پڑا تھا۔ کسی کام میں دلچسپی نہ رہی تھی۔ بس ایک بے کیفی تھی اور ایک جانکاہی۔ اب طبعیت کچھ کچھ سنبھل گئی

ہے لیکن زندگی میں ایک خلاء سا محسوس ہوتا ہے۔ مرحومہ کی نشانی دو بچے ہیں جنہیں دیکھ کر دل کو تسلی دیتا ہوں۔ اور شعر و نوا سے کسی قدر تسکین پاتا ہوں[1]۔

جناب میر غلام رسول نازکی کے نام اُن کی رفیقہ حیات کے ارتحال پر ایک خط میں اُنکے غم میں شریک ہوتے ہوئے اپنے زخموں کو بھی تازہ کرتے ہیں۔

''مجھے بھی اس صدمے سے گزرنا پڑا ہے۔ اُس وقت میرے شباب کے آخری ایام تھے۔ نو سال کی رفاقت کے بعد دو بچوں کو چھوڑ کر اہلیہ کا المناک طور پر انتقال ہو گیا۔ خُدا مغفرت کرے۔ مجھ پر کیا گزری بیان سے باہر ہے۔ دوسرے نکاح کا مطلق خیال نہ تھا۔ اعزہ و اقارب نے بچوں کو ماں کا بدل مہیا کرنے کے لئے مجھے اس پر آمادہ کیا۔ آخر معلوم ہوا کہ دنیا میں ماں کا بدل عنقا ہے اور آدمی کو آرام کے بجائے آلام نصیب ہوتے ہیں۔ رضائے مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ پھر بھی لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس مُسبب الاسباب نے پر اسرار طور پر اور ہی بندو بست کر رکھا تھا۔

کارساز ما بہ فکر کار ما

فکر مادر کارِ ما آزارِ ما[1]

دوسری بیوی سے بھی جن سے نکاح کے بعد وہ پنجورہ شوپیاں سے نئی بستی اسلام آباد (اننت ناگ) منتقل ہوئے، انکے دو بیٹے ہوئے ان کے علاوہ انکی بیوی

[1] خطاب خامہ: (ستمبر ۱۹۸۶ء) خط بنام پروفیسر آل احمد سرور: ۲۵ مئی ۱۹۶۰ء ص: ۸۱

[1] خطاب خامہ: (ستمبر ۱۹۸۶ء): خط بنام غلام رسول نازکی۔ ۵ نومبر ۱۹۸۰ء ص: ۱۴۸۔۱۴۹

بھی لواحقین میں شامل ہیں۔ اغلب ہے شوریدہ کی ان کے علاوہ بھی کوئی اولاد ہو، خدا اُن کو بھی فائز المرام کرے لیکن فیاض احمد اور سرمد عطا کی فکر اُن کو بجاطور پر یوں دامنگیر ہے۔

”آپ نے شروع میں فیاض احمد کے بارے میں پوچھا ہے۔ زبانی بھی استفسار کیا۔ میں نے حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ آپ کو اس کا اتنا خیال ہے؟ وہ اُس زمانے میں صرف تین سال کا بچہ تھا۔ تعجب ہے کہ آپ اُس کی توتلی زبان کا یہ فقرہ ...... ”چھِ کتہِ اوشکھ بہ اوشس چھِ چھاران۔ بہ ڈُلہ گیوس تہٕ میوس“ اب بھی دہرا سکتے ہیں۔ ماشاءاللہ آج وہ اکیس سال کا جوان ہے۔ لیکن اُس سے جو اُمیدیں وابستہ تھیں پوری نہ ہوئیں۔ ذکاوت و ذہانت کے باوجود وہ کوئی علمی کمال نہ کر سکا۔ اپنی بے چین طبعیت کی وجہ سے پی۔ یو۔ سی۔ پاس کر کے تعلیم چھوڑ دی۔ اور کسی قدر تجارت کی طرف متوجہ ہوا۔ خیر وہ ایک پر اُمنگ نوجوان ہے، کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے، خدا کرے کہ وہ زندگی میں فائز المرام ہو۔ آپ بھی دُعا کیجئے۔ اُسے آپ کے پاس مع اپنی کتاب جوشِ جنوں کے روانہ کروں گا۔ باقی بچوں کیلیئے بھی دعائے نیک کیجئے۔

سب سے چھوٹا بچہ سرمد عطا چھ سال کی عمر کا سال گذشتہ سے نئی بستی کے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتا ہے۔ وہ کسی قدر فیاض احمد سے ملتا جلتا ہے لیکن سب بچوں سے نرالا ہے۔ بڑا خوددار اور دلیر ہے۔ اُسکی صحیح اور بروقت تعلیم و تربیت کی مجھے بڑی فکر ہے۔ انشاءاللہ وہ کچھ کر کے دکھائیگا۔ کیا پتہ جب وہ کسی قابل ہوا میں ہونگا بھی کہ نہیں۔“

پاک وصاف ماحول اور اچھی صحبت جیسی چیزیں اب عنقا ہوگئی ہیں۔ اکثر بچے بُری صحبت اور ٹیلی ویژن کی بیہودگیوں سے تباہ ہو رہے ہیں۔ آئے

—

دن کے مشاہدات اس پر دال ہیں ۔ خدا خیر کرے [1]۔

ایک سادہ دل صوفی صافی لااُبال قسم کے انسان اور شاعر کو بھی بیس سال کی طویل مقدمہ بازی بادلِ ناخواستہ ایک فریق بننا پڑا۔ یہ شورید ہ کی سخت جانی ہی سمجھ لیجئے کہ مشق سخن بھی جاری رکھی ۔ وہ خود بھی اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

''اُدھر زندگی کا ایک بڑا سانحہ بلکہ حادثہ یہ بھی تھا کہ مجھے اپنے گاؤں (پنجورہ) میں اپنے ایک خرید ہ قطعۂ ارضی سے متعلق کئی مقدموں میں اُلجھایا گیا تھا۔ جو بیس برس جاری رہے ۔ مگر ع

رسیدہ بُود بلائے ولے بخیر گذشت

میرے خلاف مع عزیزاں ایک تازہ فوجداری مقدمہ ہنوز جاری ہے [2]۔

ان کے اپنے ایک الگ خط میں مقدمہ بازی سے فراغت کے مبہم اور واضح اشارات ملاحظہ ہوں۔

میں بھی موردِ مشکلات ہوں ۔ محتاج قاضی الحاجات ہوں ۔ آپ کو معلوم ہے کہ کوئی اولاد برسر روزگار نہیں ۔ مجھ ایسا کوئی وظیفہ خوار نہیں ۔ چھ سال سے بیروزگار ہوں ۔ بہر حال شکر گزار ہوں ۔ سال گذشتہ باغیچوں سے کچھ معتد بہ آمدن ہوئی جو اخراجات کے باعث گویا خشک پڑی زمین پر ہلکی سی

۱۔ خطاب خامہ: (ستمبر ۱۹۸۶ء) جناب غلام نبی گونی کے نام خط ۵۵ :۲۱ رفروری ۱۹۸۶ء: ص ۱۹۲۔

۲۔ جوش جنوں: (۱۹۸۰ء) دیباچہ از: شورید ہ کشمیری (نومبر ۱۹۷۹ء): ص ۱۳

پھوار تھی ۔ تاہم مجیب الدعوات سے برکت کا طلبگار ہوں
اور رحمت کا امیدوار“ ۔

اگست ۱۹۸۳ ء میں علی گڈھ یونیورسٹی کی جانب سے ”اردو“ صوفی شعراء تا ۱۸۵۷ء کا تنقیدی مطالعہ کے موضوع پر آپ کے حق میں پی ، ایچ ، ڈی ڈگری حاصل کرنے کے لئے تحقیقی مقالہ کی منظوری دی گئی ۔ تحقیقی کام کے لئے یونیورسٹی میں باضابطہ داخلہ لینا لازمی تھا ۔ سرما کی چھٹیوں میں کئی سال تک علیگڈھ جاتے رہے ۔ لیکن جس انہماک ایک سوئی اور فراغت کا تقاضا یہ کام کرتا تھا ، وہ نامساعد نجی و دیگر معاملات کیوجہ سے میسر نہیں ہوسکی ، جسکی وجہ سے یہ اعلیٰ مقصد والا معنی خیز تحقیقی مطالعہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا ۔

حرف دِل میں زباں پہ لا نہ سکا
کہ زباں چاک مہر قلم دیکھا !

یہ ہے ایک اجمالی خاکہ غلام محمد ملک شوریدہ کی نجی زندگی کا جسکی ذات سے میرا رشتہ قریبی نہ تھا ۔ لیکن خشخشی داڑھی والا پتلا لمبا سیاہی مائل گندمی چہرہ ہمہ وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر خیالات و تصورات کی دنیا میں مستغرق ، سیاہ گہری چمکتی متجّسس سوالی آنکھیں ، نیم ستواں ناک قراقلی ٹوپی زیب سر کئے ہوئے ، دراز قامت جھکاؤ دائیں جانب ، ہاتھ میں بھاری بھرکم بیگ لئے بیرونی رکھ رکھاؤ اور لازمی مردانہ بناؤ سے بے نیاز شاعر کی شخصیت آج بھی محبت و شفقت کے پیکر کی صورت میں میری نظروں کے سامنے کھڑی عنفوانِ شباب میں بھی کہہ رہی ہے ۔

ہے یہ شوریدہ غریبی کہ جنون
سر پہ سر پوش نہ پا میں پاپوش

شوریدہ کا شعور اس زمانے میں پروان چڑھا جب ملک میں ترقی پسند تحریک کا غلغلہ تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک ایک فیصلہ کن موڑ پر آ گئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے جو عالمگیر اثرات تھے اُن کی آنچ اس چمن زار میں محسوس ہونے لگی تھی۔ اُردو شاعری میں براہ راست اظہار، خطابت تلقین کی لے اتنی تیز تھی کہ کوئی اُسے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اقبالؒ کی پیمبرانہ آواز سبھی کو مسحور کر رہی تھی۔ شوریدہ کے اس مجموعہ (جوش جنوں) جس میں ۱۹۴۲ء تا ۱۹۶۰ء کا کلام ہے حسن وعشق کی لے کے ساتھ مناظر فطرت کی عکاسی بھی ہے، سماجی حقایق کی تصویر بھی۔ ایک سیاسی شعور بھی اور فطرت کی دلبری کے ساتھ اُسکی قاہری کا احساس بھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد برصغیر ہی میں نہیں کشمیر میں بھی بہت کچھ ہوا اور اُسکے نتیجے میں پرانے نظام کی جگہ ایک نئے نظام نے لے لی۔ عوام کی بہبود کی۔ مگر اُس کے نام پر کچھ زیادتیاں بھی ہوئیں۔ ایک حساس اور درمند انسان ان سب باتوں سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہتا۔ شوریدہ کے یہاں اس داستان کے سارے کردار اوراق اشعار میں بکھرے ہوئے مل جائینگے[!]۔

شوریدہ کے ابھی تک دو شعری مجموعے، جوش جنون (۱۹۸۰ء) اور جذبِ دروں، (۱۹۸۸ء) شائع ہو چکے ہیں تفصیل یوں ہے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| جوش جنوں | ۱: غزلیات | ۱۲۶ | تخلیقی سفر |
| | ۲: متفرق اشعار | ۳۵ | ۱۹۴۲ء |
| | ۳: قطعات | ۳۰ | تا |
| | ۴: رباعیات | ۸ | ۱۹۶۰ء |
| | ۵: نظمیں | ۶۸ | |

! پیش لفظ۔ جوش جنون: پروفیسر آل احمد سرور: (۱۹۸۰ء) ص: ۹۔۸

۲۔ جذب دروں: ۱: غزلیات :۶۷ ۱۹۶۱ء

۲: رباعیات :۳۵ تا

۳: قطعات :۲۰ ۱۹۸۸ء

۴: نظمیں :۵۰

اس کے علاوہ شوریدہ کے ادبی خطوط کا مجموعہ انہوں نے خود ۱۹۸۶ء میں زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے، اس مجموعہ میں کل ۵۷ خطوط ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا پیش لفظ اور مصنف کا دیباچہ شامل کیا گیا ہے۔ خطوط کے آئینے میں شوریدہ کی ادبی شخصیت کے خدوخال متعین کرنے میں بلاشبہ مدد ملیگی۔ جہاں شاعری میں اُن کے نظریہ شعر وحیات کے بارے میں اشارات وکنایات ملتے ہیں وہاں خطوط میں ان کی وضاحت اسطرح شوریدہ کی شاعری، اُن کے خطوط اُن کی شخصیت اور اُن کے تخلیقی سفر کو اُجاگر کرنے کے ضمن میں لازم وملزوم ہیں۔ خاص کر ہمارے یہاں جہاں اپنی ذات کی گتھی بلاتردد وتکلّف سلجھانے کو گناہ عظیم سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ یہی وہ بہترین طریقہ ہے جس سے کسی بھی تخلیقی شخصیت کی مختلف جہتیں، اپنے پُراسرار دلربا چہروں سے نقاب اُلٹ کر ہمارے سامنے آسکتی ہیں۔ اُن ممتاز شخصیات میں جن کے نام شوریدہ کے خطوط ''خطاب خامہ'' میں شامل کیے گئے ہیں رفیق خاور، پروفیسر آل احمد سرور، جناب مرزا عارف، جناب مظفر عازم، جناب اعجاز صدیقی، جناب اختر محی الدین، جناب غلام السّیدین، جناب علی جواد زیدی، جناب غلام رسول نازکی، پروفیسر حامدی کاشمیری اور شمیم احمد شمیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شوریدہ صاحب ایک صاحب طرز نثر نگار بھی ہیں۔ یہ کتاب اُن کے نثری اسلوب میں اُن کی شخصیت لے آئی ہے۔ اُن کے اخلاق وکردار کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ جو ذات اپنی فکر اور اپنے کردار کے بنیادی خدوخال

کے ساتھ شاعری میں کسی قدر چھپی ہوئی تھی۔ اُسکا اظہار نثر میں کھل کر ہوگیا ہے۔ نثر کا فن ہی ایسا ہے کہ بس نقاب اُٹھتا ہی جاتا ہے اور ذات و شخصیت کے نقوش تیزی سے اُجاگر ہوتے جاتے ہیں۔ یہ ایسے مکاتیب ہیں جو لمحوں کی گرمی نرمی میں بس لکھ دیئے گئے ہیں خیالات اور جذبات کا بے باکانہ اظہار کیا گیا ہے[1]۔

اس سے پہلے کہ شوریدہ کی شاعری کا اجمالی جائزلیا جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود اُسکا نظریہ تخلیق شعر پیش کیا جائے۔ تاکہ کام تھوڑا آسان ہو:۔

"میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میری شاعری جھوٹ موٹ کا رونا دھونا اور خیالی عشقبازی نہیں۔ اس میں قلبی واردات ہیں۔ گذشتہ دو تین سال سے اس میں تغیر آرہا ہے۔ اس میں سیاسی دینی اخلاقی اور دوسرے خیالات بھی نظم ہوتے رہتے ہیں لیکن میں اپنے شعر کو وہ تشکیل دینا نہیں چاہتا جس سے ظاہر ہو کہ یہ پروپگنڈا ہے[2]"

انہی بنیادی خیالات کو شوریدہ نے اپنی غزلوں و دیگر منظومات میں یوں باندھا ہے۔

حُسن وخوبی کی ہے شیدا شاعری
خوبخود ہوتی ہے پیدا شاعری

انفس وآفاق میں دکھلائے ہے
قدرتِ حق کا تماشا شاعری

موجزن ہوتا ہے طوفانِ خیال
حشر سا کرتی ہے برپا شاعری

شاعری شوریدہ ہے دل کی دوا
ہم ذرا کرتے ہیں اس سے غم غلط

ماورائے عشق بھی ہے شاعری
زندگی کی زندگی ہے شاعری

(جذب درون)

[1] ایک لمحہ گفتگو کا۔ دیباچہ۔ خطاب خامہ۔ (شوریدہ کشمیری) ڈاکٹر شکیل الرحمن۔ ص۔ ۷

[2] خطاب خامہ (۱۹۸۶ء) شوریدہ۔ خط بنام مظفر عازم۔ ۱۱رفروری ۵۴ء۔ ص۔ ۳۷

دوسرے الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ شاعری تخلیق حسن بھی ہے جو جینے کا سلیقہ عطا کرتی ہے۔ یہ بے ہنگم زندگی اور انسان کے درمیان ایک پُر اسرار توازن اور آہنگ کو جنم دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے، جسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ شاعری آفاقی قدروں کی حامل اور فن کی حیثیت سے سدا بہار ہونی چاہیئے تاکہ ہی ہر زمانے کے لئے ہو۔ نبی نوع انسان کیلئے بھی ہمہ گیر اور ابدی مسرت کی ضامن ہو۔

شوریدہ کو زمانہ طالب علمی ہی سے شعر گوئی سے شغف تھا۔ وہ مزاجاً لڑکپن ہی سے عاشقانہ تھے۔ جیسا کہ وہ خود ہی کہتے ہیں۔

عجب تھا ہائے کالج کا وہ دورِ طالب علمی

جب آتے جاتے میں ہوتا تھا ہم پہلوئے جانانہ

ردیف ''نوری'' والی مسلسل غزل جسے شوریدہ اپنے معشوق کے نام تحریر کردہ نیاز نامہ کا شرف حاصل ہے اسی دور کی یادگار ہے جو شعری خوبیوں اور فنی شگفتگی سے بھی پُر ہے۔ اسکی روانی بھی شوریدہ کے جنون سلیقہ شعار کی غمازی کرتی ہے۔

تمام رات کیا یہ نیاز نامہ رقم — جواب ناز کا اب انتظاری ہے نوری

وہ شام ہی سے میری دیدنی تھی محویت — کسے خبر تھی سحر نور بار ہے نوری

تیرے نگر میں غریب الدیار ہوں لیکن — گلی گلی سے مجھے اسکی پیار ہے نوری

دل طپاں کے لئے بس تیرا قد و گیسو — رواں دواں شجر سایہ دار ہے نوری

ہے دلفریب عجب کیا یہ گلشنِ گیتی — تیرے بغیر مگر بے بہار ہے نوری

وفادار اور سلیقہ شعار عاشق کو جب ایسے ہی اظہار محبت کے جواب میں ستم شعار حسینہ نے برسر بازار اُن کے وفا طلب چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کیا، تو بھی شوریدہ جفا پر بھی وفا ہی کا گماں کرتے رہے، کیونکہ عاشق پہ جفا بھی کرم ہی ہے۔

اس لئے کوئی شکایت نہیں ۔ بہت کم لوگ اسطرح خود اپنی ذات پر ہنستے ہیں ۔

جُو میرے خریدار نہ تھا دہر میں کوئی — کیا خوب ملا بر سر بازار طمانچہ
اوسان خطا ہو گئے چہرہ بھی ہوا زرد — بجلی سی گری جب ملا یکبار طمانچہ
سر گھوم گیا رنگ اڑا خون ہوا خشک — گویا کہ تھا تلوار کا اک وار طمانچہ
چنگاریاں سی اُٹھ گئیں چہرے سے پیا پے — جاڑے میں ہوا خوب شرر بار طمانچہ
سردی میں رہا گرم بہت دیر تیرا منہ — نادار کے حق میں تھا کرمگار طمانچہ
مانا کہ گل اندام ہے وہ شوخ ستمگر — کچھ تھا نہ مگر اُسکا سبک بار طمانچہ
اظہار محبت کا گنہگار ہوا میں — تھا خط کا جواب ایک گرانبار طمانچہ
واصل جو ہوا اُس ید بیضا سے یہ رخسار — کیونکر نہ ہو دلدار کا دلدار طمانچہ
شوریدہ جفا پر بھی وفا ہی کا گماں ہو — ہوتا نہیں عاشق پہ کبھی بار طمانچہ

بیس سال کی عمر میں ایسے ہی تجربوں سے ایک غیر معمولی طور حساس انسان اور شاعر کو گزرنا پڑتا ہے، جو صرف وفاؤں کے نام پر مرنا جانتے ہوں۔ کیونکہ انسانی عشق و محبت فطری وارضی ہوتے ہوئے اللہ سے لولگانے کا پہلا زینہ ہے۔

لولگانا خدا کے بندوں سے — لولگانا خدا سے ہوتا ہے

پھر یہ بھی کہ "لذت تخلیق میں زندگی کا جوہر مضمر ہوتا ہے"

شوریدہ کو اردو سے والہانہ عشق ہے، حالانکہ انکی مادری زبان بھی ہماری ہی طرح کشمیری ہے۔ اُردو میں لکھنے کے ضمن میں اُن کا پیش کردہ جواز، قابل قبول تو نہیں ہوسکتا کیونکہ مادری زبان ہی ترسیل جذبات کا بہترین ذریعہ ہے۔ وہ اُردو کے ممتاز شعراء سے متاثر ہونے کے بارے میں یوں اظہار

کرتے ہیں۔

''نیاز مند دس سال سے وقتاً فوقتاً مشقِ سخن کرتا رہا ہے۔ اپنی اُفتادِ طبع اور فطری سوز و گداز کے سبب غزل گوئی پر مجبور ہے ابتدائے مشق میں جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور جناب اثر صہبائی نے فیاضانہ حوصلہ افزائی سے ممنون فرمایا''[1]۔

میرے محبوب شعراء کون ہیں اور میں اُردو میں کیوں لکھتا ہوں؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانے ابتدائی زمانے ہی سے کئی اردو شعراء کا کلام میرے لئے دامن کش دل تھا۔ خواجہ میر دردؔ، میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، علامہ اقبالؒ وغیرہ سے خاص طور متاثر رہا ہوں۔ اُردو سے مجھے بچپن ہی سے فطری مناسبت تھی''[2]۔

اُردو کے ان چوٹی کے صاحب طرز اور عہد ساز شعراء کے علاوہ بھی شورید ہ کی شاعری پر اثرات کہیں کنایتاً اور کہیں وضاحتاً نمایاں ہیں۔ سخن فہم اور سخن شناس حضرات یہاں پیش کئے گئے اشعار سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سلیقہ سے شورید ہ نے فنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اپنا منفرد رنگ قائم رکھنے کی کوشش کی ہے یہ اور بات ہے کہ اُنہیں ہر وقت کامیابی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ ایک نیا انداز بیان اختراع کر کے اُسے اپنی انفرادیت نبھانا خاصا مشکل ہے پھر بھی شورید ہ کی سعی پیہم قابل صد تحسین ہے، بالخصوص جبکہ ہمارا ماحول ایسی کوششوں کیلئے صبر آزما حد تک حوصلہ شکن ہو۔

۱۔ خطاب خامہ: (۱۹۸۶ء) شورید ہ: خط بنام رفیق خاور۔ مدیر ''ماہ نو'' کراچی ۱۷ رنومبر ۵۳۔ ص

۲۔ خطاب خامہ: (۱۹۸۶ء) شورید ہ: خط بنام اختر محی الدین۔ نومبر ۱۹۵۴ء ص۔ ۴۸

وہ رخسار دیکھے کوئی کس طرح　　اُسے نور میں وہ چھپانے لگے

نہیں پاتا میں اُسکو اور اپنے ہوش کو باہم
وہ آتا ہے یہ جاتا ہے، یہ آتا ہے وہ جاتا ہے

حُسن اس درجہ شعلہ بار ہوا
لاکھ پردوں سے آشکار ہوا

تو ہے شوریدہ خضرراہِ عشق　　عمر تیری خدا دراز کرے
آنکھ مجبور ہے نظارے پر　　دہر کیسا تھ نگار خانہ ہے
آتش عشق نے جلا ہی دیا　　خاک کو خاک میں ملا ہی دیا
یہ گلشن کشمیر وہ اُن کا قد رعنا　　فردوس میں طوبیٰ شجر دیکھ رہا ہوں
مجھے حاصل ہے سرمستی ازل سے　　رہینِ بادہ و ساغر نہیں ہوں

(جوش جنون)

دیکھنا ہے وہ پیکر عصمت　　اپنی آنکھوں کو دھو رہا ہوں میں
عاشقو عشق میں کمال کرو　　دل کو شایانِ ذوالجلال کرو
ہائے کس ڈھب سے چلی جاتی ہے　　نور کی ندی بہی جاتی ہے
دیکھ کر میرا عشق بے پایان　　حسنِ کُل ہوگیا سراسیمہ
یار سے ہونگا اگر ہم آغوش　　تو ابد تک رہونگا میں بے ہوش
عشق میں چاہئے شوریدہ کہ ہو پاس ادب　　ہم سے دیوانون پہ دنیا کی نظر ہوتی ہے
چھپ چھپ کے یہ کون خودنما ہے　　ہر شے میں ہیں یہ کس کے اشارات
جدھر بھی ڈالو نگاہ اُدھر سے تباہی دبر ہمی ملیگی　　تڑپتی دم توڑتی سسکتی کراہتی زندگی ملیگی
جلوہ گروہ ہوگئے اُس آن سے　　ہاتھ دھو بیٹھے ہزاروں جان سے

یہ نظر کہاں جمتی وہ نگہہ کہاں اُٹھتی　　رعب تھا یہاں چھایا، شرم تھی وہاں طاری
نہ ہوں محبوب، گر تیری جفائیں　　تو دل کیا اس خرابے میں لگائیں
بارِ احساں اٹھا نہیں سکتی　　اتنی نازک ہے مفلسی میری
جادۂ حق ہو بارۂ الفت　　کھلے جاتے ہیں ہم غریب بہت
کتنی عالی ہے بارگاہ عشق　　عرش بھی جسکا ایک زینہ ہے
گلستان کا شہر ہے ایک مدفن کی طرح　　بے زباں لاکھوں زباں والے ہیں مومن کی طرح
مکینوں سے خالی مکاں ہو گئے ہیں　　زمانے کی نیرنگیاں دیکھتا ہوں
یگانے بھی بے گانے اب ہو رہے ہیں　　سیاست کی شیطانیاں دیکھتا ہوں
ہزاروں کی شہادت ایک کروٹ ہے سیاست کی　　ابھی خون بنی آدم کی ارزانی نہیں جاتی
خارزاروں سے بچ کے ہم نکلے　　تیرے رخ کے گلاب نے مارا
ہم بلاؤں سے جنگ کرتے ہیں　　طبع فطرت کو تنگ کرتے ہیں

(جوش جنوں)

ایسے اشعار میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ شوریدہ کی شاعری کا آغاز نہایت ہی عہد ساز اور انقلاب آفرین دور میں ہوا جب ہمارے کشمیری شعراء مہجور، عبدالاحد آزاد، مرزا عارف و دیگر شعراء، طلوع صبح کی خوش آمدید کہنے میں پیش پیش تھے اور خود علامہ اقبالؒ بیداری کی نئی لہر اور عظمت آدم کے اول نغمہ خواں کی حیثیت سے ہمیں خود کو پانے اور شکوہ رفتہ کے پانے کی ہر رنگ ترغیب دیتے تھے۔ دنیا ایک نئے اور بیسویں صدی کے دوسرے بڑے انقلاب کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ یہ اُس کی اُفتادِ طبع ہی ہے یا کہ خلوت پسندی کہ اُنہوں نے دوسرے شعراء کی مانند خطیبانہ انداز میں بہ آواز بلند موہوم آزادی کے نغمے گائے اور زیادہ اپنی شعری تخلیقات میں

کنایتاً ہی روح عصر سمونے کی کوشش کی۔ جہاں انہوں نے اس کے برعکس شعوری یا غیر شعوری کوشش کی وہاں وہ ناکام ہی رہے ہیں۔

دل وجگر پہ چوٹ لگے تو آدمی سراپا درد بن جاتا ہے ایک صاحب دِل حساس شاعر شوریدہ اپنی رفیقہ حیات کے واصل بحق ہونے پر بھی متانت و سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

آہ خونیں جگر کہاں سے لاؤں — خشک ہوں چشم تر کہاں سے لاؤں
غم کے تیروں سے ہو گئے چھلنی — تازہ قلب وجگر کہاں سے لاؤں
تیرے کھونے سے کھو گئی ہے یہ — جنت کاشمر کہاں سے لاؤں
آسمان و زمین ہیں بدلے سے — اب وہ شمس و قمر کہاں سے لاؤں

فروری ۱۹۶۰ء

نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد'' میں بھی نوحہ غم کا انداز سادہ سنجیدہ مجروح جذبات کا آئینہ دار ہے۔ یہ دونوں مراثی متلاطم جذبات کی عکاسی متوقع شدت سے تو نہیں کرتیں لیکن ''مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ'' پر شوریدہ کے یقین کی ترجمان ضرور ہیں۔

نالۂ جانکاہ سے پتھر کو پگھلاتے ہیں ہم — سینۂ افلاک کو بھی آج برماتے ہیں ہم
کون اب کھڑکی پہ آئے دیکھنے کو بار بار — دیر سے گھر مدرسہ سے گاہ گاہ آتے ہیں
سلسبیل وکوثر و تسنیم ہوں تیرے نصیب — چشم دل سے درد و غم کے اشک ڈھلکاتے ہیں

(نومبر ۱۹۵۵ء)

۱۹۴۹ء میں ''جموں جیل'' میں تین ماہ کی قید و بند کی صعوبتوں کو اُس دلنشین پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ کال کوٹھڑی کی تصویر ہماری نظروں کے سامنے اُبھرتی ہے۔ اس نظم میں کوئی احساس ندامت نہیں۔ یہ ارباب حل عقد پر طنز و ملامت ہے کہ ایک دیوانے کو پابہ زنجیر کر دیا۔

—

آزادگی کا دل آتا ہے وہ زمانہ
وہ گلستانِ کشمیر، وہ اپنا آشیانہ
جنکے سبب یہ زنداں اپنا بنا ٹھکانہ
صیاد ڈھونڈتا تھا پہلے سے وہ بہانہ
ایام گرمیوں کے پھر تنگ وتار حجرے
سنگین وسخت تر ہے جموں کا جیلخانہ
کیڑے مکوڑے چھت سے ہیں فرش پر ٹپکتے
رہتا ہے سانپ بچھو کا خوف جاودانہ
کیا جانے اُٹھتی ہے کیوں اک ہوک اپنے دل سے
گاتی ہے جب گجر دم کوئل کوئی ترانہ
اللہ مصیبتوں میں آتا ہے یاد سب کو
اِن سختیوں میں قیدی پڑھتے ہیں پنجگانہ
شوریدہ کو بھی ناحق پکڑا گیا ہے یارو
بیچارے کا ہے مسلک مدت سے عاشقانہ

''جذب دروں'' کی غزلوں میں شوریدہ کے ارتقائی تخلیقی سفر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس مجموعہ میں غزل کی درخشندہ روایات کا تخلیقی ادراک فنی رچاؤ، تشبیہ واستعارہ کا فنکارانہ برتاؤ تازہ کاری روانی، سادگی ومتانت جیسی دوسری شعری تخلیق کی خوبیوں کی ممکنہ حدتک کار فرمائی ہے۔

شوریدہ ایک ایسے شاعر ہیں جو اُردو شاعری کی کلاسیکی روایات وآداب کا مطالعہ رکھتے ہیں، انہوں نے میر، غالب، اقبال اور حسرت موہانی کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اتنا ہی نہیں بلکہ اُردو غزل کے مروجہ مضامین یعنی ہجر ووصال، ساغر وصہبا، سماجی اونچ نیچ اور فطرت کی نیرنگیوں کو نظم کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے روایتی لفظیات ہی کا سہارا لیا ہے اکثر مقامات پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روایت اُن کے دل ودماغ پر حاوی ہوگئی ہے اور اُن کے ذوق وسخن کی حدیں مقرر ہیں۔ تاہم اسکا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے عہد کے تضادات یا بوالعجیوں کی خبر نہیں رکھتے۔ اپنے فقیرانہ اُسلوب زیست کے باوجود وہ گردوپیش کی زندگی کے بدلتے حالات کا علم رکھتے ہیں۔ وہ سماجی سطح پر نیکی اور بدی کی آویزشوں کا مشاہدہ کرتے ہیں یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے خیالات سے

فوری جذباتیت کو افشا نہیں کرتے بلکہ ایک معصومانہ ردِ عمل کے پابند رہتے ہیں۔ وہ انسانی شرافت، سچائی اور ہمدردی کی پامالی سے افسردہ ہو جاتے ہیں اور قلم برداشتہ اپنے فوری رد عمل کو نظم کرتے ہیں[۱]۔ ریاستی سطح پر وہ اُردو کی اُس شعری روایت کی آبیاری میں اہم مقام رکھتے ہیں جسے پروان چڑھانے اور نکھارنے میں طالب کشمیری، شہ زور کشمیری، تنہا انصاری، غلام محمد میر طاؤس اور رسا جاودانی نے اپنے طور بھرپور حصہ لیا۔ اب شوریدہ کی ''جذب دروں'' میں بکھری گلکاری کے کچھ رنگ بھی دیکھتے جائیں۔

رنگ بُلبُل سرود بُلبُل میں
خونِ دل چاہیئے تغزل میں

وہ نظر پھر جگر کو برمائے
دِل میں اُمید کی کرن سی ہے

آنکھ یوں خونبار ہو کر رہ گئی
وہ گل و گلزار ہو کر رہ گئی

آندھیوں نے یوں بکھیرے بال سب
ہم نے دیکھے اُن کے خدوخال سب

بہار اب کے نہ جانے کھلائے گل کیا کیا
ہوا ہے میکدہ بروش دیکھیے کیا ہو

جیتے ہیں یوں کہ تن کے کپڑے کو
بسکہ اپنا کفن سمجھتے ہیں

دیدِ جاناں ہے نقد دل کے ساتھ
جنس بہ خوش خرید ہوتی ہے

عشق کے آس پاس ہے وہ شے
عقل سے جو بعید ہوتی ہے

بو الہوس بوالفضول ہوتا ہے
بے حیا بے اصول ہوتا ہے

کارواں کا ہی ہے خدا حافظ
راہ خود، راہنما بھول گئے

دلبر بے بدل کا بسمل ہوں
ایک مجسم غزل کا بسمل ہوں

جانے کیوں موج آب ہے بیتاب
وصل میں بھی یہ سر پٹکتی ہے

جمہوریت کی مچ رہی ہے دھوم ہر طرف
فرصت نہیں مجھے کہ عدالت گزیدہ ہوں

کتنے شیطان ابھی جنم لیں گے
پھر سیاست کا پاؤں بھاری ہے

جب ملے تو موت بھی اچھی ملے
ہیں جہاں میں موت کے سامان بہت

مصحف روئے یار کی اللہ
ہر تلاوت جدید ہوتی ہے

کھلی تو اک سایہ ساتھ ساتھ رہا
بس لڑکپن میں اک پری دیکھی

شان تیری ربوبیت آن مری عبودیت
دخل کہاں میں دے سکا تری سیاسیات میں

تونگری ہو تو پہچان لے گی سب دنیا
ہو بے نوائی تو کوئی نہ آشنا نکلے

یہ آشیانے سبھی آندھیوں کی زد میں ہیں
پہاڑ کوئی اب یہاں چمن پناہ نہیں

کسی بھی شاعر کا کلام اول سے آخر تک ایک ہی سلسلہ فکر وفن ہونے کے باوجود مختلف النوع تجربات، نادر انکشافات اور صوتیات کا حامل ہوتا ہے۔ فکر وفن کے سلسلے کی ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ مربوط بھی ہوتی ہے۔ اور اسکی الگ ایک انفرادیت بھی ہوتی ہے زیر نظر مجموعہ کلام (جذب دروں) اس حیثیت سے "جوش جنوں" کا تسلسل ہونے کے باوجود اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے شوریدہ صاحب کی غزل اور نظم دونوں میں روایت کا احترام بدرجہ اتم نظر آتا ہے لیکن وہ روایت کے اسیر نہیں۔ اُن کی نظر دیروز پر ہی نہیں بلکہ امروز و فردا پر بھی ہے عصر حاضر کی بلاتلاشیاں اُن کے یہاں غزل میں بھی ڈھل گئی ہیں اور نظم میں بھی[1]۔

بنی نوع انسان کی حالت زار دیکھ کر، شوریدہ کی آنکھیں نم ہوتی ہیں اُس کا جذبہ مروت وہمدردی متلاطم ہوتا ہے اور وہ کراہتی انسانیت کا مداوا رب کائنات اور محسن انسانیت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے ڈھونڈتے ہیں۔

الٰہی پھر مسلماں صاحب تقدیر ہو جائے
حیات اُسکی سراسر عشق کی تصویر ہو جائے

پھر سے دنیا کا بخت ہو بیدار
تا کہ جنت ہو یہ جہنم زار

شاہ عرب ہمارا سردار اللہ اللہ
خلق خدا کا پیارا غمخوار اللہ اللہ

[1] پیش لفظ: جذب دروں: پروفیسر جگن ناتھ آزاد: ص ۶۔۷

آب حیات کے یہ ظلمات میں ہیں چشمے — آیات اللہ اللہ اخبار اللہ اللہ
قرآن کی تفسیر ہے گفتارِ محمدؐ — اخلاق کی تعبیر ہے کردار محمدؐ

مکاں سے خدا کے مکاں جارہا ہوں — میں مجذوب دارلاماں جارہا ہوں
خیالات وجذبات میں دل میں کیا کی — لئے ساتھ اک کارواں جارہا ہوں

نکل پڑے ہیں گھروں سے وہ اسطرح جیس — نہ خانماں نہ کوئی خانوادہ رکھتے ہیں
جس پہ قرآن کا نور ہو نازل — خاکیوں میں وہ ماہ کامل ہے

''نغمہ توحید'' جوگی، اے خدائے ذوالجلال، حقیران خدا، طلبہ کا ترانہ، قرآن میں ڈوب جا، بنی الامی امام الانبیاؑ، ظہور آنحضورؐ، دعائے نور، چلتا بن ساجن کے ساتھ بھی اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ جنمیں شوریدہ رضائے الاہی کے ساتھ ساتھ فلاح دین ودنیا چاہتے ہیں۔ اور جہان رنگ بو، میں محبت کی فرمانروائی بھی۔

ایں دعا ازمن واز جملہ جہاں آمین باد

شوریدہ نے فارسی شعراء کی عارفانہ رباعیات کا ترجمہ بھی ''جذب دروں'' میں شامل کیا ہے۔ ترجمہ سو فیصدی تخلیقی اور کامیاب ہونا بہت مشکل ہے، لیکن ایک رباعی کا اُردو ترجمہ قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے حاضر ہے۔

شیخ ابوسعید ابوالخیر — شوریدہ

عاشق کہ تواضع نہ نماید چہ کند — عاشق کہ تواضع ہی دکھائے ناچار
شب ہا کہ بکوئے تونیاید چہ کند — راتوں کو کوچے میں آئے ناچار
گر بوسہ زند زلف تُرا رنجہ مشو — ناراض نہ ہو جو زلف کا لے بوسہ
دیوانہ کہ زنجیر نخاید چہ کند — دیوانہ زنجیر بجائے ناچار

شوریدہ کے کلام میں طنز وظرافت کے تیر ونشتر کہیں اشارتاً اور کہیں اعلاناً بکھرے ملیں گے لیکن ''جذب دروں'' میں انہوں نے دس بارہ صفحات

''مطائبات'' کے عنوان سے شامل کردیا ہے۔ جہاں اگر شوریدہ کا ہر تیر نشانے پر تو نہیں لگتا لیکن کبھی کبھی کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔

اب ہے طرزِ امتحان عشق اور فیل عاشق بوالہوس ہوتے ہیں پاس
دل خدا کا گھر ہے اور شیطان بھی گھومتا پھرتا ہے دل کے آس پاس
گھر کے باہر ہے گاڑیوں کا شور اور اندر ہے باہمی بکواس
ہو جو موسم گرما تو جدائی بہتر ہو جو سرما تو حسینوں کا وصال اچھا ہے
میانِ عاشق و معشوق یکرنگی چلے کب تک کبھی راضی، کبھی باہم خفا ہونا ہی پڑتا ہے
غلط رستے پہ جو پڑتے ہیں لٹ جاتے ہیں وہ راہی کسی رہزن کو انکار رہنما ہونا ہی پڑتا ہے
حیاداری میں شوریدہ رضائے رب ہے پوشیدہ مگر اک شب حیاء بے حیا ہونا ہی پڑتا ہے

شوریدہ کی شاعری کا تیکھا اور انوکھا رنگ جو انہوں نے وطن مالوف کشمیر میں فطرت کی نیرنگیوں سے لیا ہے۔ انکی شاعری کا نہایت دلکش باب قرار دیا جا سکتا ہے۔ منظر کشی میں تخیل و محاکات ذات و کائنات اور رومان و حقیقت کو ایک اکائی بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ کہیں غزل، کہیں مثنوی اور کئی نظم کی صورت میں نغمہ بہار (دو غزلہ)، وشونالہ، باغ نشاط، نیرنگ زمستان، آندھی، ڈل کا منظر، ڈل اور چاند جیسی دوسری تخلیقات اس ضمن قابل ذکر ہیں، جن کی روانی، سوز و ساز، موسیقیت، لفظیات سبھی رنگ بدلتے جمیل پیکر کی طرح اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں، میں چند ایک مثالوں پر یہاں اکتفا کرتا ہوں۔

باغ ہے جائے ملاقاتِ جمیل ارتباط و ارتباط و ارتباط
گاؤ تکیہ اس کے پیچھے کوہسار سامنے تالاب ڈل آئینہ دار
(نشاط)

دیکھو نیرنگ یہ زمستان کا رنگ بدلا ہے سب گلستان کا
برف ہی برف ہے جدھر دیکھو ساری فطرت ہے سیم بر دیکھو

اُجلے کپڑا درخت پہنے ہیں — اور بازو، میں اُن کے گہنے ہیں
لو یہ نورو ظہور کا عالم — ہر شجر پر ہے طور کا عالم
یخ قلم کی چھتوں سے لٹکے ہیں — گھر دلہن ہے وہ اُسکے لٹکے ہیں
برف و یخ سے ڈھکے ہیں دشت جبل — کاشمر بن گیا ہے شیش محل
ایک جہانِ طلسم ہے وادی — یہ سمن بر ہمالیہ زادی
جب پڑے آفتاب کا پرتو — ٹوٹ جائیگا یہ طلسمِ نو
دہر ہے بے قرار شوریدہ — کہتے ہیں سب بہار کب آئے

(نیرنگ زمستان)

ڈل سہانا ہے کیا چاندنی رات میں — ہے یہ غرقاب کیا جلوہٗ ذات میں
ایک طوفان برپا ہے جذبات میں — جانے ڈوبا ہے دل کن خیالات میں

غوطہ زن ہو کے موتی لگے ہاتھ کچھ
دامن دل میں لایا ہوں میں ساتھ کچھ

ہائے کیا دلکشا منظر شان ہے یہ — چھچھوں کا عجب محشرستان ہے یہ
حُسنِ فطرت کا کیا مظہرستان ہے یہ — یا پُر اسرار کوئی پرستاں ہے یہ

یہ فسون و فسانہ کا گہوارہ ہے
یہ طلسم و ترانہ کا گہوارہ ہے

جگمگاتی ہے کیا ڈل میں وہ بارگاہ — یادگار جناب رسالت پناہ
گونجتی ہے صدا کیا یہ شام و صبا — لا الہ الا اللہ لا الہ الا اللہ

کوثر کاشمر کے بھی ساقی ہیں وہ
آج بھی ہم غریبوں میں باقی ہیں وہ

(ڈل کا منظر)

یہ نظم جس کے تین ہی بند میں نے یہاں نقل کئے ہیں ایک تاریخی مشاعرے میں پڑھی گئی جو ۱۴ر ستمبر ۱۹۵۹ء کو ناظم تعلیمات جموں کشمیر کے حُسنِ اہتمام سے سرینگر کے سیاحوں کے استقبالیہ مرکز میں منعقد ہوا تھا، اتنی پیاری اور خوبصورت نظم کو انعام سے کیوں نہیں نوازا گیا یہ ایک الگ بات ہے اور بحث طلب امر بھی، لیکن شوریدہ صاحب کے مشاعرے کے بارے میں مشاہدات قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہونگے، وہ لکھتے ہیں۔ ۱۴ر ستمبر کی شام کو میں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ مشاعرہ میں شریک ہونے کے لئے سیاحوں کے استقبالیہ مرکز کی طرف چل دیا جن کیلئے مجھے پے در پے تین دعوتی خط ملے تھے۔ آخر وزیر اعظم بخشی صاحب کی آمد کے بعد ہی اُنہی کی صدارت مشاعرہ ساڑھے چھ بجے شام شروع ہوا۔ پہلے نومشقوں کو کلام سنانے کا موقعہ دیا گیا۔ چونکہ مشاعرے میں دو نشستیں ہونے والی تھیں ایک اردو دوسری کشمیری کی، نیز شعراء کی تعداد بھی خاصی تھی اس لئے میں بے قرار سا رہا۔ سوچ رہا تھا ''ایسا نہ ہو کہ مجھے اپنی نظم اطمینان کے ساتھ پڑھنے کا موقعہ ہی نہ ملے'' آخر جب میری باری آئی میں نے موقعہ کی نزاکت کے پیش نظر اور حسب عادت اپنی نظم تحت اللفظ مگر جلد جلد پڑھنا شروع کی۔ دو ایک بند ہی سنائے تھے کہ ہال کے عین درمیان شوروغوغا بلند ہوا۔ ایک گوشے سے داد دی جارہی تھی، شور کرنے والوں میں مشہور خوشرو جوان جس نے پہلے ہی میری طرف معاندانہ اشارہ کیا تھا پیش پیش تھا۔ وہ تعمیر کا ایڈیٹر رہ چکا ہے اور کبھی میرا شاگرد بھی۔ اُس کی شوخی اور شرارت حد سے تجاوز کر گئی۔ نہ جانے اُسے کیا تھا بخشی صاحب کی ڈانٹ بھی اُسے خاموش نہ کر سکی۔ لگ بھگ چار گھنٹے مشاعرہ کی دو نشستیں جاری رہنے کے بعد انعامات کا اعلان کیا گیا جس نے نہ صرف شعراء کو بلکہ سامعین کو ورطۂ حیرت میں ڈالدیا۔ اردو میں ولیؔ (امرچند) کو جو ایک بزرگ ہیں، دوسرا انعام اور آپ کو تیسرا دیا گیا، حالانکہ قبل الذکر کا کلام فن اور زبان وبیان کے اعتبار سے اغلاط سے پُر تھا۔ سیفی صاحب کو پہلا انعام

عنایت ہوا۔ بیشک انکا کلام انعام کا مستحق تھا لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ کس درجے کے انعام کا، کیونکہ دیگر چند اصحاب کی نظمیں بھی اول درجے کی تھیں جن میں آپ کی بھی نظم ہے کشمیری میں جو پہلا انعام راہی صاحب کو دیا گیا وہ اصولاً بالکل اُسکے مستحق نہ تھے کیونکہ اُنکی نظم ''سونہٕ لانکہِ پٹھ'' (سونہ لانک پر) تین سال پرانی چیز تھی اور چھپ بھی گئی تھی نیز اُسکا موضوع ''چاندنی رات میں جھیل ڈل کا منظر'' کے بجائے کچھ اور تھا اور اُن کی تعریف میں ماسٹر زندہ کول صدر کشمیری نشت نے پہلے ہی فرمایا تھا۔ راہی کا کلام سننے کے بعد میرا کلام سنانا زیب نہیں دیتا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اس انعام کا مستحق فراق (غلام نبی) تھا۔ جس کو تیسرے درجہ کا انعام دیا گیا۔ دوسرا انعام فاضل صاحب کو ملا۔ وہ ضرور ایک کہنہ مشق شاعر ہیں لیکن کچھ عرصے سے بھٹی کرنے کی وجہ سے منظورِ نظر ہوگئے ہیں۔ الحاصل جس درجے کے انعامات جنکو ملنے چاہیے تھے انہیں نہ دیئے گئے۔ اُردو کے انعامات کا تصفیہ جسٹس مرتضیٰ فضل علی، پنڈت نندلعل کول طالب اور مسٹر علی جواد زیدی کے ہاتھوں میں تھا اور کشمیری کے انعامات کا فیصلہ جسٹس شہمیری، پروفیسر جیالال کول اور مرزا کمال الدین شیدا کے ذمہ تھا[1]۔

شوریدہ جو شعر میں بڑا انہاک رکھتے ہیں اُردو کے کلاسیکی شعری سرمایہ فن کے اسرار و رموز، بیان اور حسن بیان پر قدرت رکھتے ہیں اور وادی کے اچھے صاحب فکر شاعر ہیں۔ اپنے بے ریا نظریہ فن کے برعکس، اپنا زورِ قلم کبھی کبھی بے جا طور ہنگامی موضوعات پر بھی صرف کرتے ہیں دیکھا جائے تو یہ بھی زندگی کی زلف پریشاں ہی کی دین ہے۔ بقول اقبالؒ

اگر سخن ہمہ شوریدہ گفتہ ام چہ عجب
کہ ہر کہ گفت ز گیسوئے او پریشاں گفت[2]

[1] خطاب خامہ: شوریدہ (۸۶ء) خط بنام تنہا انصاری (۱۳ اکتوبر ۱۹۵۹ء) ص [2] شوریدہ کی ایک اور تالیف ''کلمات نبوی'' (منظوم) کی طباعت کا ابھی انتظار ہے

# کشمیری لوک گیت

## ایک اجمالی جائزہ!

زندگی حاتم بھی ہے، قاروں بھی، کریم بھی ہے، قہار بھی اس لئے جلال و جمال کی لامحدود وسعتوں کا احاطہ کرنے کی خاطر انسان کو تخیّل کے بے انتہا امکانات سے کام لیکر تسخیرِ فطرت کا ناگزیر فریضہ انجام دینا پڑا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ابن آدم کے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھا دعوتِ مرگ دیتا رہے۔ دوسرا یہ کہ وہ میدانِ عمل میں اپنی جان سے کھیلتا رہے اور بنی نوع انسان کی مادی و رُوحانی مسرتوں کا باعث بنے۔ بقول غالبؔ

جان دی ، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جہد البقاء کی دادو گیر میں ان گنت سوالات کا جواب ڈھونڈنے کیلئے انسان نے ان گنت جوابات وضع کئے۔ یوں من کی دنیا بھی اُجڑنے سے بچی اور زندگی کی وادی پُر خار کا کٹھن سفر بھی عشق بے پایان اور ذوق بوقلمون کی بدولت جاری رہا۔ اس صحرا نوردی میں ماہ و خورشید، تارے، چرند و پرند چھوٹے بڑے کیڑے مکوڑے، اُبلتے چشمے، پیڑ پودے، شجر ثمر بار، دریا اور سمندر، جبل و کوہسار، غرضیکہ ساری کائنات انسانی زندگی کا جز و لا ینفک بنی رہی۔ جبلی ضرورتوں کے پیشِ نظر اُس نے دیو مالائی دنیا آباد کی۔ محیر العقول اساطیری کردار تخلیق کئے۔

اقوام عالم کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ آدمؑ وحوا کے گرد جنّت وجہنم، یزدان واہرمن، نیکی و بدی کے حامل اساطیری کردار کی توضیح جُدا گانہ ہوتے ہوئے بھی بہت حد تک ملتی جُلتی ہے انسانی شعور کی بے پناہ تخلیقی قوتوں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ہم انہی تخلیقی سرچشموں سے فیضان حاصل کرتے ہیں اور مختلف عقائد ورسوم کے زیرِسایہ پلتے ہیں۔انسانی تہذیب وتمدن کی بنیاد یہی روایتی قدریں ہیں۔جنہیں (Folklore) لوک سائینس یالوک وِدیا کہہ سکتے ہیں لوک سائینس (Folklore) کی وسیع اصطلاح ۱۸۴۶ء میں ایک انگریز محقق اور عالم جان ولیم تھامس نے وضع کی۔ولیم تھامس قدیم علوم کا جیّد عالم اور ماہر گزرا ہے یہیں سے اس سائینس کی ابتداء ہوئی ہے اورلوک ادب اسی سائینس کی ایک اہم شاخ ہے۔لوک ادب کوزبانی ادب (Oral Literature) بھی کہا جاتا ہے جوصدیوں سے سینہ بہ سینہ چلا آیا ہے۔اور جس میں ہماری بولتی اور بدلتی انسانی تہذیب کی تاریخ محفوظ ہے۔لوک ادب ہماری روایتی تہذیبی قدروں کا آئینہ ہی نہیں نگہبان بھی ہے۔

شاید یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ کشمیرلوک کتھاؤں کا گہوارہ رہا ہے۔اس سلسلہ میں سوم دیو کی ''کتھاسرِت ساگر'' قابل ذکر ہے گناڈ'' کی برہت کتھا'' بھی اسی سلسلے کی اہم اور اوّلین کڑی ہے۔ویشنو شرما کی پنچ تنتر کی صدائے باز گشت ساری دنیا میں سُنائی دیتی ہے۔اس کے محیر العقول کردار کرکٹ دمنک ترجمہ وتوارُد کے منازل طے کر کے کلیلہ ودمنہ کے نام سے فارسی زبان کی وساطت سے کشمیری میں منتقل ہو کر آئے اور ہماری ارضِ مالوف کشمیر کے ہو لئے۔

زبانی ادِب (Oral Literature) کی مختلف اصناف پہیلیوں، ضرب الامثال، محاوروں اورلوگ گیتوں کی ہمہ گیریت اور آفاقیت میں مضمر، اجتماعی تجرباتی دانشمندی کی اہمیت مسلمہ ہے۔لوک ادب اُتنا ہی قدیم ہے جتنی

کہ خود انسانی زندگی۔ اسلئے اِسے بجا طور پر انسانی نفسیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک چینی مفکر کی رائے میں ''لوک گیت اُن ہیروں کے مانند ہیں جو صدیوں سے دھرتی کے سینے میں پوشیدہ ہیں اور اُس دن کے مُنتظِر ہیں جب کوئی اہل نظر انہیں ڈھونڈ نکالنے کے بعد پرکھیگا۔'' مشہور عیسائی مبلغ جی۔ ایچ۔ نوولز جس نے ۱۸۸۷ء میں سب سے پہلے کشمیری لوک کہانیوں کا انگریزی ترجمہ شایع کیا۔ یوں رقم طراز ہے۔ ''دنیا کا کوئی مُلک، لوک ادب اور لوک گیتوں کے شعبہ میں زرخیزی کے لحاظ سے کشمیری زبان پر سبقت نہیں لے گیا ہے''۔ ایک یورپی محقق و تاریخ شناس سر ارل سٹائن کے دل میں کشمیری لوک ادب کے وساطت سے ہی کشمیری تاریخ و تمدّن کا ناقدانہ مطالعہ کرنے کے مقدس جذبہ نے کروٹ لی۔ کشمیری زبان کا محسن اول سر جارج گریرسن بھی کشمیری لوک ادب کی اجتماعی فہم و فراست کا معترف ہے۔ فطرت اوّلین فنکار ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ کہ تحریری زبان وجود میں آنے سے پہلے لوک شاعری و ادب کا وجود ہی نہیں تھا۔

کشمیری پنڈتوں میں شادی بیاہ اور دوسری تقریبات پر گائے جانے والے گیتوں[1] میں ہندو دیو مالا کا بھرپور استعمال ہوتا ہے۔ ''دیوگان'' ایک رسم ہے جو حنا بندی کی رات اور لگن کے درمیان ادا کی جاتی ہے۔ اس موقعہ پر جس گیت سے بھگوان کا نام لیکر شادی و مسرت کی شروعات کی جاتی ہیں وہ کسی حد تک لسانی طور محدود ہونے کے باوجود ہمارے قدیم تہذیبی ورثہ کے ساتھ ساتھ ذخیرہ الفاظ کی میراث کو بھی محفوظ کیے ہوئے ہے چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

---

1۔ انہیں ہینزے کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

۱۔ پنڈت نے شاگرد کو اُپدیش دیا کہ رات بھر ہوَن کی تیاریاں ہوں
۲۔ لونگ اور سندور سے کلش کی پوُجا کر اندر دیوتا کی فتح ہو۔
۳۔ اے ایشور میں تیری تلاش میں اپنے گھر سے چل نکلی دھیرے دھیرے تیرے استھاپن پر پہنچی۔
۴۔ تجھے اچھے بھاگ نصیب ہوں، تیرے کرموں کو (اے دُلہن کنہیا) پرنام۔

پنڈی تن وبدۂ نی پنہ نس ژاٹس راتس کرِہن ہُمہٖ کُے سنز
کلش پوُزگرگونگہٖ تے سہندرے یئند راژ بوٚ وِنے جے جے کار
تھاران دژالیس نند کیشورے پھیران وأژس چون ڈیریل
زنمس شوبھ پھل پراو کھرُت ییٔ کرمس چائنس نمسکار

دولہے کے استقبال کے گیتوں سے ایک دو مثالیں دلچسپی سے خالی نہیں ہونگیں۔

۱۔ ہاتھی بوجھ اُٹھائے، گھوڑوں پر سوار، ہماری مینا کا مقدر پرندے پر آن پہنچا۔
۲۔ تمہارے گھوڑے کا چابُک سونے کا تم بھیرو کے استھاپن سے آئے۔
۳۔ براتی لوگ کثیر تعداد میں آئے کس گلی سے داخل ہوں، دولہا وِشوامتر کی سپُتری کو بیاہنے آیا۔

اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ کشمیری پنڈتوں میں شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے جانے والے مقبول گیتوں کا آہنگ وید منتروں اور بھجنوں کے آہنگ سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ جبکہ کشمیری مسلمانوں میں رائج گیتوں کی اثرانگریزی بدلتی سماجی اور مدنی زندگی کا بھرپور انداز میں ساتھ دے رہی ہے۔ شہر باسیوں میں ان گیتوں کا چلن کم ہوتا جارہا ہے۔ جس کے پیش نظر ان کی تاریخی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کے مساعی جمیلہ سے لوک گیتوں کے کئی مجموعے

شایع ہوئے ہیں جن میں ڈوڈہ ضلع کے لوک گیت بھی شامل ہیں اسطرح ہمارا یہ ثقافتی ورثہ محفوظ رہنے میں بہت حد تک مدد ملے گی۔

چودھویں صدی عیسوی سے کشمیر میں اسلام کے گہرے نقوش اُبھرنے لگتے ہیں۔عقائد کی تبدیلی سے نیتجتاً لوک ادب کا سانچہ بھی بدل گیا۔ ہندو دیو مالا کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرت بھی پنپنے لگی۔جنیؤ پہننے اور لگن کی رسم کے دوش بدوش نکاح اور ختنہ بھی راوج پا گئے۔لاشعور میں رچی بسی روایتی قدروں، اور رسوم سے چھٹکارا پانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔اسلیئے ان کی پرچھائیاں بھی سایہ فگن رہیں۔ تیرتھوں اور استھاپنوں کی جگہ عبادت گاہوں، خانقاہوں، زیارات گاہوں اور آستانوں نے لی۔ نئے عقائد کی روشنی میں لوک گیتوں نے بھی اظہار کی نئی کروٹ لی

۱۔ اللہ کے نام سے گیت گانا سر شروع کریں۔اور شکر بجالائیں کہ ہماری دلی مراد پوری ہوئی۔

۲۔السلام علیکم۔مبارک ہو ہماری دعوت بر پر آپ کی تشریف آوری۔
آبِ حیات کے جام لئے ہم آپکے منتظر ہیں۔

۳۔جس نے اس نیک کام کا بیڑا اُٹھایا اُسکی رکھوالی پیغمبر آخر الزّمان یعنی حضرت محمدؐ کریں۔

۴ اعمال صالح کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔ مینا (دلہن) کے لئے اُسکے بعد اَچھے اچھے گیت گانا۔

لوک مزاج زندگی کی رنگارنگی سے بے خبر نہیں ۔موقعہ ومحل، الفاظ وآہنگ جذبات واحساسات، واقعات ومحاکات کا انتخاب ہوتا رہتا ہے۔ونہ وُن (شادی بیاہ کے گیت) ویگی وژن (وو امنڈل یا رنگولی کے گیت) وژن

( گیت ) منزٕ لی بأتھ ( پنگوڑے کے گیت ) رؤف ( لوک رقص کے گیت ) چھکر بأتھ ( چھکری ) لڑی شاہ ( سیاسی اور تاریخی ، سماجی اور تاریخی گیت ) نیری بأتھ ( چرواہوں کے گیت ) ننبدٕ بأتھ ( نلائی کے گیت ) برٕ زٕمیچہ ہٕندی بأتھ ( زچہ و بچہ کے گیت ) ٹُری بأتھ ( بچوں کے گیت ) وان ( نوحہ خوانی ) منظوم کہاوتوں اور پہیلیوں کے مطالعہ سے لوک مزاج کی بے نام مخفی تخلیقی جہتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔لوک گیتوں کی فطری رنگارنگی دیکھئے کہ ہر صنف کی ادائیگی کا انداز جُداگانہ ہے۔

مہد سے لحد تک لوک گیتوں کی لے ہمارے ساتھ رہی ہے جنکا بیشتر حصہ عورت کی زبانی ادا ہوتا ہے۔اسکی وجہ سماج میں مرد کی بالادستی نہیں بلکہ اِنسان کی داخلی تخلیقی ،جبلی سماجی ضرورت ہے۔آفات سماوی اور افراط وتفریط کے موقع پر ہمارا لوک فنکار لڑی شاہ ڈہرا بجاتے حاضر ہوتا ہے چرواہے پہاڑی مرغزاروں میں دور جنگلی ہرن سے ہم کلام ہو کر ہجر بدوش حسن یکتائی میں اضافہ کرتے ہیں۔کسان نلائی کے وقت ناگزیر محنت کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے اپنے مضبوط ہاتھ دھرتی کے نرم و نازک چھاتی پر پھیرے پھیرے نغمہ زن ہو کر علامہ اقبالؒ کے اس ارشاد کی تعمیل کرتا ہے ؎

حدی را تیز تر می خوان جو محمل را گراں بینی

نوار اتلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

بچہ پیدا ہو تو ممتا کا شفقت بھرا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔بچہ کے سہلانے یا بہلانے کی ضرورت پر بالکون کے گیت حاضر ہوئے۔کسی سیاسی رہنما کے استقبال کی گھڑی آئی تو عورتیں لوک فن کاروں کے روپ میں صف باندھے سوا گتی نغمے فضا میں بکھیر دیتی ہیں۔برقی رو دیہات کو بھی مہیا ہوئی تو عوامی گیت کار کہہ اُٹھا بجلی کے تار سے نہ چھیڑ ( اتھہٕ مولاگ بجلی تارے ) کشمیری لوک گیتوں کی

منفرد سحر آفرینی اور دِلر بائی کی بدولت ہی کشمیر پنڈت گھرانوں میں شادی کی تقاریب پر مسلم خواتین گیت گا گا کر مشترکہ تہذیب کی آبیاری کرتی ہیں۔

لوک گیتوں میں الفاظ کے برجستہ حُسنِ انتخاب ،سادگی ، جذبات نگاری وخیال آرائی کی فراوانی نہ سہی کارفرمائی ضرور ہے طوالت کے خوف سے صرف ایک گیت کی مثال پر اکتفا کرتا ہوں جو مسلمان خواتین رمضان المبارک کی مقدس شاموں کو عید کی اُمید میں اکثر صف باندھ کے جھوم جھوم کر گاتی ہیں۔

زٔون کھٔوے لوٗ پیٚیہِ مےَ ببرے          بأے واجتبن بأے واتن خبرے
یَس نہٕ کانہہ آسہِ سوچھےٚ نیران نظرے          زٔون کھٔوے لوٗ پیٚیہِ مےَ ببرے

وہ دیکھ
چاند نکلا
ریحان کے پودے پر شبنم نمُو دار ہوئی
او چاند!
آ اور بے کسوں کی خیریت پوٗچھ
دیکھ جن کے بھائی ہوتے ہیں
وہ اُن کی خیریت پوٗچھنے آتے ہیں
اور جن کے بھائی بندنہیں ہوتے
وہ دوٗر دوٗر تک راستے تکا کرتی ہیں
او چاند!
آ! اور بے کسوں کی خیریت پوٗچھ!

غرضیکہ جب تک انسان کے سینے میں دھڑکتا دِل ہے لوک گیتوں کا چمن رنگا رنگ سدا بہار پھولوں سے مہکتا رہیگا اور ہمارا دامن بھی ابدی مسرتوں سے کبھی خالی نہیں ہوگا۔

# کشمیر۔ اوُکانگ کی نظر میں

اسے ہماری خوش بختی ہی سمجھئے کہ کشمیر کی قدیم تاریخ کے مطالعہ کیلئے ہمیں مختلف صوُرتوں میں وافر مواد دستیاب ہے۔ یہاں کے اساطیری کردار قدیم تاریخی واقعات سے اس طرح جڑُے ہوئے ہیں کہ جیسے اُنکا الگ سے کوئی وجوُد ہی نہیں۔ وادیٔ کشمیر فطرت کی آغوش میں فلک بوس و برف پوش پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے جو اُسکی منفرد حیثیت کی ناقابل تسخیر دیوار بھی ہے۔ ممتاز یورپی تاریخ شناس ایم۔ اے سٹائن بھی اس بات کا معترف ہے کہ قدیم تاریخی مواد کے ضمن میں یہ خطۂ جنت نظیر بہت ہی مالدار ہے۔ چونکہ یہ بنیادی تاریخی تحریریں بیشتر سنسکرت میں دستیاب تھیں اس لئے جو بھی محققین باہر سے آئے اُنہوں نے مقامی تاریخی مواد کو کھنگالنے کی خاطر یہاں کے علماء اور فضلاء کی خدمات حاصل کیں تاکہ وہ کشمیر کی قدیم تہذیب کے خدوخال کو اُجاگر کرنے کی کوششوں میں کامیاب ہوسکیں۔ اس لئے جب ہم کسی بیرونی سیاح جو یہاں کبھی کبھار تہذیبی اور ثقافتی سفیر بن کر آئے، کا تذکرہ کریں، تو اُسکا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہمارا یہ قطعۂ ارضی مردُم خیز نہیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

بیرونی ممالک سے آئے ہوئے ثقافتی زائرین کے سفرنامے یہاں کی تاریخ کو سمجھنے کیلئے اگرچہ ان حالات میں بنیادی حیثیت نہیں رکھتے، لیکن ممد ضرور ہوسکتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ انسان اپنی تصویر دوسروں کی نظر میں دیکھنا فطرتاً پسند کرتا ہے۔ کشمیر اگلے وقتوں سے علم و آگہی کا گہوارہ رہا ہے اور اسی ناتے بودھ مت

کی نشر و اشاعت کا اہم مرکز بھی، یہی وجہ ہے کہ چینی سیاح، اؤکانگ، ہیون سانگ کے بعد گندھارا سے ۷۵۹ء میں وارِد کشمیر ہوا جب یہاں راجہ جیاپیڈا (۷۵۱-۷۸۲ء) کی فرمانروائی تھی۔ ایم۔اے سٹائن اور دیگر یورپی تاریخ شناسوں اور سیاحوں کی تحقیق کے مطابق کشمیر سے متعلق اوّلین حوالے، چینی دستاویزات میں ۵۴۱ء سے ملتے ہیں جو ایک ہندوستانی سفیر کے تذکرہ پر مبنی ہیں، جو ٹنگ خاندان کے دورِ حکومت میں چین پہنچا۔ ان دستاویزات میں جھیل ولر اور وتستا کا ذکر بھی ملتا ہے۔

اؤکانگ بارہ مولہ کے راستے ہی وارِد کشمیر ہوا اگرچہ وہ علمی تبحّر، قوتِ مشاہدہ، اور فکر و نظر میں ہیوُن سانگ مقابلہ نہیں کرسکتا پھر بھی اُس نے اس خطۂ ارضی کے بارے میں قابل قدر اطلاعات فراہم کی ہیں۔ اؤکانگ نے اپنی تہذیبی سفارت چالیس سال تک جاری رکھی اور پھر مختصراً اپنے مشاہدات کو واپسی پر ضبط تحریر میں لایا۔ وہ ۷۵۹ء سے ۷۶۳ تک، کشمیر میں رہا، کشمیر سے متعلق اُس کی اطلاعات و مشاہدات دوسرے ممالک کے مقابلہ میں بہت حد تک تفصیلی ہیں۔ اُسکے دورے کی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بودھ بھکشو کے رُوپ میں بودھ وہاروں کی زیارت کے ساتھ ساتھ سنسکرت مخطوطات کے مطالعہ میں مصروف رہا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ صبح سویرے سے رات گئے تک محوِ مطالعہ رہتا تھا، لیکن محنت شاقہ کے باوصف اُسے اُتنی زیادہ ادبی بالیدگی نصیب نہیں ہوئی۔ اس بات کا علم ہمیں اُسکے اَپہ بھرمش میں لکھے ہوئے اُس کی نظر میں اہم بودھ وہاروں کے ناموں سے ہوتا ہے اُن میں سے چار کا ذکر تو راج ترنگنی میں ملتا ہے، اور باقی دو دیہات کے ناموں کے صورت اجتماعی یاداشت میں آج بھی محفوظ ہیں۔

کرتی آشرم جس کے لغوی معنی جادوگرنی یا ساحرہ کی قرار گاہ ہے آج بھی کوہوم گاؤں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اؤکانگ اور کلہن دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں مہاراجہ اشوک کے بیٹے جلوک کی تعمیر کردہ عبادت گاہ موجود تھی۔ ایم۔ اے۔ سٹائن کے عینی مشاہدے کے مطابق ۱۸۹۶ء میں کتر ہوم کی دو مساجد کے گردونواح میں تراشے ہوئے پتھروں کے آثار موجود تھے۔ کتر ہوم بارہ مولہ سے دؤر دریائے جہلم (وتستا) کے بائیں کنارے پر آباد ہے۔

مونگتی وہار کا ذکر اؤکانگ نے سب سے پہلے کیا ہے۔ یہ وشکر بارہ مولہ کا وہی وہار ہے جو للتا دتیہ مکتا پیڈا (۶۹۹ء۔۷۳۵ء) نے مکتا وہار کے نام شے تعمیر کرایا اور جو مکتا سوامن وہار کے نام سے کلہن کی راج ترنگنی میں جگہ پا چکا ہے۔ یہ چینی سیاح بارہ مولہ کے راستے سے کشمیر آیا، اس لئے یہی وہار اُسکی اولین زیارت گاہ بھی ہے اور قیام گاہ بھی جسکی بناء پر اِس (وہار) کا سرفہرست ہونا فطری ہے۔ للتا دتیہ مکتا پیڈا کے نام سے پرہاسپورہ کے راجہ وہار کی تعمیر بھی منسوب کی جاتی ہے۔

راجہ میگھواہن کی چہیتی رانی امرتا پربھا نے بودھ بھکشوں کے لئے امرتا بھون وہار تعمیر کرایا۔ یہ استھاپن آج "وونتہ بھون" کی صورت اختیار کر چکا ہے جو امرتا بھون کا کشمیری رؤپ ہے۔ وونتہ بھون سرینگر کے شمال میں پانچ کلو میٹر دؤر وچارناگ کے قریب واقع ہے۔ یہاں آج بھی اس بودھ وہار کے آثار موجود ہیں۔ اؤکانگ نے اسکا چینی زبان میں نگو۔ می۔ تو۔ پو۔ ون (Ngo.Mi.To.Po.Wan) لکھا ہے۔

للتا دتیہ مکتا پیڈا (۶۹۹۔ ۷۳۵ء) کے ترک نژاد، وزیرِ اعلیٰ نے سرینگر میں دو عالیشان بودھ بھکشو چیاکن وہار تعمیر کرائے۔ اوکانگ نے چینی میں چیانگ کیُن (Tsiang Kiun) کے نام سے یاد کیا ہے۔ وثوق سے

کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اوکانگ کی نظر میں دو میں سے کونسا ایک جاذب نظر رہا ہوگا۔ البتہ آٹھویں صدی عیسوی میں ترک ۔ کشمیر تعلقات کی نشاندہی ہوتی ہے اس بات کی مزید تصدیق کلہن کی راج ترنگنی سے بھی ہوتی ہے تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ گندھارا پر حکمرانی کرنے والے یہ راجے تبت نژاد تھے۔ ممتاز عرب سیاح البیرونی نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔

ہیون سانگ کے بیان کے مطابق ساتویں صدی کی چوتھی دہائی میں اُسکی وادی کشمیر کی سیاحت کے وقت یہاں صرف ایک سو کے قریب بودھ بھکشو وہار موجود تھے، جبکہ اؤ کانگ (Ou.Kong) نے اُنکی تعداد تین سو سے زائد بتائی ہے۔ اسکے علاوہ، وہ ستوپوں اور مقدس مورتیوں کے مقامات کی بھاری تعداد میں موجودگی کا بھی معترف ہے۔ اس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ ان دو ثقافتی زائروں کی الگ الگ سیاحت کی درمیانی مُدت میں یہاں بدھ مت کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہوگا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ راجہ میگھواہن اور للتا دتیہ مکتا پیڈ انے بدھ مت کی نشرواشاعت کے لئے بہت کام کیا۔ جیسا کہ اس مضمون کے آغاز ہی میں بتایا جاچکا ہے کہ اوکانگ بڑی صراحت اور سچائی کے ساتھ وادی کشمیر کے جغرافیائی حالات کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ قدرتی طور چاروں اور سے فلک بوس پہاڑوں کی گود میں ہے جن کے درمیان میں سے صرف تین پہاڑی رستے ہیں۔

مشرق میں ایک رستہ تو 'فان (Tou.Fan) یا تبت کو جاتا ہے، شمال کی جانب سے ایک راستہ پولیو (Po.liu) یا بلتستان کا ہے، اور مغرب کی طرف سے ایک درہ کین ٹولو (Kien.to.lo) یا گندھارا کو کھلتا ہے صاف ظاہر ہے کہ پہلا درہ زوجی لا کا ہے۔ اس بات کا اعادہ کرنا یہاں بے محل نہیں ہوگا کہ لداخی زبان میں درہ کیلئے ''لا'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یعنی زوجی درہ،

دوسرا راستہ گلگت روڑ کا ہے، جو بالائی وادی کشن گنگا سے ہوتے ہوئے وادی سندھ کو جاتا ہے تیسرا درہ جو دگد گاٹھ کے نام سے موسوم تھا بارہ مولہ کا ہے جو وتستا کے کنارے سے ہوتے ہوئے مغرب کی طرف مڑتا ہے۔ ہیؤن سانگ اسی درّے یعنی باب البحر سے کشمیر میں داخل ہوا۔ وہ اسکا ذکر سنگی (سنگین) دروازہ کے نام سے کرتا ہے۔

یہی درنگ یا پہاڑی چوکیاں اگلے وقتوں سے اس قطعۂ ارضی کی پاسبانی کا کام دیتے آئے ہیں۔ اؤ کانگ کو چوتھے درّے کا بھی علم تھا، جو عیاں ہے وادی کے جنوب کے طرف درۂ بانہال یا پیر پنچال ہی ہوسکتا تھا، جو اُس وقت صرف شاہی لشکر کی خاطر کھلا رہتا تھا اور جو آج ہمارے لئے قومی شاہراہ کے ناتے شہ رگ کا درجہ رکھتا ہے۔

اوکانگ کی وادی کی سفارت کے دوران شاید سیاسی وجوہات کی بناء پر ان دروں سے آمد ورفت کو محدود رکھا گیا ہو۔

چین اور ہندوستان کی شمالی ریاستوں کے درمیان سیاسی رشتے اؤ کانگ کی سیاحت کے فوراًبعد ٹوٹ جاتے ہیں شاید اس لئے کہ تنگ خاندان کے قدم وسط ایشیا میں تبتیوں اور اوگروں کے مقابلہ میں لڑ کھڑا رہے تھے۔ اگلی دو صدیوں کے دوران میں بھی ثقافتی زیارت کا سلسلہ جاری رہا اور اسکی منزل کا تعیُن کرنے میں کشمیر کو اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اُمید ہے کہ انسانی تہذیب کے لین دین اور ارتقاء کا یہ مقدس ثقافتی رشتہ آئندہ بھی مثبت بنیادوں پر قائم رہیگا۔ باالخصوص جبکہ ہمارے ذہنی اور ارضی فاصلے سمٹ چکے ہوں ؎

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی !

(اقبالؒ)

# مثنوی تاریخ الانبیاءً

شاعری اظہار جذبات اور انسان کے اندرون کے ترجمان کی حیثیت سے اولین درجہ رکھنے اور مادری زبان ترسیل وابلاغ کا بہترین ذریعہ ہونے کے تعلق سے یہ کشمیری زبان وادب کی خوش بختی ہے کہ بجبہاڑ کی مردم خیز وعرفاں آباد قصبہ سے نسبت رکھنے والے جید عالم، خدا ترس بزرگ اور ممتاز سخن ور غلام مصطفٰی مصفا مرحوم مثنوی تاریخ الانبیاء کا سدابہار گلدستہ ہاتھ میں لئے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ کشمیری زبان کا سرمایہ افتخار ہے اور اس کے بولنے والوں کیلئے باعث توقیر بھی کہ اسے عرفان وآگہی کا یہ بحر ذخار نصیب ہوا۔ چودھویں صدی میں کشمیر میں اشاعت اسلام کا بنیادی کارنامہ حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین نورانیؒ عرف نند ریشی جنہیں بجا طور علمدار کشمیر کے نام سے ہم یاد کرتے ہیں، ہی نے انجام دیا۔ کیونکہ ایران نژاد اور اسلامی مبلغین کی زبان فارسی اور عربی تھی نہ کہ کشمیری۔ اس لئے تبلیغ دین عرفان کا مؤثر ترین وسیلہ کشمیری زبان ہی تھی جسے علمدار کشمیرؒ نے بروئے کار لاکر ایک نہایت ہی اہم تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کے تبلیغی مشن کو حضرت شیخ العالمؒ ہی نے آگے بڑھا کر علامہ اقبالؒ کے ان ارشادات کو عملی روپ دیا۔

خطہ را آن شاہ دریا آستین — داد علم وصنعت وتہذیب ودین
آفرید آں مرد ایران صغیر — با ہنر ہائے غریب و دلپذیر

جہاں حضرت شیخ العالمؒ قدیم کشمیری تہذیب کے مینار نور کی حیثیت رکھتے ہیں وہاں حضرت مولانا غلام مصطفیٰ مصفا اُن ممتاز شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے بیسوی صدی کے انقلاب آفرین اور پُر آشوب دور میں انبیائے کرام کی حیات مقدسہ کو اپنی فنی کاوشوں کا محور اول بنا کر نہ صرف کشمیری مثنوی بلکہ کشمیری زبان وادب کی معنویت کو دوبالا کردیا۔ بالخصوص جب کہنے کو تو کشمیری زبان کے بہت سے سرپرست ہیں لیکن حقیقی معنوں میں کشمیری میں مصلحتاً لکھتے ہیں، اور جبکہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مثنوی کی مقبول صنف کا مستقبل مخدوش لفظر آرہا تھا۔تو مصفا نے اسے ابدیت کی ضمانت بخشی اور صلہ وستائش سے بے پروا، بحرسخن میں غوطہ زنی کر کے فن کے موتی بہادئے۔ابھی شرح وبسط کے ساتھ اس معرکہ الآرا تصنیف کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ابھی تک تو صرف اس کی تین ہی مختصر جلدیں شائع ہوچکی ہیں جن کے اشعار کی زیادہ سے زیادہ تعداد آٹھ ہزار کے قریب ہے جبکہ اسکے مؤلف بشیر نحوی کے بیان کے مطابق یہ منفرد اسلوب وموضوع کی مثنوی پینتیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے کہا جاسکتا ہے کہ یہ مثنوی عربی فارسی تراکیب تلمیحات ولفظیات سے پُر ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے ایسا ہونا ناگزیر لگتا ہے پھر بھی کشمیری الفاظ کی تراکیب اور چست بندشیں قابل داد ہیں۔مولانا مصفا کو عربی، فارسی اور کشمیری تینوں زبانوں پر اتنی دسترس حاصل تھی کہ اتنی طویل مثنوی میں عالمانہ انداز بیان کی شگفتگی اور روانی میں کوئی فرق نہیں آتا اور فنی ایجاز واعجاز بھی قائم رہتا ہے۔جیسے

ترجمہ:-

| | |
|---|---|
| خاکہٕ ہے منز سہ جلوٕ یامتھ ژاو | خاکداں میں جب وہ جلوہ فگن ہوا |
| چاک دِتھ پاک، خصلتھا نوٗن دراو | پردہ چاک کرکے ایک پاک خصلت ظاہر ہوا |
| صوٗرتھا تس دِژن بصد تکریم | اُسے بصد تکریم صوٗرت بخشی |
| پر بقرآن ژٕ احسن التقویم | تو قرآن کی آیۃ احسن التقویم پڑھ |
| جلوٕ یے بارگاہ رحمانی | بارگاہ رحمانی کا نوٗر |
| ژاو درکار گاہِ انسانی | کارگاہ انسانی میں داخل ہوا |
| دوستو وارٕ وُچھ بہ چشم یقیں | اے رفیق یقین کی آنکھ سے اچھی طرح دیکھ |
| مظہر حق چھُ آسمان وزمین | آسمان وزمین مظہرِ حق ہیں |
| بلکہ انسان چھُ سرِ قرآنی | بلکہ انسان بھی سرِ قرآنی ہے |
| اکھ گراہ قدرتُک چھُ پنہانی | قدرت کا ایک پُر اسرار گھر ہے |
| تھرٕ تھرٕ تارکن چھ در افلاک | آسمان میں تارے کانپ رہے ہیں |
| ولتہٕ مایوٗت یہ خاکیٔ بے باک | کہیں یہ مشتِ خاک بیباک افلاک کو چھونہ لے |
| عالمس منز یہ نوکتہٕ گو اظہار | دُنیا میں یہ راز فاش ہوا |
| ابن آدم چھُ مخزن اسرار | کہ ابن آدم مخزن اسرار ہے |
| انبیا یم چھ کُلھم بہ شمار | جملہ انبیاءؑ جنکی کل تعداد ایک لاکھ |
| یک لک وبست وچہار ہزار | چوبیس ہزار ہے، وہ بھی جنسِ آدمیت سے |
| تم تہِ از جنس آدمیت دراے | پھوٹے اور ارشادِ ربانی سے امتوں |
| رٕپہٕ سندِ حُکمہٕ اُمتن کُن آے | کی جانب مبعوث ہوئے |

☆ (حمد باری تعالیٰ، حصہ اول)

| | |
|---|---|
| مہر تھنڈُے نوید خُلدِ نعیم | اللہ کا مہر خلد نعیم کی نوید ہے |

| | |
|---|---|
| قہر ہُنڈے چھُ مثلِ نارِ جہیم | اُسکا قہر مثل نارِ جہیم ہے |
| سۆز ذاتن سُہ رحمتُک دریا | ذات پاک نے اُسے رحمت کا دریا بنا کر بھیجا |
| کیا چھُ نارِ جہنُک پروا | نارِ جہنم کی پروا |
| آبہٕ یم بر ہدایت و ایمان | وہ ایمان وہدایت پر آئے |
| بایہٕ بڈٕ تم بنے یہٕ اھلِ امان | وہ بلند پایہ اہلِ اماں بنے |

## (نعت سرور کائنات)

| | |
|---|---|
| شبہٕ اکہٕ شاہِ کشورِ لولاک | ایک رات کو شاہِ کشور لولاک |
| گیئے خراماں بہ کنگرِ افلاک | آسمانوں کی بلندیوں کو سرافراز کرنے کو خراماں نکلے |
| نۆرہٕ بۆرتئے چو ماہِ تاباں دژاو | وہ پیکر نور ماہِ کامل کی مانند نکلا |
| گاہ نزۆون تہٕ تیز گۆو زن واو | منور کرتے ہوئے تیز ہوا کی طرح چلے |
| ازخدائس روا سپنۍ حاجات | اللہ کی جانب اُنکے حاجات روا ہوئے |
| بہرِ اُمت اُنن براتِ نجات | اُمت کیلئے نجات کی برات لیکر آئے |
| ساریٕ سے عالمس چھِ تازٕ نوید | سارے عالم کے لئے تازہ نوید ہے |
| اے مصفا ژٕ تھاو سوے اُمید | اے مصفا توہی اُمید رکھ |

## (صفت معراج سرور کائنات)

کون باذوق اور سخن شناس ایسے انداز بیان کو غیر مانوس قرار دے سکتا ہاں ٹھیٹھ کشمیری الفاظ وتراکیب کا فنکارانہ استعمال بھی قابل توجہ ہے سبب مثنوی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| وجہ تالیفہٕ کۆرس مجبۆر | وجہ تالیف نے مجھے مجبور کردیا |
| حسبہٕ دستور پو ونن مے ضرۆر | حسب دستور مجھے ضرور کہنا پڑا |
| لۆکُ اوسس مے ابتداٗ سے آم | میں چھوٹا تھا اور یہ میرے لیے ایک |

شفقتِ مادری مےٚ روُدم یام
ظلِ پدری مےٚ تاج سراوُسم
دل توے کِنہٕ مےٚ بے خطر اوُسم
اکھ دوہا گوُنتھ بہٕ مدرسہٕ دژاس
بازرس کُن بہٕ کامہِ باپتھ آس
بازرس منز دکاندار اوس
مثنوی خواں سُہ ہوشیار اوس
اتفاقن وُچھم ہراں تس اشک
قصص الانبیا پراں لبِ خشک۔

بڑی آزمایش تھی جب میں شفقت مادری سے محروم ہوا اور پدری شفقت کا تاج میرے سر پر تھا میرا دل اس لیے وسوسوں نے عاری تھا ایک دن میں مدرسے سے واپس لوٹ رہا تھا اور کسی کام سے بازار کیطرف چل پڑا جہاں ایک دکاندار تھا جو مثنوی خوانی میں ہشیار تھا۔ اتفاقاً اُسکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور قصص الانبیاء پڑھتے پڑھتے اُس کے ہونٹ خشک ہورہے تھے۔

نثر پاٹھی پران سُہ پاک نہاد
حاضرن کُن وناں تمیک روداد
پرٕ عالم دقائقات نکات
کاشرین ٹاٹھی کاشرِ ابیات
واقفا اکھ تتین تمی ہوُکھ
نوٚن اشارہ تمی یہ ظون پوُکھ
رلیہِ اندری گیم لوُگس واوس
لایہِ کتھہِ پاٹھی ووٹھ بہٕ دریاوس
جمعہ کٕے دوہ یہ اوس بابرکت
آیہِ اتھ وتھ مےٚ پادٕ گےٚ ہمتھ
چھم وٕنی مُرسلن ہندی حالات

وہ پاک طینت، نثر میں خود پڑھکے حاضرین کو اُسکی رُوداد سناتا تھا ایک عالم خود قصص اور اور دقت آمیز واقعات سے محظوظ ہوسکتا ہے لیکن کشمیری کو کشمیری ابیات پسند ہیں۔ میرا ایک آشنا وہیں بیٹھا تھا جس نے اس کام کے لیے میری جانب واضح اشارہ کیا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ میں اس سمندر میں کیسے کود جاؤں۔ یہ جمعہ کا مبارک دِن تھا اور میں اس کام میں ہمہ تن جُٹ گیا

خلاصہٕ حالاتِ فخرِ موجوٗدات
یوٚدوچھُ مشکل مےٚ پٮ۪ٹھ ولے آسان
دِیو پانٔنے کرِبم مےٚ حق سُبحان
شارٕ سوٚمبرن چھےٚ سخت تر بر جان
موختہٕ ژوبٮ۪ن بسو زنِ مژگان
عذر خواہی کرن بہٕ چھس یارن
اہل علمن تہٕ بیٚیہٕ قلمکارن

مجھے مرسلین کے حالات لکھنے ہیں بالخصوص فخر موجودات کے۔ کام تو مشکل ہے لیکن مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کام آسان کریگا۔ شعری کاوشیں جان پر بھاری ہیں جیسے پلکوں سے موتی چھیدنا اس لیے میں اپنے احباب اور اہل علم وقلمکار حضرات سے معذرت خواہ ہوں۔

"آمد آدم" کے باب میں خلقتِ آدم کے بنیادی نکات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تغیّر پذیر زندگی کے رخ سے بھی یوں پردہ اُٹھاتے ہیں کہ جیسے ہمارے ہی احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

زندگی اکھ لباس یٮ۪لہٕ گوٚو تنگ
نوٚو پوشاکہ وۄلُن لوٚبُن نوٚو رنگ
حُسنِ فطرت چھ انقلاب پسند
چھس تغیر بہٕ ہر زمان پیوند
نوعِ انسان دریں سرایے فنا
میں رنج والم اور جہد وبقا

زندگی کا جب ایک لباس تنگ ہوا فطرت تو اُس نے اپنے لئے ایک نیا لباس چُن لیا۔ حسنُ انقلاب پسند ہے اور تغیر پذیر بھی۔ ہر زمانے میں انسان اس فانی سرائے میں غم والم اور جہد وبقا کے لیے بھیجا گیا ہے۔

مشیت ایزدی فرشتوں کو تخلیق آدم کا مژدہ سُناتی ہے تو فرشتے عرض کرتے ہیں۔

سر بُتراٗژ پٮ۪ٹھ شر انگیزی
کرِ برپا فساد وخوں ریزی
خوٗن ناحق سُہ ہارِ بر سرِ خاک

وہ یعنے آدم روئے زمین پر فتنہ وفساد اور خونریزی برپا کریگا خون ناحق زمین پر بہائیگا

| | |
|---|---|
| پاک اُستھ بناوِ تتھ ناپاک | اور پاک کو ناپاک بنائیگا |
| سُے گوھیا پاۓ یمی ہندی اولاد | کیا اُسی کو پیدا کیا جائیگا |
| درزمین ہوٗل گنڈن بہ فسق وفساد | جسکی اولاد فسق وفساد پر کمربستہ رہا کریگی |

پیدائش حوا سے پہلے آدم کی تنہائی کا یوں نقشہ کھینچتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| گو یتھے پاٹھی تس زمانا پوٗر | اسی طرح بہت زمانہ بیت گیا۔ |
| اوس بے جفت از زمیں مہجور | وہ زمین سے دوٗر اکیلا تھا |
| جنتن پھیوٗر ہر طرف تنہا | اُس نے جنتوں کی تنہا خوب سیر کی |
| کانہہ تہِ ڈیوٗٹھن نہٕ پانسے ہمتا | لیکن اُسے اپنا جوڑا نہ ملا۔ |
| گوس محسوٗس درد تنہاییٔ | اُسے تنہائی کا کرب محسوس ہوا اور |
| پیوس دشوار سوز یکتاییٔ | سوز یکتائی اُس کیلئے دشوار ثابت ہوا۔ |

| | |
|---|---|
| پاۓ پانس پتھ بنو ظالم | اپنی ہی ذات پر ظلم کیا جس نے راہ عشق |
| سرِ یُس عشق روز کر سالم | اختیار کیا وہ کب سلامت رہ سکتا ہے |
| یارٕ ژو تُہی سلامتک بستر | یا سلامتی واستراحت اختیار کرو |
| نتہٕ برسر ملامتک خنجر | یا اپنے سر پر ملامت کا خنجر لے لو |
| عقلہِ ہنز کام گیہ تن آسانی | عقل کا کام تن آسانی ہے اور عشق |
| عشق گوٗ روٗحہٕ چھِ نگہبانی | روٗح کی نگہبانی کرتا ہے |
| عاشقن چھا قرار در جنت | عاشق جنت میں نہیں ٹک سکتے اور |
| چھا طلب گارِ راحت وفرحت[1] | وہ طلبگار راحت وفرحت نہیں ہو سکتے |

[1] علامہ اقبالؒ نے اسی خیال کو یوں باندھا ہے۔لگتا ہے مصفا نے اس استفادہ کیا ہے

دل عاشقاں بہ میرد بہ بہشت جاودانے     نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

از حرم خانۂ سلامت دژاو — وہ سلامتی کے حرم خانہ سے نکل کر
سوے کاشانۂ ملامت آو — کاشانہ ملامت (دنیا) کی طرف آیا۔
عاشقن نش چھُ باغِ جنت تنگ — عاشقوں کیلئے جنت کا باغ تنگ ہے
نیکنٲمی چھےٚ عشقہِ ہِے نشہِ ننگ — نیک نامی عشق میں باعث ننگ ہے

قابیل کے ہاتھوں اپنے ہابیل کے قتل کے سماں کو سادہ وسلیس کشمیری میں اس انداز سے باندھا ہے۔

آو قابیل ہتھ کٔنیاہ بشتاب — قابیل جلدی جلدی ہاتھ میں پتھر اُٹھا کر آیا
اوس ہابیل بے خبر در خواب — جب ہابیل نیند میں مست تھا اُس نے زور
سنگ دِلنہٕ سوٗ کٔنۍ دِژن دٲرتھ — سے اُس پر سنگدل ہو کر پتھر دے مارا اور
بے گناہ بوے تمۍ ژھٔنِن مٲرتھ — بے گناہ اپنے بھائی کو مارا ڈالا
خوٗنِ انسان گوڈ نتھے تمۍ ہور — اُس نے پہلے پہل انسان کا خوٗن بہایا
بارِتس کھوٚت عذابہٕ کُے گوٗب بور — اور عذاب کا بھاری بوجھ اُسکے سر پر آن پڑا

قتلہِ کُے رسم در جہاں تمۍ لوگ — قتل کی رسم اُسی کے ہاتھوں چلی
چھُس توے، کٔنۍ عذابہٕ کُے زیٹھ بوگ — اس لئے اُس کے مقدر میں
دوٚپنہٕ افسوس پیٚوم ووٗنۍ تاون — اولین عتاب وعذاب ہے
بٲے ہٕنز لاش کتھ شیے تھاون — اُس نے کہا افسوس کہ میں کس مصیبت میں
تام تس آو در نظر اکھ کاو — گرفتار ہوا بھائی کی نعش کو کہاں چھپاؤں
موردٕ اکھ کاو ہتھ کوٗرُن ٹھہراو — اتنے میں اُسکی نظر ایک کوے پر پڑی جسکی
مؤدمُت کاو تونتہِ ستی رٔٹتھ — چونچ میں مردہ کوا تھا جس کو اُس نے
نیوٗن تھووُن بزیرِ خاک کھٔٹتھ — زیر زمین چھپا دیا۔ اسطرح اُسے سبق

پیٔہِ یی مصلحت ثمس درظون — مل گیا اور اُس نے اپنے
بہر بابیل ثمی تہِ کھوؔن مدفن — بھائی ہابیل کو اسی طرح دفن کردیا

تاریخ الانبیاء کی دوسری جلد جو تین پیغمبروں حضرت صالح، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی زندگی اور کارناموں کا احاطہ کئے ہوئے ہے ان دل نشین اشعار سے شروع ہوتی ہے۔

عاشقو پأدِ کر دِلس منز سوز — اے عاشق دِل میں سوز دروں
پاکبازن ہنزے سوانح بوز — پیدا کر اور پاکبازوں کی زندگیوں
درفضایے بسیط کر پرواز — کے حالات سُن۔ فضائے بسیطِ میں
اَد واتکھ بہ آشیانٔے راز — پرواز کر جبھی تو ممکن ہے تو آشیانۂ
چھُم نہ فرضی فسانہٕ سومبراوُن — راز تک پہنچ پائے۔ مجھے فرضی افسانہ
بلکہ چھُم وحی آسمان باوُن — تراشنا نہیں بلکہ آسمانی وحی سنانا ہے

زیرِ نظر جلد کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ اس میں زبان کی سلاست وسادگی اور انداز بیان کی روانی میں قابل توجہ نکھار آیا ہے، جس سے اس کی اثر انگیزی میں خوشگوار شدت آئی ہے، روزمرہ سے یہ خوش آیند قربت حضرت مصفا کے خلاق ذہن کی غمازی کرتی ہے۔

بُلبُلو کرتہٕ ووٚنی خوش الحانی — اے بُلبل اب تو خوش الحانی سے نغمہ سنج ہو
درگلستان دفتر ثانی — گلستان کے دوسرے دفتر میں جو رضا کے
دژاو یُس ہوٚل گنڈِتھ براہ رضا — راستے پر چل نکلا وہ سِپر کی مانند قضا
روٗد مثل سِپر بہ تیر قضا — کے تیر کی زد پر رہا۔ جب اُس نے
ییٚلہِ ثمی شرکہٕ کی عناصر گألی — شرک کے عناصر مٹادئے تو خلعت
تزٲوی ہس خلعت خلیلیؑ نٲلی — ہائے خلیلیؑ سے اُسے نواز گیا

ووت اصلس سۄ وَصلہٕ چے ویرے
دۄ پن یارب ژٕ چھکھ مے واقف حال
دینہٕ کیو دُشمنو کوٚرس پامال
حال معلوم چھے مے کیا چھُ وَنُن
جسم وجاں چون چھم مے کیا چھُ پَنُن
یاد چونٔے مے چھم دِلس منز پۄر
چانٔی مرضی یہ آسہِ چھم منظور
یہ چھُ لولُک تہٕ ہمتک نوٚو رنگ
ناگہاں گلخن سپن گلشن
پھٲلی چمن زار تتھ چو باغِ عدن

وہ اصل سے واصل ہوا اور عشق کی سیڑھی سے قرب ذات سے سرفراز ہوا۔ اُس نے کہا اے خدا تو میرا حال جانتا ہے۔ مجھے دین دشمنوں نے پامال کردیا۔ تجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کچھ کہنا ہے۔ تیری یاد میرے دِل میں جاگزیں ہے جو تمہاری مرضی ہے مجھے وہ منظور ہے یہ محبت اور ہمت کا نیا رنگ ہے یہ عشق اور عقل کی جنگ ہے۔ اتفاقاً آگ گلعذار میں تبدیل ہوئی اور اُس میں باغ عدان کی طرح پھول ہی پھول کھل اُٹھے۔

دَزٕ وُن نار گوٚو بَنتھ گلزار
رنگہٕ رنگہٕ پوش تتھ سپٕنٕ اظہار
بہ رضائے خدا دِژن ییلہِ تن
فتحمندی عصائٕرس ذاتن

جلتی آگ گلزار میں تبدیل ہوئی اور قسم قسم کے پھول کِھل اُٹھے۔ رضائے مولا کیلئے جب وہ (حضرت ابراہیم) آگے آیا تو اللہ نے اُسے فتح ونصرت سے سرفراز کیا

مثنوی تاریخ الانبیاء کی تیسری جلد جو حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ حیات مقدسہ اور کارناموں کے ۔ لئے وقف ہے کی شروعات تقاضائے عرفاں ہستی سے ہی شروع ہوتی ہے۔

ساقیو پیش کرتہٕ ساغرِ سیم
اے ساقی ساغرِ سیم دے جسمیں

| | |
|---|---|
| آسہِ یُس پُرز شربتِ تسنیم | شربت نسیم لبالب بھری ہو۔ |
| نوش کُری تھے سُہ پیالہ مستی | مستی کا یعنی معرفت کا وہ جام |
| ہوشدأری بلہم مے در ہستی | پی کے مجھے دُنیا میں ہوشداری |
| ہنگہِ منگن مے پھیر حبس مبنگن | نصیب ہو۔ میرا دماغ تازہ ہوگا |
| چھس دِبنگن بہ ترو مُت بنگن | میں نے داروئے بے ہوشی |
| فکر تارے بہ پردۂ تنہا | سے حواس کھودئے ہیں۔ میں پردۂ |
| ذکرِ احوال حضرتِ موسیٰؑ | تنہائی میں حضرت موسیٰؑ کے احوال سناؤں گا۔ |

غور سے دیکھا جائے تو انسانی تاریخ کے کلیدی کردار اور حقیقی معمار انبیاء و رُسل ہیں جنھوں نے تاریک ادوار میں حق وصداقت کی قندیلیں روشن کیں، انسانی وحدت کو برقرار رکھا، توحید الٰہی کا پیغام مشیت ایزدی کی تعمیل میں لوگوں تک پہنچایا۔ حق و باطل کی جنگ میں وہ بے سلح و بے زرہ لڑتے رہے اور بالآخر کامیاب و کامران ہوکر سربلند رہے۔ یہی وہ خاموش انقلابات ہیں جن سے انسان تاریخ کے روشن ترین باب رقم ہوئے۔ انہی اللہ کے پیاروں اور نور کے روشن ترین میناروں میں حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ بھی شامل ہیں جن پر اللہ نے توارۃ نازل فرمائی اور جن کے صاحب کتاب وصاحب الہام ہونیکی تصدیق قرآن کریم نے بھی کی ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے بادشاہ اور قانون الٰہی کے منکر فرعون کے ساتھ بہر طور نبرد آزمار ہے یہاںتک کہ نافرمان اپنی گمراہ قوم سمیت غرقِ رُو ذلیل ہوا اور اُنہیں (موسیٰ کلیم اللہ) کو فتح و نصرت نصیب ہوئی۔ اُنکی قوم اللہ کے فضل و کرم کے لئے منتخب قرار پائی۔ موسیٰ کلیم اللہؑ کے ہاتھوں فرعون کا زوال شدنی تھا۔ حضرت موسیٰؑ کی ولادت فرعون کی شقاوت ونخوت کے لئے پیام اجل تھی۔ مولانا مصفا نے اپنے دلپذیر پیرایہ میں ان حقائق کو یوں نظم کیا

ہے۔

کز یوٗتھ فرعون ہے وُچھن اکھ خواب
بیوٗتھ سُے خواب ڈیشتھے تس داب
خواہسے منز تمس وٗنکھ یہ خبر
نیر شخصاہ زِ گُنج غیب نبر
یک قلم نیرِ نوٗن زِ مُلک عدم
چون جاہ وحشم کری برہم
خارٕ ہیتھ دوٗد تمس جگر نارٕ
وارٕ وٗن نکھ کُرِو امیک چارہ
تم لگس دَپنہ وَنتہٕ ژٕے تدبیر
کیا کرو چارٕ کیا کُرو تزویر
رٕژ کرو حکمرٲنیا تژھ ہش
مرد تھاووکھ بیوٗن زنانن نش
وُچھتہٕ تدبیر کیا کران چھِ شریر
بے خبر از دقایق تقدیر
پاک عمران دراں شب مذکور
اوس فرعون ہے نشے بجضور
ظون تھند گوٗو نہٕ شاہ نادانس
دپنہ یِی لوٗگ سہٕ پاک عمرانس
چھکھ ژٕ میأنس گرس اندر قائم
چُھے نہ امشب نبر نبرُن لازم

فرعون نے ایک بھیانک خواب دیکھا جس سے وہ بہت ہی خوفزدہ ہوگیا خواب میں اُسے یہ خبر سُنائی گئی کہ ایک شخص پردہ غیب سے نکلے گا جو تمہارے جاہ وحشم کو تتر بتر کریگا اس خبر کی آگ سے وہ اندر ہی اندر جلنے لگا اور اپنے مصاحبوں سے اسکا کوئی چارہ کرنے کو کہا۔وہ بھی حیران وپریشان رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اچھی حکمرانی کا تقاضا یہ ہوگا کہ مردوں کو عورتوں سے یعنی شوہروں کو بیویوں سے الگ ہی رکھا جائے۔تقدیر کی نیرنگیوں سے بے خبر لوگ دیکھئے کیا تدبیریں کرتے ہیں۔پاک طینت عمران جو فرعون گھر میں ہی مسلسل رہا کرتا تھا کی جانب ۔ اُنکا خیال نہ گیا۔
اسکے باوجود کہ اُسے رات گئے گھر سے نہ نکلنے کو کہا گیا تھا وہ چپ کے سے شاہی محل سے نکل کر اپنے گھر میں

دژاو عمراں تیتھے میان مکان — اپنی بیوی کے ساتھ تنہائی میں شب
جامہ سان شوٗ نگ سُے بجایے نہان — گزار ہی کرآیا۔

ظاہر ہے کہ مثنوی تاریخ الانبیا میں ایجاز واختصار کی گنجائش بہت حد تک موجود ہے لیکن اتنی طویل مثنوی ایک ہی رواں دواں بحر ''بحر رمل مسدس مجنوں مقطوع'' (فاعلاتُن ، فعلاتُن ، فعلُن ) میں منظوم کرنا بذات خود ایک کارنامہ ہے۔ اُمید ہے کہ ان کے پوتے ڈاکٹر بشیر نحوی کم سے کم وقت میں کم سے کم جلدوں میں اسے ہدیہ ناظرین کریں گے تاکہ اس بے مثال ادبی کارنامے کو وحدت تاثر کے ساتھ بجا طور تحسین وتوقیر بھی ہو سکے اور کشمیری زبان وادب کو یہ سر بلندی نصیب ہو کیونکہ

ہست قرآں حال ہائے انبیاء
ماہیانِ بحرِ پاکِ کبریا

گزشتہ دس سال کے دوران عزیزی ڈاکٹر بشیر نحوی نے اپنے دادا مولانا مصفا کی کشمیر مثنوی ''تاریخ الانبیاء'' کی تین جلدوں کے علاوہ اُن کی نعتوں کا مجموعہ ''گلشن مصفا'' کے نام سے شائع کر کے بڑی گرانقدر ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ نعت گوئی عاشقان رسولؐ کی محبوب ومرغوب ریاضت رہی ہے۔ زیر نظر نعت کے مجموعہ میں مولانا مصفا کی عربی ، فارسی اور کشمیری نعتیں شامل ہیں جو بلا شبہ اُن کے والہانہ عشقِ رسولؐ کی مظہر بھی ہیں اور عاشقانِ رسولؐ کے لئے ارمغان دوام بھی۔

اکہِ نظرِ دون جہانن بدلوو تیٚمی مقدر
وچھمُت چھُ کر زمانن تیتھ شانہٕ بوڈ پیمبر

ترجمہ:۔ جس کی ایک ہی نظر سے دونوں جہاں کا مقدر بدل گیا

"زمانے نے ایسا دوسرا ذیشان اور عالی مرتبہ پیغمبرؐ دیکھا ہی نہیں"

دِل بنامِ محمد عربیؐ      جاں بکام محمد عربیؐ
حق بشانِ محمد عربیؐ      نعت خوانِ محمد عربیؐ
کُنم آرزو از خدائے محمدؐ      کہ باشم نثارِ و فدائے محمدؐ
محمدؐ جامع رحمت      محمدؐ شافع اُمت

جہانس کأس گٹہ چاٗنی جمالن یارسول اللہؐ      اے اللہ کے رسول آپکے حُسن
زمانس نٗوردیُت چاٗنی کمالن یارسول اللہؐ      وجمال سے دنیا کا اندھیرا دور ہوگیا
اور اُنکے کمال سے سارازمانہ منور ہوگیا

گدأیی چانہ دربارچ یموگر      اور جن لوگوں نے اُنکے دربار کی کاسہ
تموئب حُکمرأنی آغہ میانے      گدائی کی اُنہیں بڑی بادشاہی
نصیب ہوئی میرے آقا!

مولانا مصفا کو بقول علامہ اقبال بخوبی معلوم ہے کہ

ہر کہ عشقِ مصطفیؐ سامانِ اوست
بحروبر در گوشۂ دامانِ اوست

☆☆☆

# کشمیر کے میلے اور تیوہار

انسان اس محیر العقول کائنات کی ذی شعور اور دیو پیکر اکائی ہے۔ جو اپنے جبلی تقاضوں کے پیش نظر تصورات و تخیلات کی دُنیا آباد کرتا آیا ہے۔ تا کہ ذوقِ جمال کی کما حقہ تشفی بھی ہو سکے اور عادات و اطوار کا جواز بھی ملے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ انسانی تہذیب لاکھوں سال پرانی ہے۔ نبی نوع انسان جبلی تقاضوں کے مطابق مادی دُنیا بدلتا رہا اور خود بھی تبدیل ہوتا گیا۔ دور وحشت سے دور مدنیت و تہذیب حاضر سے ہم کنار ہوتے ہوتے اُسے کئی انقلابات سے گُزرنا پڑا۔ کائنات اپنی بوقلموں فروانی کے باوصف ابن آدم کے لئے ابتلائے مسلسل ہے۔ انسانی سماج میں پوجا اور عبادت کی ابتداء فطرت کی حقیر سے حقیر شے سے شروع ہوئی اور وسیع تر و عظیم تر حقیقت پر ختم ہوئی۔ اس میں کیڑے مکوڑے نخل و شجر، شمس و قمر، بحر و بر، آب و آتش، خاک و باد، اور دشت و جبل سبھی شامل ہیں۔ چنانچہ فطرت کی مخفی قوتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انسانی جان کی قربانی کو جائز سمجھا گیا۔ یہ سلسلہ کمتر ہی سہی کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے۔ حیرت انگیز دیو مالائی اور مابعد طبعیاتی دنیا انسان کی بے پناہ قوتِ تخلیل اور قوت واہمہ کی دین ہے، جسکی کرشمہ سازیوں سے اس دنیا کا بھرم قائم و دائم ہے۔ جہاں عقل کا بس نہ چلا اور شعور کے براق پر جلے وہاں کا

عشق کا بے نام و دوام جذبہ کام آیا اور قلب و نظر کی تسکین کا سامان کسی حد تک بہم ہوا۔ قبیلہ کا سردار دیوتا کہلایا۔ انسان رفتہ رفتہ خانہ بدوش اور وحشی زندگی سے خاندانی قبیلہ داری ادوار سے گزر کر مربوط اور منظّم سماج کا حصہ بنا۔ تسخیر فطرت کے ساتھ ساتھ اندازِ فکر بھی بدلا، انسانی رشتے و سماجی قدریں بھی بدلیں لیکن بُنیادی، اور باطنی دُنیا کی جبلی ضرورتیں متوازن و غیر متوازن ہوئیں لیکن بدلی یا ختم نہیں ہوئیں۔ خیر و شر کے تصورات و عقاید کو علامتوں کا روپ دیا گیا۔ کہیں ترموتی یا نظریہ تثلیث وجود میں آیا تو کہیں ہندوستان میں شیو شکتی پر مبنی فطرت یا کُل جبلی فلسفہ متشکل ہوا جسمیں ان گنت دیوی، دیوتا محیط کُل کے جباری قہاری، رحمانی و غفاری و دیگر اوصاف سے متصف ہیں۔ یہ نظریہ آواگون کے چکر سے گذر کر عقیدۂ وحدت الوجود سے جاملتا ہے جو کثرت عبودیت اور بت پرستی کا منطقی نتیجہ ہے۔ مہاتما بدھ (۴۸۳_۵۶۳ ق م) مکتی پاتے پاتے خدا کے بارے میں خاموش ہوئے اور اس دنیا کو دار المحن قرار دے کر عدم تشدد کی تعلیم دیکر چل دئے لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہی اوتار گردانے گئے اور اُسی کو پوجا جانے لگا۔ چھٹی صدی عیسوی میں تثلیث، ثنویت و تعدد ذاتِ کل کے سبھی نظریات پر ضربِ کاری لگی جب اسلام کے کا نزول ہوا اور حضرت محمدؐ توحید کا پیغام لیکر آئے۔

وادی کشمیر جسے جنت ارضی کہا گیا ہے رشیوں اور منیوں کا مرکز رہی ہے، برصغیر ہند میں کشمیریوں کی ذہانت و فطانت کی وجہ سے نہ صرف شیومت کو منفرد حیثیت حاصل رہی، بلکہ وادئ مینو نظیر بدھ مت کا بھی گہوارہ رہی ہے۔ یہیں پر بدھ مت کے مہایان فرقے کو فلسفے تشکیل دیا گیا۔ اسلام بھی موافق و مخصوص حالات میں چودھویں صدی عیسوی میں ایرانی سادات مُبلّغین کے مبارک

ہاتھوں اشاعت پذیر ہوا۔

آریاؤں کے آنے سے پہلے یہاں ناگ اور پشاچ بھی آباد تھے جن کے فکری انداز ،طرز معاشرت اور مذہبی زندگی سے متعلق اشارات پورانوں میں ملتے ہیں جو ہمارے عہد رفتہ کے ثقافتی وتہذیبی ورثہ کے قدیم ترین واہم ترین ماخذ ہیں ۔ایک بات اور کہ روایات خواہ وہ مذہبی ہوں یا معاشرتی ،اتنی مضبوط اور غیر متزلزل ہوتی ہیں کہ نئی تہذیبوں کی ترویج واشاعت کے باوجود جاری وساری رہتی ہیں کیونکہ ان کے ساتھ بنی نوع انسان کا نفسیاتی تہذیبی ،تاریخی اور اجتماعی لاشعوری رشتہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ جدید تر تہذیبوں کے حاوی ہونے وقت بھی اُنکا بنیادی ڈھانچہ قائم رہتا ہے۔یہ ہیں وہ ترکیبی عناصر جن کا میلوں تیوہاروں کا مطالعہ کرتے وقت زیر نظر رکھنا ضروری ہے۔قومی تیوہاروں کو چھوڑ کر بقیہ جملہ میلوں اور تیوہاروں کی اساس مذہبی یا دھارمک ہوتی ہے لیکن ان کے اقتصادی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔بہت سے تیوہار، موسموں اور رُتوں کے سواگت اور الوداع کے طور منائے جاتے ہیں۔تیوہار مذہبی ہوں ،سماجی ہوں یا سیاسی کئی لحاظ سے جملہ سماجی قدروں کو احیائے نو کی نئی بُنیاد بھی فراہم کرتے ہیں انہیں ہم تہذیبی روایات کے اعادہ کا نام بھی دے سکتے ہیں۔کچھ ایسی رسوم بھی ہیں جو صدیوں سے جاری ہیں۔ مرغِ خوشہ (ہیلی کوکُر) جو دھان کی پہلی پہلی بالیاں نکل آنے کے موقع پر ذبح کیا جاتا ہے۔ جس کا کچھ حصہ پکے چاولوں کے ساتھ تہری کے طور بانٹا جاتا ہے۔اور کچھ واصل بحق ہوئے لوگوں کی ارواح کو ایصال ثواب کے لئے کسی دینی بزرگ کو ضیافت کی صورت میں دعوت دیکر پیش کیا جاتا ہے، ایسا ہی فصل بہار میں پہلی بار کھیتی میں ہل جوتتے وقت کیا جاتا، کتنی ایسی رُتوں اور رسموں کو گنا جائے جو یا

تو نیک شگون باندھنے یا اظہار تشکر کا روپ دھار چکی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہر ایک میلہ کا اپنے مذہبی، تہذیبی، سماجی اور معاشرتی پس منظر میں اجمالاً الگ الگ سے جائزہ لیا جائے۔ ایسا کرتے وقت اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ بیشتر میلوں اور تیوہاروں کے رواج پانے کی ابتداء اور قدامت کے بارے میں اکثر صورتوں میں وثوق سے کچھ نہیں کیا جا سکتا، اس کے سوا کہ یہ بہت قدیم ہونے کی بنا پر مُستند بھی ہیں اور مقدس بھی۔ عرفان نفس، ریاضت وزہد اور ترک لذات بہشت بریں کے پوترا ستھاپنوں، قدیم مقدس مقامات، ریشیوں منیوں، یہاں کے دلبریا معتدل آب وہوا اور سحر انگیز ماحول کی نیل مت پُوران میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ مطلب کی بات طرف آیا جائے مناسب معلوم ہوتا کہ اس امر کی جانب اشارہ کیا جائے کہ زمانہ قدیم سے بھارت میں نجومیوں اور جیوتشیوں کی کوئی کمی نہیں تھی، یہاں تک کہ ویدک شاعر اور برہمن بھی علم نجوم سے واقف ہوتے تھے۔ کشمیری پنڈت اس سلسلہ میں پیچھے نہیں تھے۔ ہندوؤں یا کشمیر پنڈتوں سے منسوب میلے اور تیوہاروں کی تاریخیں ستاروں کی گردش کے پیش نظر مختلف تاریخوں پر بروج کی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے مقرر کئے گئے ہیں۔ اس بات کی طرف بھی خیال رکھا گیا ہے کہ یہ تیوہار شمسی سال کے زُمرے میں آتے ہیں یا قمری سال کے۔ بکرمی اور شاکا سموت بھارت کے دور اہؤں بکر مادتیہ اور سلوانیا نے ۵۷ء اور ۷۸ء میں...... سیتھیائی حملہ آوروں پر فتوحات کی یا میں رائج کئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں (کشمیر) کے کئی میلے اور تیوہار کشمیر سموت جسے سلطان شمس الدین شاہمیری نے ۱۳۳۹ء میں رائج کیا اور کشمیر کے پہلے مسلم فرمانروا سلطان صدرالدین (رینچن شاہ) کے سال جلوس ۱۳۲۰ء سے لاگو سمجھا گیا۔ کشمیر سموت کے مہینوں کے نام یوُں ہیں۔

وہیک، زیٹھ، ہار، شراوُن، باُدر، اَشِد، کارتک، مونجھور، پوہ، ماگ، پھاگن تہ ژِتھر۔

**نوراترا**: (نوریہہ) ہی شمسی سال کا پہلا دن ہوتا ہے، اس

روز کشمیری پنڈت پوجا پاٹ کرتے اور بھگوان سے نئے سال کی برکتوں کیلئے پرارتھنا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شارکا دیوی کے انوگریہہ سے چنڈاراکھشس اسی دن زیر ہوگیا اور ستی سر جھیل پوری طرح خشک ہوگئی۔

**جشیٹھ اشٹمی**: (میلہ کھیر بھوانی یہ کشمیری ہندوؤں میں ایک بہت ہی اہم تیوہار مانا جاتا ہے جو جیٹھ کے چاندنی پاکھ کی آٹھویں تاریخ کو بڑی شان سے منایا جاتا ہے، اس روز تولہ مولہ میں واقع راگنیا دیوی کے استھاپن پر میلہ لگتا ہے، جہاں کشمیری پنڈت دیوی کے درشن سے فیضیاب ہوتے ہیں اور اس کے چرنوں میں حاضر ہوکر طمانیتِ قلب پاتے ہیں۔

**مہانومی**: یہ دو دفعہ منائی جاتی ہے، اول اپریل میں، دوم اکتوبر کے مہینہ میں جب بنگال اور یوپی میں درگا پوجا کے پوتر دن ہوتے ہیں۔ اس اوسر کے پیچھے رام چندر جی کی یادگار فرما ہے۔

**جنم اشٹمی**: (زرمہ ستم) بھادون کے اندھیرے پاکھ کی آٹھویں رات (نصف شب) کرشن۔ کی پیدائش کے طور پر منائی جاتی ہے اس روز ہندو جاتی کے لوگ برت رکھتے اور پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ وہ سبھی رسوم پوری کی جاتی ہیں جو بچے کے جنم لیتے وقت ادا کرنا ہوتی ہیں۔

**وتستا ترورشی**: (وِتھ تر واہ) وتستا (جہلم) جو کشمیری مشترکہ تہذیب کی علامت ہے، کے جنم دن کے طور پر منائی جاتی ہے، اس روز کشمیری پنڈت ماضی قریب تک چٹائی یا لکڑی کے تختہ پر وتستا میں جلتے چراغ بہاتے تھے۔ بعد میں راجوں مہاراجوں کے جنم دن یا کسی اچھے اوسر پر اظہار مسرت کے لئے بھی ایسا ہی کیا جاتا تھا۔

**کاگ پورنماشی ،ماگھ پورنماشی**: (کاوِ پُنم،

ماگیہ پُنم) کوّے کے جنم دِن کے طور پر منائی جاتی ہے اس روز گھاس کی چھوٹی چٹائی پر کوّے کے لئے بھات پروسکر رکھا۔

**پن دینا**: یہ بیب دھرم ماتا کا دن ہے، اِس دن کشمیری پنڈت روٹ (گندم کے آٹے کی موٹی اور خاص میٹھی روٹی) گھی میں تل کر خیرات کے طور بانٹتے ہیں۔

**یکھش اماوس**: (کھچڑی اماوس) یہ پوہ ماس کے اندھیرے پاکھ کے آخری دن کو مناتے ہیں۔ اس موقعہ پر کشمیری پنڈت شام کو کھچڑی تیار کرتے ہیں جس کا پہلا حصہ یکھش کو ڈالا جاتا ہے جس کی بنا پر اسے یکھش اماوس کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

**اننت چتر دشی**: (اَنتہ ژوداہ)۔ اگلے وقتوں میں سبھی کشمیری پنڈتانیاں لیکن اب صرف بوڑھی کشمیری پنڈتانیوں تک ہی محدود ہے کہ وہ سونے یا تاگے سے بنا ہوا سانپ زیبِ گوش کرتی ہیں۔ اننت چتر دشی بھادوں کے مہینہ میں منائی جاتی ہے۔ یہ ناگ پوجا کی ایک صریح نشانی ہے۔

**گنیش چتر دشی**: (گنہ ژوداہ)۔ یہ گرما کے موسم میں منائی جاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ گنیش جی کا جنم دِن ہے، اس روز ہندو لوگ لڈو بانٹتے ہیں۔

**تیل اشٹمی**: (تیلہٕ اُٹھم) شیوراتری کے بعد چاندنی پاکھ کی آٹھویں تاریخ کو منائی جاتی ہے۔ یہ موسم سرما کی ایک طور سے رخصتی ہے۔ صبح کے وقت چراغوں کی پوجا کی جاتی ہے اور شام کو بچے پُرانی کانگڑیوں کے خول دائرے میں ناچتے ناچتے جلاتے ہیں اسے ''جتس تیں'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

**گوری ترے**: (گور ترٛے) اس شُبھ اوسر پر پردہت لوگ

بچوں اور نئی بیاہتا دُلہنوں کو دیوی، دیوتاؤں کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔

**رام نومی** : (رامہ نوم) رام چندر جی کے جنم دن کے طور پر منائی جاتی ہے۔ یہ چیت مہینے کے چاندنی پاکھ کی نویں تاریخ کو مناتے ہیں۔ اس روز کشمیری پنڈت برت رکھتے ہیں۔ مندروں میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ رات کو رامائن کا پاٹھ بھی کیا جاتا ہے۔ راجپوتانہ میں گھوڑوں، ہاتھیوں اور دیگر سامان حرب کی پوجا کی جاتی ہے۔

**پھروو**: یہ تیوہار بہار کی آمد آمد کے ساتھ ساتھ منایا جاتا ہے۔ اور جنوبی کشمیر (مراز) کے ضلع اننت ناگ (اسلام آباد) تک محدوٗد ہے۔ چھوٹے بچے بالخصوص اس روز صنوبر کی لکڑی اور گھاس کی گھٹڑیاں دائروں میں ناچ ناچ کر جلاتے اور چراغاں کرتے ہیں، اسے بودھ عہد کی نشانی تصور کیا جاتا ہے، لیکن حسنِ اتفاق دیکھئے حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کے خلیفہ دوم حضرت زین الدین ریشیؒ عیشمقام کا عرس بھی اسی دن منایا جاتا ہے۔ جس سے پھردو کو اور زیادہ تقدیس نصیب ہوئی ہے۔ اِسے زردشتی روایات سے بھی جوڑا جا رہا ہے۔

**شیو راتری**: بھگوان شیو اور پاروتی کے ملن کی رات پھاگن مہینے کے اندھیرے پاکھ کی تیرھویں اور چودھویں تاریخ کی درمیانی رات منائی جاتی ہے۔ اس دن کشمیر پنڈت بھی برت رکھتے اور شیو کی پوجا کرتے ہیں۔ شیو راتری کی صبح کو کشمیر میں مسلمان بھائی پنڈت بھائیوں کو مبارکباد پیش کرنے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ قومی تیوہار بھی مذہبی رواداری، اخوت و برادری کی علامت کے طور زندہ و جاوید ہے۔

**ہولی** :رنگوں اور مسرتوں کا یہ تیوہار پھاگن مہینہ کے چاندنی پاکھ کی دسویں تاریخ کے بعد منایا جاتا ہے۔ ہولی سنسکرت لفظ ''ہولِکا'' کا بگاڑ ہے

جس کے معانی ادھ پکے اناج کے لئے جاتے ہیں اور یہ تیوہار اصلاً بہار یہ تیوہار کے طور پر منایا جاتا تھا، جب فصلوں اور کھیتوں سے فصلی بیماریوں کا قلمع قمع کرنے کیلئے مذہبی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ ادھ پکے گیہوں اور جو کے ڈنٹھل کھا لینے اور گوبر جلانے کی رسمیں آج بھی ادا کی جاتی ہیں۔ ہولی کے پس منظر میں کئی روایات مشہور ہیں۔ ایک راجہ ہرناکشپ، اس کے بیٹے پرہلاد کے جلتی ہوئی آگ میں سے بچ نکلنے اور اس کی بہن ہولکا کے زندہ جل مرنے کے گرد گھومتی ہے، دوسری یہ کہ ایک ہولکا نامی بھوتنی ہر روز انسانی بچوں کو نگل جاتی تھی۔ لوگ دیوزادوں کے راجہ سے ملتجی ہوئے جس کے نتیجہ میں فیصلہ یہ ہوا کہ ہولکا اب یومیہ ایک بچے کو ضیافت کے طور استعمال کرے۔ ایک دن ایک بڑھیا کے اکلوتے بیٹے کی باری آئی۔ اپنی قسمت سے بیزار بڑھیا پریشانی کے عالم میں گھوم رہی تھی کہ اُسے ایک سادھو کی ملاقات نصیب ہوئی جس نے اُسے بتایا کہ ہولکا بھوتنی کو انتہائی بدزبانی سے زیر کیا جاسکتا ہے بڑھیا نے یہ خبر دور دور تک پھیلائی، اُس نے بچوں کی ایک بھاری تعداد جمع کی۔ ہولِکا نمودار ہونے کو ہی تھی کہ بچوں نے ایک زبان ہو کر اُس پر گالیوں کی اس طرح بوچھاڑ کی کہ وہ دم توڑ بیٹھی۔ بچوں نے اس کی نعش کو جلاتے ہوئے خوشیاں منائیں کیونکہ انہیں ایک چڑیل سے نجات ملی تھی۔ یہ تیوہار یہی یاد تازہ کرنے کیلئے مناتے ہیں۔ مذہب چھوٹے بڑے اور جنس کا خیال رنگوں سے ہولی کھیلتے وقت کوئی رکاوٹ نہیں بنتا۔ یہ تیوہار ہندوستانی تہذیب کی کثرت میں وحدت کی علامت ہے۔

**بیساکھی**: (ویشاکھی) یا میکھ سنکرات بیساکھ کی پہلی تاریخ کو منائی جاتی ہے۔ جب سورج برجِ حمل میں داخل ہوتا ہے اس موقع پر گنگا جل میں نہانا شُبھ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کشمیر میں ایشہ بر کے مقدس استھاپن پر کشمیری

پنڈت اشنان کرتے ہیں تاکہ بھگوان کے چرنوں میں گر کر نئے سال کے بُرے اثرات سے نجات مل سکے۔ کشمیر میں اسی روز لوگوں کی تفریح کی خاطر مغل باغات کُھلے چھوڑے جاتے ہیں۔ اِس طرح ہندو، مسلم اور سکھ اس بہار یہ تیوہار کی خوشیوں اور شادمانیوں میں شریک ہو کر نئے سال کی پُرمسرت ابتداء کرتے ہیں۔

**دسہرہ**: (دَشہِ ہار): رام چندر جی کی عظیم فتح کا دسواں دِن جب اُس نے راون پر غلبہ حاصل کیا تھا، ایک یادگار کے صورت میں مناتے ہیں۔ اس روز ہندو لوگ راون کمبھ کرن اور میگھناتھ کے بھاری بھرکم پُتلے کھلی جگہوں پر جم غفیر کے سامنے جلاتے ہیں۔ لنکا کو بھی آگ لگائی جاتی ہے، اس طرح رامائن کی داستان کو عملی صورت دی جاتی ہے۔ جہاں جہاں ممکن ہو اِن دنوں رام لیلائیں کھیلی جاتی ہیں جس سے سارے بھارت کا روایتی تھیٹر صدیوں سے زندہ ہے۔ اسے بارشوں کے خاتمہ کا تیوہار بھی مانا جاتا ہے۔

**دیوالی**: دیپاولی یا چراغاں کا تیوہار کارتک کی چودھویں تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ اس سے متعلق بھی کئی رواتیں زبان زدِ عام ہیں۔ جنہیں طوالت کے باعث یہاں درج کرنا مناسب نہیں لیکن اتنا کہنا بھی بجا ہی ہوگا کہ اسے لکشمی اور وِیشنو کے مِلن کا پوتر دِن بھی سمجھا جاتا ہے، کئی لوگوں کا خیال ہے کہ اس روز کرشنا نے آرتی بھگوتی کے زیوارت و جواہرات کی بازیابی نکسورا، راکھشس کو قتل کرکے اَنجام کو پہنچائی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کرشنا نے سولہ ہزار گوپیوں کو اُس (راکھیشس) کی قید سے چھڑایا تھا۔ اس روز گھر گھر چراغاں ہوتا ہے جو قابل دید نظارہ پیش کرتا ہے۔ پٹاخے اور آتشبازیاں بھی چھوڑی جاتی ہیں۔

**امرناتھ یاترا**: دشت وجبل کی اہمیت عرفان ذات و کائنات کے

حوالہ سے مسلمہ ہے علامہ اقبال کوہِ ہمالیہ کی تہذیبی عظمت کا یوں اعتراف کرتے ہیں۔

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسمان کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

کوہِ ہمالیہ نہ صرف ہندوستان کی قومی تقدیس کا محافظ ہے بلکہ اس کی عظمت کا ضامن بھی۔ بھارت کے جنوب میں کیدارناتھ اور شمال میں شری امرناتھ جی کی گپھا آغوشِ فطرت مین طمانیت قلب کا سامان بہم کر رہی ہے، شری امرناتھ جی کی گپھا سطح سمندر سے 12729 فٹ کی بلندی پر واقع ہے، سرینگر کشمیر سے جنوب مشرق پہلگام تک 94 کلومیٹر اور وہاں سے گپھا تک 45 کلومیٹر کا فاصلہ ہے، امرناتھ گپھا کا ذکر کلہن کی راج ترنگنی میں آیا ہے۔ جس سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ 1000 سال قبل مسیح بھی طالب حق شولنگم کے درشن کے لئے گپھا میں حاضری دیتے تھے۔ حیرت کا مقام یہ ہے کہ لوگ یہ صبر آزما یاترا موسم کی کٹھنائیوں کے باوجود جان کی بازی لگا کر صدیوں سے اختیار کرتے آئے ہیں جذبۂ عشق و مستی اور سکون قلب کے ایک لمحہ کے لئے دونوں جہاں قرباں، رہی جان کی بات۔ یہ تو بقول فیضؔ۔

یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کا یارو کیا کہنا

اور پھر دشت نوردیٔ عشق کا مقدر ہے، جو زمان و مکان اور سود و زیاں کے تصور سے ماوراء ہے۔ لوگ بال تل کے دشوار گزار راستے سے بھی شولنگم کے درشن کو آج بھی جاتے ہیں۔

شری امرناتھ جی کی یاترا ساون کی چوتھی تاریخ کو سرینگر کے دشنامی اکھاڑے سے چھڑی مبارک کی صورت میں روانہ ہوتی ہے، جو پانپور، اونتی پور، بجبہاڑہ، اننت ناگ، مٹن، عیش مقام، پہلگام، چندن واڑی، شیش ناگ،

واوجن، مہاگنس اور پنچ ترنی سے ہوتی ہوئی ہزاروں یاتریوں کی اگوائی کرتی ہوئی ساون پورن ماشی کو شولنگم کے درشن پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔اسی روز دست غیب سے برفیلی سِل ،شولنگم کی صورت تکمیل کو پہنچتی ہے۔ ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ اس مقدس یاترا سے فیضیاب ہونے کے لئے معتقدین آتے ہیں۔اس موقع پر بجبہاڑ کے قریب تھجی وارہ میں بھی شو کے استھاپن پر میلہ لگتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امرناتھ گپھا کے شولنگ کو پہلی بار، بوٹہ کوٹ پہلگام کے مسلمان چرواہے آدم ملک نے مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ۱۸۵۰ء میں دریافت کیا۔ جسکی بناء پر مہاراجہ نے فرمان جاری کیا کہ آدم ملک اور اُسکی وارث اولاد یاترا کے دوران مٹن کے پروہتوں کے ہمراہ نذر ونیاز حاصل کرینگے۔ چنانچہ وہ آج بھی نذر ونیاز کے تیسرے حصے کے حقدار ہیں۔ ملک خاندان کے وارث کب کے بوٹہ کوٹ سے آکے مٹن کریوہ میں آباد ہو چکے ہیں۔

**رکھشا بندھن:** قومی تیوہار کے طور منایا جاتا ہے۔ جب بہن بھائی آپس میں بلالحاظِ مذہب وملت ایک دوسرے کی کلائیوں پر راکھیاں باندھکر اخوت ومحبت کا عہد وپیماں بھی باندھتے ہیں۔ جذبہ مروت ومحبت کا حلقہ بادشاہوں کو راج پروہیت، عام لوگوں میں عورتیں، مردوں کو اور لڑکیاں لڑکوں کی کلائیوں پر آپس میں اس لئے باندھتی ہیں کہ وہ سارا سال آلام ومصائب اور بدروحوں سے نجات پائیں اور ساتھ ہی ساتھ پیار کا پُرخلوص انسانی رشتہ مضبوط سے مضبوط تر رہے۔ یہ تیوہار بھی مذہبی رواداری کی علامت ہے۔

**چودھویں صدی** :عیسوی میں وادیٔ کشمیر میں ایرانی سادات مبلغین کے ہاتھوں اشاعت اسلام کا کام باضابطہ طور سُرعت سے چلا۔ ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرت کے اثرات کی گرفت بھی مضبوط ہوتی چلی گئی۔اس طرح یہاں کے تیوہاروں اور میلوں میں ایک خوش آئندہ اضافہ ہوا۔ جیسا کہ پہلے ہی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ میلوں اور تیوہاروں کے رنگ میں تہذیبی لین دین کے باوجود بنیادی روایتی رنگ قائم رہتا ہے جیسا کہ ریشوں اور مینوں سے منسوب تیوہاروں کے موقعوں پر ڈھال کا کھیلا جانا جو ہمارے روایتی رقص ک مقبول عام صورت ہے۔ اسلامی یا ہجری سموت کو قمری

سال سے بھی یاد کیا جاتا ہے،ان تیوہاروں کے بغیر جن کی بنیاد شرعی یا مذہبی ہے۔ کئی ایسے بھی ہیں جو مقامی یعنی کشمیری سموت کے مطابق آج بھی منعقد ہوتے ہیں۔اس بات کا اندازہ اگلی سطور میں کیا جاسکتا ہے۔

**عید الفطر** (لوکٹ عید): عید الفطر اس کا نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس روز مسلمان رمضان المبارک کو روزہ رکھنے کے بعد سحری کے بجائے صبح کے وقت بھی کھانا کھاتے ہیں۔معاشرتی اور بالخصوص اس کا معاشی پہلو قابل ذکر ہے کہ اس روز صدقہ فطر غرباء مین نماز عید سے پہلے تقسیم کیا جانا ہر مسلمان پر لازم ہے تاکہ وہ بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہوسکیں۔اس موقعہ پر مسلمان نئے ملبوسات زیب تن کرتے اور خاص خاص ضیافتوں کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔بڑے، چھوٹوں کو عیدی سے نوازتے ہیں۔نزول اسلام سے پہلے بھی عرب میں روزہ رکھنے کا رواج تھا لیکن اہم اور بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ انہیں مصائب ٹالنے کے ذریعے کے طور اختیار کرتے لیکن اسلام میں اسے خصائل بہائم کو زیر کرنے اور تزکیہ نفس کے مؤثر تر وسیلہ کے طور ارکان خمسہ میں شامل کیا گیا ہے۔عید کا چاند ایک ضرب المثل بن گیا ہے شوال المکرّم کی پہلی تاریخ اس طرح ابدی مسرتوں کی سوغات لئے مسلمانوں کو اپنی معاشرتی اور انسانی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلاتی ہے۔عید روف گیتوں سے کئی دنوں تک فضاء میں روح پرور نغمگی چھائی رہتی ہے۔

**عید الاضحیٰ** (بڈ عید): یہ ہر سال ذی الحجہ کی دس تاریخ کو منائی جاتی ہیے۔اسے بقر عبد اس لئے بھی کہتے ہین کہ اس تقریب پر مسلمان اللہ کے نام پر شرعاً حلال جانوروں کی قربانیاں دیتے ہیں،اس طرح ذبح کئے گئے تندرست وصحت مند جانوروں کا گوشت مسلمان اپنے اقربا، ہمسایوں ،اور

احباب میں تبرکاً بانٹتے ہیں۔ ہمسایوں میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ اس طرح شاید ہی کوئی خدا کا بندہ ہوگا (بالخصوص مسلمانوں میں) جو عید کی خوشیوں میں شریک نہ ہو سکے۔ بقر عید حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کے منشائے ایزدی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی یاد تازہ کرتی ہے، جب انہوں نے رضائے الٰہی کے لئے اپنے چہیتے فرزند حضرت اسماعیلؑ کو اپنے ہاتھوں اللہ کے نام پر ذبح کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ جب وہ اس کڑی آزمائش میں پورے اُترے تو اللہ حکم سے جنت سے ایک مینڈھا لایا گیا۔ جسے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے بدلے قبول کیا گیا۔ جب سے اب تک قربانی کا یہ قدیم سلسلہ جاری ہے، جو جہاد فی النفس کی علامت ہے کہ پیاری سے پیاری چیز کو اللہ کی راہ میں صرف کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ بقر عید کی تقریب سعید پر ہی مسلمان مکہ معظّمہ جاکر لاکھوں کی تعداد میں حج کا مقدس فریضہ انجام دیتے ہیں، جو اسلام کے بنیادی پانچ ارکان میں شامل ہے۔

عید الفطر کی مانند بقر عید پر بھی مسلمان عورتیں کشمیر میں روف گیتوں سے مسرتوں میں اضافہ کرتی ہیں، دوسرے فرقوں اور مذاہب کے لوگ مسلمان بھائیوں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کشمیری عوام مذہبی رواداری کی صدیوں پُرانی روایات زندہ رکھے ہوئے ہیں

**عید میلاد:** ۱۲ ربیع الاول وہ مبارک دن ہے جب پیغمبر آخر الزمان، ختم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰؐ مکہ کے قریش خاندان میں حضرت عبداللہ کے گھر بی بی آمنہ کے بطن سے آج سے چودہ سو بیس سال پہلے پیدا ہوئے۔ طویل انتظار کے بعد اللہ کا یہ محبوب، نور کا مجسمہ مکہ کی سرزمین کو نصیب ہوا، جن کے بارے میں ارشاد ربانی ہے کہ ”میں نے تجھے دونوں جہان کیلئے

رحمت بنا کر بھیجا' وما ارسلناک الا رحمة للعٰلمین. حقیقت بھی یہی ہے کہ انہوں نے نہ صرف عرب کے وحشی قبائل کو مہذب بنایا بلکہ سارے عالم انسانیت کے سامنے ایک واضح نصب العین رکھا، جسے قرآنِ مجید کے رو سے اسلام کا نام دیا گیا ہے۔ حضرت محمدؐ کی مدح خود قرآنِ کریم میں اللہ نے کی ہے، جو ان کی سیرت پاک کا مرقع ہے، یہاں اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ انہوں نے اپنی عملی زندگی سے انسانیت کو قعرِ مزلت سے نکال کر تہذیب کی ترقی پذیر راہ پر لگا دیا، انہوں نے توحید کی تعلیم دیکر انسانی وحدت، اخوت و مروت اور دیگر ابدی قدروں کو اُجاگر کیا۔ اسی محسنِ انسانیت، حُسن خلق، حُسن اخلاق و انسانیت کے عظیم ترین غمخوار کا جشن مولود ہر سال آج کے دن یعنی ۱۲ ربیع الاول کو عزت و احترام سے منایا جاتا ہے۔ مسلمان جگہ جگہ سیرتی جلسے کرتے ہیں۔ شام کو گھروں میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ لوگ اپنی عقیدت کا اظہار نعت و مناقب کی صورت میں کرتے ہیں اس روز سعادت کے بعد آنے والے جمعہ کو ہر سال حضرت بل میں بے مثال میلہ لگتا ہے، جب کشمیر کے کونے کونے سے آئے ہوئے زائرین اوقات نماز پر موئے مقدس کی زیارت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

**معراج عالم** : یہ رجب المرجب کی ستائیسویں متبرک رات ہے جب حضرت، محمدؐ کو اپنے حبیب نے عالم ملکوت کی سیر کرائی، آپ اُن تمام مقامات سے آگے نکل گئے جہاں تک ماقبل کے دیگر انبیاء پہنچ چکے تھے، یہاں تک کہ حبیب اور محبوب کے درمیان قوسین کا بلکہ اُس سے بھی کم فاصلہ رہا۔ یہ رات اُمتِ مسلمہ کے لئے رُشد و ہدایت کی نوید لیکر آئی ہے اور آتی رہیگی۔ قرآن کریم میں معراج النبی کا یوں واضح طور ذکر کیا گیا ہے۔ ''وہ ذاتِ پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے (حضرت محمدؐ) کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی

طرف لے گیا۔ (اُسے) بابرکت بنایا تا کہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔''

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلا من المسجد الحرام الیٰ المسجد الاقصیٰ الّذی بٰرکنا حوله لنریه من اٰیتنا انه هوالسَّمیع البصیر

اس طرح اُمتِ مُسلمہ کو برکات الٰہیہ کا وارث قرار دیا گیا دوسرے الفاظ میں معراج النبیؐ عروجِ اسلام کی واضح علامت ہے، حضرت محمدؐ اُن مقاماتِ ارفعَ سے گزرے کہ جبریل علیہ السلام کے بھی پر جلے۔

اگر یک سرِ موئے برتر پَرم
فروغِ تجلی بسو زو پرم

اس تقریب سعید پر بھی شب بیداری کی جاتی ہے۔ مسلمان گھروں میں چراغاں ہوتا ہے۔ مسجدوں اور خانقاہوں میں معراج کی فضیلت بیان کی جاتی ہے۔ اجتماعات کا انعقاد ہوتا ہے، سب سے بڑا اجتماع حضرت بل میں ہوتا ہے جہاں زائرین موئے مقدس کی زیارت کرتے ہیں۔ رجب المرجب کی ستائیسویں شب کے بعد آنے والے جمعہ کو حضرت بل میں بڑا اجتماع ہوتا ہے جب نماز پنجگانہ پر حضرت رسول اکرمؐ کے موئے مقدس کی نشاندہی کرائی جاتی ہے۔

**شبِ برات**: یہ ماہِ شعبان کی چودھویں اور پندرھویں تاریخ کی درمیانی رات کو منائی جاتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے اعمال کے مطابق اپنی عنایات عطا فرماتا ہے، اس شب کی شب بیداری اور عبادت ہزار ہا سال کی عبادت کا اجر رکھتی ہے۔ مسلمان اپنے گھروں میں اسلئے رات بھر روشنی جلائے رکھتے ہیں۔ کہ ملائیکہ کا نزول ساری شب جاری رہتا ہے۔

حصول ثواب کے لئے لوگ روزہ بھی رکھتے ہیں۔

**شب قدر**: یہ رمضان المبارک کی ستائیسویں رات ہے جسکا ذکر قرآن کریم میں "لیلۃ القدر" کے نام سے آیا ہے۔ اس شب کی فضیلت ہزار ہا سالوں کی عبادت پر فوقیت رکھتی ہے، دن بھر روزہ تو رکھا ہی جاتا ہے لیکن رات بھر شب بیداری اور اوراد و اذکار میں صرف ہوتی ہے، اسے "لیلۃ القدر" اسی لئے کہا گیا ہے کہ قرآن کریم کا نزول اسی شب کے دوران ہوا ہے۔ واعظ اور دینی علماء اس رات مساجد اور خانقاہوں میں اسکی فضیلت بیان کرتے ہیں۔ نماز تراویح بھاری اجتماعات میں بھی ادا کی جاتی ہیں۔

**عرس دستگیر صاحبؒ**: یہ تقریب خانقاہ غوثیہ خانیار میں بالخصوص غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانیؒ عرف دستگیر صاحبؒ کے یوم وصال پر ۱۱/ ربیع الثانی کو ہر سال منائی جاتی ہے، اس موقعہ پر وادی کے گوشے گوشے سے عقیدتمند خانقاہ غوثیہ میں حاضری دینے آتے ہیں۔ کئی دنوں تک مقررہ اوقات نماز کے بعد تبرکات غوثیہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی نظر کرم سے چور بھی ابدال ہوئے۔ اُن کی دستگیری ضرب المثل ہے جس کی وجہ سے انہیں دستگیر صاحبؒ کے پیارے نام سے پکارا جاتا ہے۔ غوث الاعظمؒ کا روضہ مُبارک بغداد میں ہے۔

**عرس نقشبند صاحب**: حضرت بہاؤ الدین نقشبند مشکل کُشاؒ کا یوم وصال ۳/ ربیع الاول کو خانقاہ نقشبندیہ پر ایک پُر شکوہ تقریب کی صوت میں منایا جاتا ہے۔ عقیدتمندانِ مشکل کشاء جوق در جوق اُنکے روضہ پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنے اور مدعائے دلی کے حصول کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔

**عُرس ریشی مولؒ:** ایک دن جب علمدار کشمیر حضرتِ شیخ نورالدین ریشیؒ انت ناگ (اسلام آباد) میں اُس جگہ پہنچے جہاں آج بابا ہردے رشی کا مدفن ہے تو وہ کچھ دیر یہاں رُکے۔ بابا تاج الدین جو اُن کے ساتھ تھے متفکر ہوئے اور اُن سے دریافت کیا کہ حضرت آپ نے یہاں سے آگے قدم کیوں نہیں بڑھایا۔ حضرت شیخؒ یوں گویا ہوئے۔ ''مجھے یہاں پر ایک رشی کی موجودگی کی بو آتی ہے یہاں ایک رشی پیدا ہوگا۔ جسکا نام رشی مول ہوگا۔ اسی پر رشی سلسلہ اختتام پذیر ہوگا۔'' حقیقت بھی یہی ہے کشمیر میں رشی سلسلہ بابا ہردے رشی پر ہی انجام پذیر ہوا۔ بابا ہردے ریشیؒ عرف ریش مول کا عرس اُن کے یوم وصال پر یکم ذیقعدہ کو منایا جاتا ہے، حضرت ریش مولؒ کے عقیدتمندوں کے احترام میں یکم ذیقعدہ کے سالانہ عرس سے پہلے اور بعد میں ڈھائی، اڑھائی دن مچھلی اور گوشت وغیرہ کھانا ترک کر دیتے ہیں۔ کھٹی مولی سبزی کے طور دکھائی جاتی ہے۔ یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو ان دنوں گوشت کھائے گا اُس کا گھر خدانخواستہ جل کر خاکستر ہوگا۔ بابا ہردے رشی کا طریق ترک لذات مسلکِ رشیت کے عین مطابق ہے۔

**عرس شاہ ہمدان:** حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ ۷۸۲ھ تا ۷۸۶ھ تین دفعہ وارد کشمیر ہوئے جب وہ دوسری دفعہ یہاں تشریف لائے تو پرورسنین کے بنائے ہوئے کالی مندر کا پروہت شاپور محمد شاہ کے نام سے حلقہ اسلام میں شامل ہوا۔ مندر کی جگہ صوفہ تعمیر ہوا۔ بعد میں یہی کام ان کے فرزندِ ارجمند حضرت میر محمد ہمدانی کے ہاتھوں ۷۹۹ھ میں تکمیل کو پہنچا۔ خانقاہ معلیٰ کو بقعہ اسلام کی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کو بانیٔ اسلام کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اوراد فتحیہ مقامی روایات

کے مطابق بالجہر پڑھنے کی اجازت بھی انہوں نے دی۔ اگر اوراد فتحیہ کو توحید جاریہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ حضرت امیر کبیرؒ عرف شاہ ہمدانؒ کا عرس مبارک ۶ ذی الحجہ کو ہر سال اُن کے یوم وصال پر منایا جاتا ہے۔ اُن کی بارگاہ میں ہندو مسلم سبھی طمانیت قلب ونظر حاصل کرکے ہی لوٹتے ہیں۔ یہ ان کی ذات بابرکات ہی کا نتیجہ ہے کہ کشمیر میں اسلام انتہائی سرعت سے پھیلا۔ اُنکے فرزند ارجمند حضرت میر محمد ہمدانیؒ اور خود اُن سے منسوب ڈورو، وچی، ترال ودیگر مقامات کی خانقاہوں پر عقیدتمندانِ شاہِ ہمدانؒ کے میلے لگتے ہیں وہ نہ صرف مبلغ تھے بلکہ اعلیٰ پایہ کے ولی صوفی، عالم اور شاعر بھی تھے۔

**عُرس سید حسینؒ سمنانی**: حضرت سید حسینؒ سمنانیؒ حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے چچیرے بھائی تھے۔ وہ ۷۷۵ھ میں اُنہیں کے ارشاد پر وارد کشمیر ہوئے۔ حضرت شیخ العالمؒ کے والد بزرگوار سلر سنز حضرت سید حُسین سمنانیؒ کے فیض و برکت سے شیخ سالار دین کے نام سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت شیخ العالمؒ اُن کی حیات طبعی تک اُن سے کسب فیض کرتے رہے۔ اُنہیں کے ارشاد سے وہ کیموہ میں اقامت پذیر ہوئے تاکہ سفر عرفان کے لئے عزم مصمم بھی باندھیں۔ حضرت سید حُسین سمنانیؒ کولگام میں ۱۱ر شعبان ۸۲۵ھ کو واصل بحق ہوئے اور وہیں خانقاہِ سمنانیہ میں آسودہ ہیں سال وصال یوں باندھا گیا ہے۔

سال وصلش زروئے حب طلبی
زبدۂ خانقاہِ آل نبیؐ

اُن کے یوم وصال ۱۱ر شعبان المعظم کو کولگام میں خانقاہِ سمنانیہ پر میلہ لگتا ہے۔

اُن کے دیگر احباب خانہ موضع آمنو میں آسودہ ہیں۔ جہاں اُن کے نام نہایت خوبصورت قطعۂ ارضی منسوب ہے۔

## حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کا عرس :

حضرت شیخ نورالدین ولیؒ جو کشمیری زبان کے بابِ عرفان اور کشمیر میں تحریک رشیہ کے بانی اور اسلام کے اوّلیں شارح، ہماری مشترکہ تہذیب کے ترجمان اور امین سیماب پا ریشی اور ولی اکمل تھے کا سالانہ عرس چرار شریف میں تزک واحتشام سے منایا جاتا ہے۔اُن کے کلام کو کلام اللہ کی تشریح سے تعبیر کیا گیا۔انہیں کشمیری عوام علمدار اور کشمیری واعظ کے پیارے ناموں سے پکارتے ہیں اور اُن کی قرارگاہیں کیموہ، ژمبر، درے گام، روپہ ون اور ہچہ پورہ آج بھی حصول مدعا اور راحت قلب وجگر کا محور ہیں۔ اُنکی ابدی آرامگاہ چرار شریف میں ہے جہاں کشمیری سموت کی ۲۶/ پوہ کو ہر سال اُن کے تبرکات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ولادت : ۷۷۹ھ (۱۳۷۸ء) وفات : ۸۴۲ھ (۱۴۱۴ء)۔

## عرس زین الدین ولیؒ عرف زٲنہٕ شاہ صأب :

حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کے خلیفہ دوم اُن کی (اپنے مُرشد کی) وفات کے دس سال بعد ۸۵۲ھ میں انتقال فرما گئے ہیں۔اُن کا سالانہ عرس کشمیری بیساکھ (وہسکھ) کی دسویں تاریخ کو منایا جاتا ہے،اس موقعہ پر عیش مقام کے گردونواح اور مزار کے نشیب وفراز میں بچے ناچ ناچ کر ہاتھوں میں صنوبر اور گھاس کی جلتی مشعلیں لیکر راہوں اور بستیوں کو بقعہ نور بنا دیتے ہیں۔ یہ منظر بہت ہی دلکشا اور روح پرور ہوتا ہے، جو موسم بہار کے استقبال اور سردیوں کے الوداع کی ایک زندہ علامت ہے۔اس کا دوسرا نام ''پھرو'' بھی ہے۔کہیں کہیں اِسے ''زاہ''

بھی کہتے ہیں۔ حضرت زین الدین ولیؒ کے آستان فیض پناہ پر کئی دن عیش مقام میں عقید تمندوں کا بھاری میلہ لگتا ہے۔لوگ آستانِ زانہ شاہ پر منّت کے بھیڑ اور نقد و جنس نذر و نیاز کے طور پیش کرتے ہیں۔

**عرس شیخ حمزہ مخدومؒ**: سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کا سالانہ عرس ۲۴ صفر المظفر کو کوہ ماران کے دامن میں لگتا ہے۔ عقیدتمندوں کا تانتا کئی دِنوں تک بندھا رہتا ہے۔ حضرت مخدومؒ تجر سوپور میں ۹۰۰ ھ کو بابا عثمان رینہ کے گھر پیدا ہوئے وہ مادر زاد ولی تھے۔ کشمیر میں اشاعت اسلام کی تحریک کو اُن کی عارفانہ رہنمائی میں بہت تقویت ملی۔ حضرت بابا داوٗد خاکیؒ اور بابا ہردے ریشیؒ عرف ریش مول اُن کے خاص مریدوں میں سے تھے۔تقویٰ، ان کی ریاضت اور عبادت، انکی کرامات بے شمار ہیں خشک سالی ہو کہ باران مسلسل ،لوگ صف در صف خانقاہ مخدومیہ میں ان کے حضور پانی کے گڈھے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ اللہ کی رحمت ٹھاٹھیں مارتی ہے اور لوگ دامن مراد بُھرا پُر الیکر گھروں کو لوٹتے ہیں۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے میرے عرق انفعال کے

**عرس حضرت شیخ یعقوب صرفی عرف ایشان صاحب**: حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ عالم اسلام کے صف اول کے دانشور تھے۔ سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا تھا۔ مُلا عبدالرحمٰن جامی اُنکی ذہانت کے قائل تھے۔ آپ کو قرآن وحدیث اور تصوف پر کافی دستگاہ تھی وہ اپنے وقت کے یکتائے روزگار عالم دین تھے۔ دربار اکبری سے اُنکے روابط تھے۔ وہ عالی مرتبہ شاعر بھی تھے۔ انہوں نے بھی اپنے اُستاد مُلا جامی کی تقلید

میں پانچ مثنویاں تخلیق کیں ابو الفضل ان کے تبحّرِ علمی سے مرعوب تھا۔

حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ ۱۲/ ذیقعدہ ۱۰۰۳ھ کو انتقال فرما گئے اور زینہ کدل کے محلّہ ایشان صاحب میں اُن کا مقبرہ ہے جہاں ۱۲/ ذیقعدہ کو میلہ لگتا ہے۔

**عرس بابا نصیب الدین غازی**: حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے مرید خاص تھے۔ وہ ساری زندگی رشیت کے کاربند رہے، وہ اپنے مسلک کی تبلیغ کے لئے تبت بھی پہنچے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شمشان گھاٹوں اور قبرستانوں دونوں پر حاضر ہو کر ایصال ثواب کے لئے فاتحہ پڑھتے تھے۔ انہوں نے فارسی زبان میں اولین ریشی نامہ ''نور نامہ'' تحریر کیا جو ریشیت کو سمجھنے میں ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت بابا نصیب الدین غازیؒ ۱۴/ محرم الحرام ۱۰۴۷ھ کو واصل بحق ہوئے ہیں۔ وہ ریشیوں کے جُھرمٹ میں بجبہاڑہ میں آسودہ ہیں۔ اُن کے یوم وصال پر مئی۔ جون کو ہر سال عظیم الشان میلہ لگتا ہے۔ جو کم سے کم تین دن تک جاری رہتا ہے۔ اس موقعہ پر یہاں بجبہاڑہ میں بڑے دھوم دھام سے دھمال کھیلا جاتا ہے جو بہر نوع سلسلہ ریشیہ کی ایک خاص نشانی ہے۔

**عُرس شیخ داوُد المعروف بتہ مولؒ**: صوفی اللہ داد کے مرید خاص تھے یہ وہی صوفی اللہ دادؒ ہیں جن کے مرشد سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہؒ تھے۔ شیخ داؤد قوی الجثہ اور صحت مند تھے۔ زراعت پیشہ تھے کھیت پر جانے تو بھات کی دیگ بھی ساتھ لے جاتے اور راہ گیروں میں بانٹ دیتے۔ جس کی وجہ سے وہ بتہ مول کے نام سے مشہور ہوئے۔ کئی مؤرخوں کا خیال ہے کہ کشمیری پنڈتوں کو اُن سے...... والہانہ عقیدت تھی جسکی بناء پر اُنہیں بتہ مول کہا جاتا ہے، لیکن زیادہ اغلب یہی ہے کہ بتہ مول'' بتہ

۱۳ محرم الحرام ۱۰۸۷ھ

مول'، ہی کی بگڑی ہوئی صورت ہو، اگر یہی یعنی بٹہ مول ہی صحیح مان لیا جائے تو معاملہ اصلیت سے دور جاتا ہے۔ کیونکہ بتہ مول ہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور چونکہ قصبوں اور دیہات کے اصلی نام مسخ کرنے کا شغل آج بھی جاری ہے اسے انگریزی میں لکھتے وقت Batamol لکھا گیا ہوگا جو بعد میں اردو میں بھی اس طرح رائج ہوا۔ خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ حضرت شیخ داؤد ۲۱/رجب ۱۰۷۰ھ میں رحلت فرما گئے، اپنے ہی مسکن میں آسودہ ہیں۔ اُن کا آستان فیض پناہ عقیدتمندوں کے لئے قلب ونظر کی آسودگی کا باعث ہے۔ ان کی زندگی سادگی اور تقویٰ کا نمونہ تھی۔ انہوں نے خود زراعت کے پیشہ سے لگاؤ رکھا تاکہ خود کما کے دوسروں کو کھلا سکیں۔ نہ کہ روزگار یہاں تک کہ روٹی کیلئے بھی لوگوں کے دست نگر رہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ؎

عشق ورقتِ آید از نان حلال

بتہ مول صاحبؒ کا سالانہ عرس اُن کے آبائی محلّہ اور ابدی قرارگاہ بتہ مول ہی میں پر منایا جاتا ہے۔

## محرم الحرام:

سر داد، نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حُسینؓ

پیغمبر آخرالزمان حضرت رسولِ اکرم صلعم کے چہیتے نواسے حضرت امام حسینؑ ابن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہ کی حق کے نام پر عظیم شہادت کی اندوہ گین یاد ۱۰ محرم الحرام کو نہایت ہی عزت وحترام سے منائی جاتی ہے۔ یہی وہ دن ہے جب ۶۱ ھ میں انہوں نے ریگ زارِ کربلا کو اپنے اور اپنے لخت ہائے جگر کے پاک و معصوم خون سے سینچا اور اسلام کے چمنِ صد رنگ کو سدا بہار

بنادیا۔ انہوں نے اپنی عظیم شہادت سے باطل کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی روایت قائم کی۔ اہل تشیع اس روز ریاست کے امام باڑوں میں مجلس اعزاء کا انعقاد کرتے، تعزیے اور ماتمی جلوس نکالتے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ اور اُنکے معصوم جگر پاروں کے نام پر کشمیری مسلمان بالعموم کھیر اور شربت بانٹتے ہیں۔ اس طرح سے بچوں کی شرکت معصوم سے اس کی تقدیس وعظمت میں ایک الگ ہی رنگ کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ تو دینوی رسم ٹھہری لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔

نقش الا اللہ برصحرا نوشت

سطر عنوان رانجاتِ مانوشت

اور

غریب وسادہ رنگین ہے داستان حرم

نہایت اس کی حسینؓ ابتداء ہے اسمٰعیل

اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شیوخ، رشی اور دیوی دیوتاؤں کے استھاپن ہیں جن کی اہمیت علاقائی اور مقامی ہے لیکن اس مضمون میں اُنہی تیوہاروں اور میلوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی اہمیت ریاست گیر وہمہ گیر ہے۔

**نوروز**: ایرانی سال کا پہلا دن جسے ایرانی نئے سال کے جشن کے طور پر مناتے ہیں یہ جشن ہفتے سے زاید مدت کے لئے جاری رہتا ہے، یہی وہ بہار کے ایام ہوتے ہیں جب سورج خطِ استوا کو پار کرتا ہے اور ۲۰ تا ۲۲ / مارچ اعتدال لیل والنہار پر واقع ہوتا ہے۔ جسے Vernal Equinox کا نام دیا گیا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں جشن نوروز پر عام تعطیل ہوتی ہے، جب شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ بالخصوص مسرت وشادمانی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جشن نوروز ایران اور کشمیر کی ثقافتی اور تہذیبی لین دین کا مستحسن

نتیجہ ہے جو کشمیر میں اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ ایرانی تہذیب کی یادگار کے طور اب بھی جاری ہے۔

**بُدھ پورنیما** (بود پُنم) مہایان فرقے کے مطابق کپل وستو کے راجکمار سدارتھ عرف گوتم بدھ کے جنم اور مکتی کا شُبھ دن جیشٹھ مہینے کے چاندنی پاکھ کے آخر میں منایا جاتا ہے، جس کی بناء پر اسے بدھ پورنماشی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہین یان فرقہ یہ تیوہار ایک ماہ پہلے مناتا ہے۔ گوتم بدھ جنہوں نے دنیا کو عدم تشدد کی تعلیم دی اور اسے دارالمحن قرار دیا ۵۶۳ ق۔م پیدا ہوئے اور ۴۸۳ ق۔م میں رحلت فرما گئے۔ اُن کے والد کا نام سدودھن اور والدہ کا نام مایاوتی تھا جو اُن کی پیدائش کے ساتویں دن فوت ہوئیں۔ گوتم بدھ خدا کے بارے میں خاموش ہوتے ہوئے بھی عرفان واعتدال حیات ونفس انسانی کے قائل تھے۔ ریاست جموں وکشمیر میں ضلع لداخ وکرگل کی بیشتر آبادی بودھوں پر مشتمل ہے۔

**کرسمس ، کرسماس** (Christmas) عیسائیوں کا بڑا دن جسے وہ مسیح موعود یعنی حضرت عیسیٰؑ کے جشن مولود کے طور پر ۲۵ دسمبر کو ہر سال منایا کرتے ہیں۔ کرسٹ ، مسیحا کا یونانی مترادف ہے اور ماس (Mass) کے معانی اجتماع کے ہیں۔ یعنی وہ مسیحی اجتماع جو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے موقعہ پر ۲۵ دسمبر کو ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ بیت اللحم میں مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے حواریوں کے معیت میں تیس سال کی عمر میں یروشلم اور سمیریا کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے لئے منتخب کیا۔ بائبل کی مقدس تعلیمات کا نزول اُنہی کے ذریعہ ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ نے انسانیت کو سچے راستے پر لگایا۔ دنیا میں جن مقدس کتابوں یا آسمانی صحائف نے انقلاب بپا

کیا اُن میں بائبل بھی شامل ہے۔۔ شہنشاہ روم نے یسوع مسیحؑ کی تعلیمات کو بغاوت سے تعبیر کر کے انہیں پُجاریوں کے ذریعہ پکڑوا کر تختہ دار پر چڑھا دیا، اس آزمائشی گھڑی پر اُن کے ہاتھ بھی کیل ٹھونک کر بند کر دیے گئے تھے۔ اُن کے صبر و تحمل کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ وہ خدا تعالیٰ سے یہ التجا کرتے ہیں کہ ''اے خدا! انہیں معاف کر کیونکہ انہیں یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں''[1]۔ قرآن کریم کے مطابق وہ مرے یا مارے نہیں گئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کا درجہ بلند کر کے اُنہیں آسمانوں کا مکین بنا دیا۔

**ولادت گورونانک** :۱۴۶۹-۱۵۳۸ء سکھوں کے پہلے گورو شری گورونانک جی کا یوم پیدائش ہر سال منایا جاتا ہے۔ وہ ۱۴۶۹ء میں لاہور کے قریب تلونڈی میں پیدا ہوئے جسے آجکل گورونانک سے منسوب کر کے ننکانہ صاحب کے نام سے پُکارتے ہیں۔ یہاں اُس روز دنیا کے کونے کونے سے سکھ زائرین کا اجتماع ہوتا ہے۔ ہندوستان سے جانے والے عقیدتمندوں کے لئے ہند و پاک میں سرکاری سطح پر انتظامات کئے جاتے ہیں۔ اُنکے باپ کا نام کالو چند بیدی اور ماں کا ترپتا تھا۔ جو ہندوؤں کی کھشتری ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ گورونانک کی تعلیمات کو گرنتھ صاحب کا مقدس نام دیا گیا ہے۔ مسلم مراثی مردانہ آپکا تاحیات مصاحب رہ کر آپکے روحانی نغمات کو ساز کا روپ دیتا رہا۔ گورونانک مکہ اور مدینہ بھی گئے۔ وہ انسانی وحدت کے علمبردار تھے۔ کہتے ہیں ''دنیاوی لہو ولعب کو جلا ڈال، راکھ کو پیس کر اس کی سیاہی بنا، اپنے من کو قلم اور شعور و ادراک کو قلمکار اور وہ کچھ لکھتا جا جس کی کوئی انتہا نہیں اور جو لامحدود ہے''۔

[1] God fargive them as they do not know what they say

# پروفیسر سری کنٹھ توشخانی

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

سورگباشی توشخانی صاحب پر کچھ لکھتے وقت مجھے مرزا غالبؔ کے اس شعر کا سہارا اسلئے لینا پڑ رہا ہے کہ یہ ہمارے ناسازگار ماحول کا بھرپور ترجمان ہے جس کے زیر اثر توشخانی صاحب جیسے سینکڑوں انسانوں کی اپنی شخصیت کی تکمیل کے خواب شرمندۂ تعبیر ہونے سے رہ جاتے ہیں اور ہم اُن کی خداداد صلاحیتوں سے استفادہ کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ محرومی انفرادی نہیں۔ اجتماعی نوعیت کی ہوتی ہے جسکے لئے ہمارا ناقدر شناسی کا حاوی سماجی رُجحان ذمہ دار ہے۔ سری کنٹھ توشخانی سرینگر کے ایک متمول گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور ازل سے حساس طبیعت لے کے آئے تھے جسکی وجہ سے وہ ایک جگہ نہ ٹِک سکے، اور ایک ہی پیشہ کے ہو کے نہ رہے۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی کر کے وکیل ہوئے تو زیادہ دیر جم نہ سکے، کیوں کہ کامیاب وکیل کے لئے پیشہ ورانہ چالاکی کے داؤ پیچ کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوا جا سکتا۔ ناول ''کملا'' لکھا تو ادھورا رہ گیا۔ خواتین کی حالت زار پر ایک فلم بنوائی تو طاقِ نسیاں کی زینت بنی۔ کشمیری نثر کی طرف متوجہ ہوئے تو سلسلہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور ہم ان

انمول موتیوں سے تہی دامن رہے۔ مختصر یہ کہ توشخانی صاحب کی شخصیت ایک بھر پور، مربوط اور منضبط شخصیت نہیں تھی بلکہ ان کی ذات بھی عصری انتشار کی شکار رہی جسکی وجہ سے اُن کی انسانی ہمدردی و مروت کا جذبہ پورے انداز سے نکھر نہ سکا۔ بھلا ہو اُن کے حُب وطن اور کشمیری زبان سے والہانہ لگاؤ کا کہ وہ غیر ارادی طور ہی سہی بالواسط اور بلا واسط کشمیری زبان کے لسانی اور صوتیاتی پہلوؤں سے کماحقہ دِل چسپی لیتے رہے وہ کشمیری زبان کے موجود رسم الخط کے ارتقاء کے ہر مرحلہ سے وابستہ رہے جس کی بناء پر ان کا رول اس سلسلہ میں ایک زبان دان کی حیثیت سے ناقابل فراموش قرار دیا جاسکتا ہے۔

جناب موتی لال ساقیؔ توشخانی کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دستاویزی شواہد کے مطابق توشخانی صاحب کا جنم ۱۸۹۷ء میں سری نگر کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ہوا۔ مگر اپنی اصلی اور صحیح تاریخ پیدائش یا عمر کے بارے میں تفاصیل دینے سے وہ ہمیشہ کتراتے رہے توشخانی صاحب کو زمانے کے رواج کے مطابق اعلیٰ تعلیم سے سنوارا گیا۔ چنانچہ آپ نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ایل ایل بی۔کیا۔ تکمیل تعلیم کس سن میں ہوئی اس کے بارے کچھ معلوم نہیں البتہ اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ آپ ۱۹۲۳ء میں اننت ناگ میں وکالت کرتے تھے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے ۲۱-۱۹۲۰ء کے آس پاس تعلیم مکمل کی تھی۔ اسی زمانے میں آپ نے کشمیری نثر لکھنے کی ابتداء کی۔ اُنکی تخلیقی کاوشیں لاہور کے رسالے ''بہار کشمیر'' میں چھپتی تھیں۔ اسی رسالے میں کشمیری دیوناگری میں چھپتا تھا۔ مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے کے علاوہ آپ کے ناول ''کملا'' کی ایک دو قسطیں بھی اسی رسالے میں چھپی ہیں۔ حفظانِ صحت کے بارے میں ان کے

ایک کشمیری مضمون کا اقتباس ملاحظ ہو۔ یہ مضمون ''ژوتہ ژم'' کے نام سے چھپا ہے:

''مگر گُلس تہٕ منشس چھےٚ اکھ فرق۔ ژیرٕ گُل دیہِ
ژیرٕ پھُلے تہٕ ژنن پھُلے دِیہِ ژنی۔ منش نے کُنہِ خاص وگہِ
رٹہِ پانس ممکن چھُ پوٚنش گوٗ ھ ڈٔلتھ۔ امہِ کنٕ چھُ ضروری پننہِ
باپتھ کانٛہہ خاص آدرش ژھانڈُن''۔

دیوناگری میں کشمیری کی تمام آوازیں ادا نہیں ہو سکتیں۔ اس مشکل پر قابو پانے کیلئے توشخانی صاحب نے ۱۹۲۳ء میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ وہ پہلے شخص ہیں اپنے کام کی بنیاد توشخانی صاحب کے کام پر ہی رکھی۔

مندرجہ ذیل دیوناگری حروف ان مجوزہ تبدیلیوں کے ساتھ ملاحظہ ہوں:۔

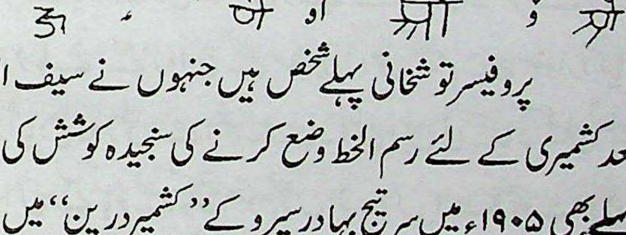

پروفیسر توشخانی پہلے شخص ہیں جنہوں نے سیف الدین تارہ بلی کے بعد کشمیری کے لئے رسم الخط وضع کرنے کی سنجیدہ کوشش کی۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی ۱۹۰۵ء میں سر تیج بہادر سپرو کے ''کشمیر درپن'' میں اسے موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ جہاں تک پیش رفت کا سوال ہے وہ نفی کے برابر تھی۔ توشخانی صاحب کو یار محمد خان پر اس لئے سبقت حاصل ہے کہ جہاں یار محمد خان نے بائبل کا ترجمہ کر کے کشمیری نثر کی ابتداء کی وہاں توشخانی صاحب نے طبع زاد کشمیری نثر کی مستحسن بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد انہوں نے نے کشمیری کے لئے رومن رسم الخط کو بین لاقوامی صوتیات کے معیار کے مطابق مرتب کیا۔ اُن سے پہلے سالگرام کول نے یوٗرپینوں کے لئے رومن میں کشمیری ریڈر تیار کئے تھے۔ لیکن

توشخانی صاحب نے جو ریڈر تیار کیا تھا وہ غیر ملکیوں کے لئے نہیں بلکہ کشمیریوں کے لئے تھا۔ یہ ریڈر کچھ عرصہ تک ویمنز ویلفیئر ٹرسٹ کے تحت چلنے والے سکولوں میں پڑھایا جاتا تھا۔ جسے رومن حروف میں ''اچھر مال'' (Achharmal) کے نام ۱۹۳۱ء میں کشمیر ویمنز ویلفیر ایسوسی ایشن نے سالگرام پریس سرینگر میں طبع کر کے جاری کیا۔ ملاحظہ ہوں چند اقتباسات،

| | | | |
|---|---|---|---|
| lav buad Sav | as vath | Gas av | Mol Maj |
| لأو بودساو | أس وَٹھ | گاش آو | مول مأج |

| | | |
|---|---|---|
| Kuang phulay laj | Kar thav syaz | Duod phyr |
| کونگ پھُلے لٔج | کأر تھوسیٔز | دود پھیر |

Sinis trav rung

سِنس تراو رنگ[1]

یہ کوششیں واضح وجوہات کی بناء پر قبول عام حاصل نہ کرسکیں۔ اولاً اس لئے کہ وادیٔ کشمیر کی اکثر آبادی ناخواندہ، پسماندہ اور مفلوک الحال تھی اور پڑھا لکھا محدود طبقہ بھی کشمیری زبان کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اسلئے اپنے مقدر اور مستقبل سے ناآشنا اکثریت توشخانی صاحب کے مثبت اقدام کو تحریک کا درجہ کیسے دے سکتی تھی۔ آج ۱۹۴۷ء کے پچاس سال بعد بھی حالت زیادہ نہیں بدلی ہے کشمیری زبان کو اب بھی نہ عوام کی پشت پناہی حاصل ہے اور نا ہی سرکاری سرپرستی۔ گنے چنے ادیب بھی اپنے مفادات اور اپنی اپنی مصلحتوں کے شکار

[1] توشخانی صاحب۔ موتی لال ساقی۔ شیرازہ اردو۔ جلد۔۲۲۔ شمارہ۔۱ (جنوری ۱۹۸۳ء) ص ۷۔۹۔ مطبوعہ جموں کشمیر کلچرل اکادمی

ہیں۔ وہ کوئی تحریک منظّم کریں تو کیسے؟ ان حوصلہ شکن حالات میں توشخانی صاحب کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے کہ اُنہوں نے گھُپ اندھیرے میں چراغِ راہ کا کام دیا۔

۱۹۴۹ء میں کشمیری رسم الخط وضع کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر ہوئی اس کے ارکان میں توشخانی صاحب بھی شامل تھے۔توشخانی صاحب نے اس دفعہ خطِ نسخ کی بنیاد پر کشمیری رسم الخط وضع کیا۔اس میں کشمیری صوتیات کو سمونے کی مقدور بھر کوشش کی گئی تھی۔اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ٹائپ بھی آسانی سے تیار ہوسکتا تھا۔اعراب کو حروفِ تہجی میں سمو کر رسم الخط کو ممکنہ حد تک سائنسی بنایا گیا تھا۔مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے دورِ حکومت میں رسم الخط ۱۹۵۳ء تک سکولوں میں رائج ہوا۔پہلی سے پانچویں جماعت تک اسی رسم الخط میں نصابی کتابیں بھی تیار ہوئیں۔[۱]

ظاہر ہے کہ ۱۹۵۳ء کی سیاسی تبدیلی کی وجہ سے کشمیری زبان کا مستقبل بھی تاریکی کے دلدل میں پھنس گیا۔ساری نصابی کتابیں محکمۂ تعلیم کے گوداموں میں برسہا برس تک سڑتی رہیں۔سائنسی بنیاد پر تیار کئے گئے اس رسم الخط کو خود ساختہ و مفاد پرست دانش وروں اور سیاست دانوں کے کشمیری زبان و کلچر سے نابلد انتظامی مشیروں نے ''لچہ دار کاشُر'' (دم دار کشمیری) کہہ کر تعلیمی اداروں وغیرہ سے اس طرح خارج کر دیا کہ اب اسے اپنی سرزمین بھی دُھتکار

[۱] توشخانی صاحب۔موتی لال ساقی۔شیرازہ اردو۔جلد ۲۲،شمارہ (جنوری ۸۳) ص۔۹۔(۱۹۴۸ء میں تشکیل دی گئی کمیٹی توشخانی صاحب کے علاوہ مرحوم جی اے عشائی،جے۔لال کول،مرزا عارف پر مشتمل تھی اور ۱۹۵۵ء میں قائم کردہ کمیٹی کے جنرل سیکرٹری ٹی۔این۔خزانچی تھے۔کشمیری رسم الخط کمیٹیوں کی تشکیل ۱۹۴۸ء،۱۹۵۲،۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۵ء میں عمل میں لائی گئی۔

(Studies in kashmiri :J.L.Kaul . page 23.21

رہی ہے کہ جاتو کون ہوتی ہے میری چھاتیوں کو چھونے والی......!

اس طرح سے کشمیری زبان کے ساتھ اپنی ہی سرزمین پر سوتیلی ماں کا سلوک ہوتا رہا۔ لیکن یہ سخت جان (ہماری مادری زبان) جو ٹھہری۔ ارباب اختیار کو احساس جرم تو ہوتا رہا اور جو کلیدی کوششیں توشخانی صاحب کر چکے تھے وہ بالآخر بار آور ثابت ہوئیں اور دسمبر ۱۹۵۳ء میں ایک اور کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا نام کشمیری تکمیل کمیٹی (Kashmiri PERFECTING Committee) رکھا گیا۔

اسی کمیٹی کی سفارشات پر ہمارا موجودہ مروجہ رسم الخط وجُود میں آیا۔ اس طرح توشخانی صاحب کو مروجہ کشمیر رسم الخط کی ترتیب و تشکیل میں کلیدی حیثیت حاصل ہے ۱۹۵۵ء میں ایک اور رسم الخط کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔

بے محل نہ ہوگا اگر ۱۹۵۳ تک توشخانی صاحب کے وضع کردہ اور رائج شدہ رسم الخط سے تھوڑی سی شناسائی حاصل کی جائے۔

أری تاہ کھاری ژارٕی زٕتھی ناری کھوان سال

(أری تہٕ کھٔری ژأری) (زٕتھی ٔزری کھوان سال)

ساندی جِ دوان زالٕی تیتی کاتی پکن ساتی

(ٔسندی جہِ دوان زأ لی) (تیتیٕ کتی پکن ٕستی)

کوکار چھے تچھان تاپوتی چھ ہے چھان ضِد گچھ ناہ کرُن

(کوٕ کر چھِ تچھان تہٕ پٔوتی چھِ ہچھان) (ضِد گژھ ہِنہٕ کرُن

تس چھُ چھمہ ٹ قد

(تس چھُ ژھوٗٹ قد)

ریاضی کی نصابی کتاب جو مرتب کی گئی تھی اس میں درج کچھ قابل قبول اصطلاحیں ذیل میں دی جاتی ہیں:-

| | | | |
|---|---|---|---|
| تقسیم | بأگرن/باگے | حاصل تقسیم | باگیہ پھل |
| ضرب | گوٗنن | حاصل ضرب | گوٗنن پھل |
| جمع | سومبرٕن/پٔشرٕن | تفریق | والُن |
| حل کیجئے (SIMPLIFY) | | | ژوٗمرٕو |

یہی وہ مثبت پس منظر تھا جس کے پیش نظر توشخانی صاحب کو نومبر ۱۹۶۶ء میں کلچرل اکیڈیمی کے ڈکشنری پروجکٹ کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اس سے قبل وہ محکمۂ تعلیم میں فلاسفی کے پروفیسر رہ چکے تھے اور بہت پہلے ملازمت سے رٹائر ہو چکے تھے۔ ان کی نگرانی میں ''لفظ راش'' کے نام سے کشمیری ڈکشنری کی پہلی جلد ۶۹۔۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی جسے بعض تکنیکی کوتاہیوں کی بنا پر جاری ہونے سے روک دیا گیا اور بعد میں تلف کر دیا گیا۔ موجودہ کشمیری، کشمیری ڈکشنری کی ترتیب وتدوین کا کام، جو سات جلدوں پر مشتمل ہے، ۱۹۷۹ء تک مکمل ہوا۔ جسکے بعد توشخانی صاحب ۱۹۸۰ء میں اکادمی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اُن کا یہ نہایت ہی اہم کارنامہ جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کی زیر سرپرستی کشمیر زبان وادب کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ اُردو، کشمیری فرہنگ، جس کے ساتھ اُنکی نگرانی میں وابستہ رہنے کی سعادت مجھے حاصل ہے بھی ۸۲۔۱۹۸۱ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ یہ بھی بارہ جلدوں پر مشتمل ہے ان دونوں فرہنگوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں الفاظ کے ساتھ ساتھ مواخذ بھی دیئے گئے ہیں جن سے اُنکی سائنسی بنیاد مستحکم ہوتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان لغات میں بعض الفاظ شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اس بارے میں عرض ہے کہ زندہ زبانوں کے ذخائر الفاظ کا دامن کبھی

[1] توشخانی صاحب۔ موتی لال ساقی۔ شیرازہ اُردو۔ جلد۔ ۲۲ شمارہ ۱۔ (جنوری ۱۹۸۳ء) ص ۱۰۱۔ مطبوعہ جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی۔

نہیں سمٹتا اس لئے یہ اگلی نسلوں کا فرض ہے کہ وہ اس اہم کام کو آگے بڑھائیں۔

جموں و کشمیر میں ۱۹۵۸ء میں کلچرل اکادمی کا قیام ایک فال نیک تھا۔ اگر ایسا نہیں ہوتا، تو توشخانی صاحب کی فرہنگ سازی اور زبان دانی کی خداداد صلاحیتوں سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور اُن کی شخصیت یہاں بھی تشنہ تکمیل ہی رہتی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں مئی ۱۹۶۷ء میں اکادمی کے شعبۂ لغت سے وابستہ ہوا کہ توشخانی صاحب الفاظ کے معانی اور مترادفات و مواخذ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے معمولی سے معمولی آدمی کا مشورہ بھی خندہ پیشانی اور تشکر کے ساتھ قبول کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداً شعبۂ لغت کا سارا عملہ ایک ہی وسیع کمرے میں مل بیٹھ کر کام کرتا۔ راقم کے علاوہ ایڈیٹوریل سٹاف مرحوم نند لال کول طالبؔ، محمد احمد اندرابی، چمن لال چمن، محمد احسن احسنؔ، موتی لال ساقیؔ اور بشیر اخترؔ پر مشتمل تھا۔ ڈکشنری کا یہ شعبہ صحیح معنوں میں ایک تربیت گاہ تھی جہاں الفاظ کے باریک سے باریک معانی کی تہہ تک پہنچنے کی مسلسل اجتماعی سعی ہوتی تھی، توشخانی صاحب پیرسالی کے باوصف الفاظ کے مختلف صوتیاتی انداز عملاً دکھانے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ آنجہانی طالبؔ صاحب کا حیوانِ ظریف کبھی کبھی جاگ اُٹھتا اور وہ کہہ اُٹھتے۔ Don't take ti serisously" You are paid for entertianment" (اس کام کو سنجیدگی سے نہ لیجئے۔ آپ کو تفریح کے لئے تنخواہ ملتی ہے)۔

لغت سازی کا کام مکمل ہونے کو تھا تو کشمیر قاموس Encyclopaedia Kashmiriana ترتیب ہاتھ میں لی گئی۔ توشخانی صاحب نے بھی ''مارتنڈ'' پر کشمیری میں ایک نوشتہ (Entry) لکھا جو ان کی آخری تحریر بھی ہے اور یادگار بھی۔ چاہئے یہ انسائیکلوپیڈیا کے لئے موزوں و مناسب ہو یا نہ ہو۔

"انت ناگہ پٹھہ پانٛژہ میل دۆر، پہلگامچہ موٹر وتہ چھُ اکھ مشہوٗر تیرتھ مٹن، امہ پٹھہ گژھن اکہ تھزِ وُڈِ رہٕنز تالہِ پٹھ (آسن گوٚژھ کھوتہِ منز) چھُ مارتنڈ مندر، زنتہٕ شاہ تختس بہتھ، لگ بگ ساڈ وبہوشتوٗری یو پٹھ اُکس سوندر اُندس پکھس رۆزتھ۔ شمالہِ کنہِ چھس سز پوشہِ ماٰ دانوتہٕ کھوٚمزٕی گرٕزتہٕ تاپس منز برزٕ ونہِ کولہِ گرایہ ماراں تہٕ بروٚنہہ بروٚنہہ لاران۔ مندرس دۆرسرِ یہ لوسنہٕ طرفہٕ چھےٚ سنگر مالہٕ شینہٕ دستار ووٚڈِتھ آفتابہٕ نیروُنے گاہ تراوان تہٕ مارتنڈس یاسِری یس وُچھ وچھ پھولان[۱]۔

گندمی چہرہ، میانہ قد، دودھیلان بدن، سڈول اعضا سر پر جھر جھرے سفید بال، طوطے کی چونچ جیسی خوبصورت ناک۔ اس حلیہ والی شخصیت اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ توشخانی صاحب اعلیٰ پایہ کے ذوق جمال کے قائل تھے۔ وہ اچھا پہنتے تھے چاہے وہ بوٹ ہوتا، گھڑی ہوتی یا جیکٹ جب وہ اکادمی میں ملازم ہوئے تو اس وقت نیک ٹائی اور ہیٹ کا استعمال ترک کرچکے تھے۔ انہوں نے سگریٹ اور پائپ پینا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جو کوئی بھی کپڑا پہنتے، صاف وشفاف پہنتے، رنگ کے لحاظ سے شیب وشباب کی تمیز نہیں برتتے۔ وہ اکثر غصہ پی جاتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ذراسی بات پر جھنجلاتے[۲]۔ انہوں نے

[۱] توشخانی صاحب۔ موتی لال ساقی۔ شیرازہ اردو۔ جلد ۲۲، شمارہ ۱۔ (جنوری ۱۹۸۳ء) ص ۱۴۔ مطبوعہ جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی

[۲] جہاں تک میں اُنکی اس کیفیت کا تجزیہ کرپایا ہوں مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں یا افسران بالا کے روبرو حق بات کہنے یا انہیں confront کرنے کا یا تو حوصلہ نہیں رکھتے تھے یا پھر ازراہِ مروت یا مصلحتاً ایسا نہیں کرتے تھے۔ اسے ہمارے کچھ رفیق کاران کی کم ہمتی حتیٰ کہ بزدلی سے بھی تعبیر کرتے تھے۔

سادگی اور کم خوری کو اپنا شعار بنایا تھا۔ اعتدال کا دامن تھامے رکھا تھا۔ جس شادی بیاہ پر لین دین ہوتا وہاں جانے سے احتراز کرتے۔ سماجی بدعتوں کے کٹر مخالف تھے۔ حریص تو نہیں تھے لیکن اپنا حق چھوڑنا کارِثواب نہیں جانتے۔ شاید اسی لئے ہر سال موسم خزاں میں کاشتکاروں سے دھان کا اپنا مالکانہ حصہ وصولؔ کرنے جاتے تھے۔ زندگی کے آخری ایّام تک سائیکل سواری کرتے تھے۔ شاید اس لئے کہ وقت پر دفتر پہنچ پائیں اور احساس پیری کو بھی شکست دیں۔ تحقیق کو عبارت گردانتے۔ اپنی صحیح عمر بتانے سے وہ ہمیشہ ہی احتراز کرتے، یہاں تک دفتر سے مسلسل تقاضے کے باوجود میٹرک پاس کرنے کی اپنی سند پیش کرنے سے کتراتے رہے۔ حالانکہ عام مشاہدہ ہے کہ صحیح عمر ظاہر نہ کرنے کی کمزوری عورت ذات میں عام ہے۔ انسانی ہمدردی سے ان کا دل لبریز تھا اپنے آپ کو کسی بھی مذہب سے الگ گردانتے ہوئے بھی وہ اپنا ایک مذہب رکھتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ کے خلاف کشمیر سازش کیس (مقدمہ) میں وہ بھی ایک سرکاری گواہ تھے[1]۔ بہترین مقرر تھے اور ضدی بھی۔ وہ شدت سے نظم وضبط کے قائل تھے۔ شاذ و نادر کھُلنے پر آتے تو ساری حدیں پھاند جاتے اور محفل کو زعفران زار بناتے۔ اوقات کار کے دوران کبھی اُن پر نیند کا اتنا غلبہ ہوتا کہ خراٹے لینے لگتے۔ عمر کا بھی کچھ ایسا ہی تقاضا تھا۔

[1] اس کے بارے میں ہم نے اُن سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ انہیں شاید حیدرآباد سے بلایا گیا اور ایک اُردو شعر کی تشریح کرنے کو کہا گیا۔ جو شیخ صاحب نے اپنی ایک تقریر میں برتا تھا۔ اُن سے پوچھا گیا تھا کہ کیا اس سے لوگوں کو بڑھکایا جاسکتا ہے تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ توشخانی صاحب کو عدالت میں آنے کیلئے کوئی D.A/T.A وغیرہ نہیں دیا گیا۔ جب ان سے ہم نے پوچھا کہ وہ تو فلاسفی کے پروفیسر تھے پھر اُن کو اُردو شعر کی تشریح کرنے کے لئے کیوں بلایا گیا تو وہ کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے پائے۔ کہا بس بلالیا، میں کیا کرتا؟

کشمیری زبان کے علاوہ، جو اُن کی مادری زبان تھی، ہندی، سنسکرت، اُردو اور انگریزی پر بطور خاص دستگاہ رکھتے تھے۔ پہلے بھی اکادمی کے لئے کشمیری کے معروف شاعر پرمانند پر ایک مونوگراف لکھا تھا اور اُس کے بعد اکادمی میں آکر بھی موتی لال ساقیؔ کے تعاوُن سے پرمانند کی کلیات (دوسری جلد) ترتیب دی۔ اکثر پرمانند کا یہ شعر گنگناتے ؎

لاٗرن کینہٕ نتہٕ کوتاہ لاٗرن

تھاٗرن پاٗنۍ پان آسی یے

(یہ جدوجہد اور یہ تنگ و دَو کتنی، اور حاصل کچھ نہیں، صرف تمہاری اپنی ذات ہے، جو داؤں پر لگی ہوگی)۔

جب کبھی موڑ میں ہوتے تو ماسٹر زندہ کول کی نظم ''ناتیاری'' جھوم جھوم کے سناتے۔ توشخانی صاحب کا حلقہ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا۔ لیکن ہندوستان کے ممتاز زبان دانوں بالخصوص سُدھیشور ورما سے ان کے قریبی روابط تھے۔ توشخانی صاحب ملک کی اہم لسانی کانفرنسوں اور سمیناروں میں ریاست کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ مرکزی سرکار کے سابق وزیر داخلہ گلزاری لال نندہ آپ کے پکے دوست تھے۔ جب وہ کشمیر آتے تو شخانی صاحب سے ملے بغیر واپس نہیں جاتے[1]۔

توشخانی صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ دونوں بیویاں یکے بعد دیگرے اللہ کو پیاری ہوئیں۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹا تھا جو عنفوانِ شباب ہی میں توشخانی صاحب کو داغ مفارقت دے گیا۔ اسی کے بطن سے ہوئی لڑکی لکھنو میں بیاہی گئی۔ دوسری بیوی سے تین بچے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہوئے

[1] توشخانی صاحب۔ موتی لال ساقی۔ شیرازہ اردو، جلد ۲۲، شمارہ ۱۔ جنوری ۱۹۸۳ء ص۔ ۱۵۔ مطبوعہ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی

ڈاکٹر ششی شیکھر توشخانی کے نام سے سبھی واقف ہیں۔ ششی شیکھر کو عہد بڈشاہی کے مشہور کشمیری ہندی شاعر بھٹ اوتار کی بانا سُرو پر کتھا پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ وہ آج کل دلی میں مقیم ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ توشخانی صاحب فطرتاً یاسیت پسند تھے البتہ دونوں بیویوں اور ایک جوان بیٹے کے داغِ مفارقت کی وجہ سے وہ خلوت پسند ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر ہی میں سنیاس دھار لیا تھا۔ وہ اعلیٰ پایہ کی وضعداری کے قائل تھے اور کسی کے لئے بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے[1]۔ مردم گزیدگی سے کون حساس طبعیت آشنا نہیں۔؟

کشمیر میں خواتین کی بہبودی کا جھنڈا سب سے پہلے آفتاب کول نظامت (ڈاکٹر سالگرام کول کے والد) نے اُٹھایا تھا۔ مگر اس تحریک کو توشخانی صاحب ہی نے منظّم کیا جس کے نقوش آج بھی وسنتا گرلز سکول کی صورت میں نمایاں ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں انہوں نے ہندو ہائی سکول کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ خواتین کی حالتِ زار پر پہلی فلم ۱۹۲۹ء میں توشخانی صاحب نے ہی بنوائی جس میں نمایاں رول شری ٹی۔این کول (سابق سیکرٹری جنرل وزارت خارجہ وموجودہ سفیر حکومت ہند، سوویت یونین) نے ادا کیا تھا۔ اس فلم کی نمائش صرف ایک بار ہوئی جب اسے سرینگر میونسپلٹی کے دفتر میں دکھایا گیا تھا۔

توشخانی صاحب کو نو دولتیوں کے اس رجحان سے بھی سخت نفرت تھی جس کے زیرِ اثر وہ کشمیری میں بات چیت کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں اور بچوں، بچیوں کو پنکی، پپو، پرنسی جیسے غیر مانوس ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ انہیں اب

[1] توشخانی صاحب کا معمول تھا کہ وہ اپنے کھانے پینے کے برتن خود دھوتے تھے ہم نے دفتر میں اوقات کار کے دوران بھی دیکھا ہے کہ وہ تھرماس میں اپنے لئے دودھ یا چائے ساتھ لاتے۔ اگر انہیں پیاس لگتی تو پانی ہمیشہ ہی اُبال کر پیتے اور برتن وغیرہ سٹرلائز کرتے۔

بھی دپدر (Sky lark)، ببر (ریحان)، ٹیج (ابابیل) جیسے روایتی اور پیارے ناموں میں فطری کشش محسوس ہوتی تھی۔ وہ ویشنوی تھے ان کے فرزند ششی شیکھر توشخانی نے یہ روایت قائم رکھی ہے۔

توشخانی صاحب تھیوسوفسٹ تحریک اور تھیوسوفیکل سوسائٹی آف انڈیا کی صدر مسز اینی بیسنت کے زبردست مداح تھے تھیوسوفسٹ تحریک کے ساتھ آپ کا تعلق اُس زمانے میں بھی رہا جب[1] وہ کشمیر چھوڑ کر پونا میں سنیاسی کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس تحریک کا اثر انہوں نے یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے دوران ہی قبول کیا تھا۔ جو ان کی زندگی کے آخری لمحات تک قائم رہا۔ چنانچہ وہ ہر سال سرما میں دو مہینے کی چھٹی لے کر جنوبی ہندوستان جاتے تھے اور وہاں مشہور عالم تھیوسوفسٹ شری کرشنا مورتی کے خطبات سے محفوظ ہو کر واپس آتے تھے۔ وہ اسی بہانے کسی معتبر معالج سے اپنی صحت کی جانچ بھی کراتے تھے۔ چنانچہ وہ حسب معمول جنوبی ہندوستان جاتے ہوئے دہلی میں شادی کی ایک تقریب میں شرکت کرنے کے لئے رُکے تھے کہ سیڑھیاں اُترتے پھسل پڑے۔ ان کو فوراً ہسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ ۳/۲ دسمبر ۱۹۸۱ء کو سورگ سدھارے[2]۔ ان کے آخری رسوم دہلی میں ہی ادا کیئے گئے جو وہ چاہتے تھے وہی ہوا۔ زندگی بھر کسی کا احسان نہیں اُٹھایا۔ ان کے مرتے وقت بھی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور وہ اپنی روایتی وضعداری قائم رکھتے چلے گئے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جہاں انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کشمیری زبان کے لئے وقف رکھی وہاں ان کا بیٹا صرف ٹھیٹھ ہندی میں بات کرنا باعث

[1] توشخانی صاحب۔ موتی لال ساقی۔ شیرازہ اُردو، جلد ۲۲، شمارہ: ۱۔ جنوری ص۔ ۱۵

[2] توشخانی صاحب۔ موتی لال ساقی۔ شیرازہ اُردو، جلد ۲۲، شمارہ: ۱۔ جنوری ص۔ ۵۰ مطبوعہ جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی

فخر سمجھتا ہے۔

ڈاکٹر ششی شیکھر کی اطلاع کے مطابق اُن کے سرگباشی والد سری کنٹھ توشخانی کشمیری زبان کے لسانیاتی مطالعہ کا منصوبہ (جس میں کشمیری زبان کی گرامر ترتیب دینا بھی شامل تھا) ہاتھ میں لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جس کا ابتدائی خاکہ انہوں نے تیار کر کے رکھا تھا صرف چھٹیاں گذار کر جنوبی ہند سے واپس آنے کی دیر تھی کہ مجوزہ منصوبہ پر کام شروع ہوتا۔ کسے معلوم تھا کہ توشخانی صاحب یہ بہت اہم کام بھی ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی ہم سے جُدا ہوجائیں گے۔ بقولِ فانیؔ بدیوانی ؎

اے موت تُجھ پہ عمرِ ابد کا مدار ہے
توٗ اعتبارِ ہستئ ناپائدار ہے

☆☆☆☆

# جہانگیر اور کشمیر

مغل شہنشاہ محمد سلطان سلیم، نورالدین جہانگیر (۱۵۶۹ء۔۱۶۲۷ء)[1] نے کشمیر کو بجا طور جنت ارضی قرار دیا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است ہمیں است

اور شاید اسی لئے وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مارچ ۱۶۲۷ء کے دوران چہیتی بیوی نوٗر جہاں، آصف خان، شہر یار اور دوسرے مصاحب کے ساتھ لاہور سے کشمیر آیا تا کہ عرفی کے شعر کا خود عملی روپ دھار سکے[2]۔

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مُرغ کباب است کہ با بال و پر آید

اور جہانگیر نے کشمیر ہی کو گوشہ، آخرت بنانے کی تمنا بھی کی تھی۔

از شاہِ جہاں گردم نزع چو جُستند
باخواہش دل گفت کہ کشمیر دِگر ہیچ

مشیت ایزدی کو شاید اس طور منظور تھا کہ جہاں گیر نے اکتوبر ۱۶۲۷ میں کشمیر سے واپسی پر جان آفرین اپنی جان سپرد کر دی۔ بقول غالبؔ

جان دی، دی ہوئی، اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے ادا نہ ہوا

[1] تاریخ جہانگیر۔ ڈاکٹر بینی پرشاد (ترجمہ رحم الہاشمی۔ ترقی اُردو بورڈ۔ ۱۹۷۹۔ صفحہ ۱۱۔ ۴۲۱۔ ۲۔ ایضاً صفحہ ۴۱۹

جان جہاں دینی تھی دی ۔ موت کو بھی بہانہ چاہئے ،وہ دن بدن نڈھال ہوتا گیا، یہاں تک کہ شاہ سواری کے قابل بھی نہ رہا۔ وہ پالکی کے سہارے ہی اِدھر اُدھر جا سکتا تھا۔ لیکن زندگی کے آخری لمحات کے بیت جانے کے ساتھ ساتھ وہ سرگرم سفر بھی رہا چنانچہ کشمیر سے واپسی سفر پر جب وہ بیرم کلا[1] پہنچا جو اُس کی پرانی شکارگاہ تھی تو اُسکا جی چاہا کہ وہاں ایک مرتبہ پھر شکار کھیلے اور جیسا ثابت ہوا یہی اُسکا آخری شکار تھا۔

جہانگیر نے اپنی توڑے دار بندوق ایک دیوار سے لگا کر کھڑی کر دی جو اسی لئے بنی تھی اور ایک ہرن کو نشانہ بنایا جسے گاؤں کے لوگ اُسی طرف ہنکار رہے تھے۔ ایک پیادہ سپاہی جو بادشاہ کے لئے شکار مہیا کرتا تھا ڈھلوان پہاڑی کے سرے پر کھڑا تھا۔ اُسکا پیر پھسل گیا اور پہاڑی سے نیچے گر پڑا۔ اُس کی ہڈی پسلی چور چور ہو گئی۔ اس حادثہ سے بادشاہ کو سخت صدمہ ہوا۔ اُس نے مرنے والے کی ماں کو بلا کر اُسکی گذر بسر کے لئے روپیہ دیا مگر اُس کی پشیمانی اور دکھ میں کسی طرح کی کمی نہ ہوئی اور اُس نے خیال کیا کہ یہ خود اُس کی موت کی آمد کا پیش خیمہ ہے۔ موت کا خیال برابر اُس کے ذہن پر حاوی رہا اور

[1] اس جگہ کا نام بہرام گلا یا گلی ہے۔ رچرڈ ٹمپل نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ یہ بڑی خوبصورت جگہ ہے اور میں نے جہاں جہاں قیام کیا اُن میں سب زیادہ زا اچھی ہے اسکے قریب پہاڑی سے تیز دھار کا آتا ہوا چشمہ چٹا پانی (جسے سفید پانی کہتے ہیں) یہی دلربا اور سیماب پا آبشار "نوری چھم" کے نام سے مشہور ہے۔ "نوری" اسے "نور جہاں" کی نسبت سے کہتے ہیں "چھم" گوجری زبان میں آبشار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ دونوں الفاظ کے اتصال سے نوری آبشار بنتا ہے جو شہنشاہ جہانگیر نے اپنی چہیتی ہے۔ ملکہ نور جہاں سے منسوب کیا تھا۔ کول سر اور کٹورہ سر جھیلوں سے نکل کر اور یہاں آ کر اسی فٹ کی اونچائی سے گرتا ہوا یہ صاف وشفاف پانی نہایت ہی دلربا آبشار کی شکل اختیار کرتا ہے۔ آبشار کے عین مغرب واقع پہاڑی پر شہنشاہ جہانگیر نے ایک قد آدم آئینہ اس طرح نصب کروایا تھا تا کہ سامنے والے ایک اور آئینہ میں محو آرائش ملکہ نور جہاں کا حُسنِ مجسم، حُسن فطرت سے ہم آغوش ہو کے جلوہ افروز ہوتا تھا جس سے جہانگیر کے ذوق جمال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے (پونچھ۔ کے۔ ڈی مینی۔ مطبوعہ ۱۹۸۰ء)

وہ مایوسی میں ڈوب گیا۔ اُس کی بیماری نے ہمیشہ سے زیادہ سنگین صورت اختیار کرلی۔ اُسے ایک لمحہ کے لئے نیند آتی اور نہ سکون ملتا تھا۔ اس حادثہ کے دوسرے دن شاہی خیمہ تھانہ[1] میں نصب ہوا۔ اگلی منزل راجوری تھی۔ ۲۷؍صفر ۱۰۳۷ھ مطابق ۲۹؍اکتوبر ۱۶۲۷ء کووہ بھیم بھار کے قریب چنگیز ہٹلی کی طرف روانہ ہوگیا اُسی[2] رات اپنی فرمانروائی کے بائیس سال اور عمر کے اٹھاون سال پورے کرکے جان بحق ہوا[3]۔ یہاں سے اُس کے جسدِ خاکی کو نور جہاں کے باغ شاہدرہ لاہور لے جایا گیا۔ جہاں اُسے چُپ چاپ سپرد خاک کیا گیا۔ نورجہاں نے اپنے خرچہ سے وہاں ایک شایان شان مقبرہ تعمیر کرایا۔

جہاں گیر ۱۰۱۴ھ (مطابق ۱۶۰۵ میلادی) ہر سال کشمیر آتا رہا۔ لیکن مارچ تا اکتوبر ۱۶۲۰ء اُس کا پہلا سات ماہ کا قیام اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس دوران میں اُس نے کشمیر کے قدرتی حُسن کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے باوجود صحت ک خرابی کے جہانگیر یہاں کے قیام سے بہت لطف اندوز ہوا۔ اُس نے یہاں کے جتنے بھی تفریح اور خوبصورتی کے مقامات تھے سب دیکھے۔ جیسے کہ ایک فطرت کا گہرا مطالعہ کرنے والے حُسن پر بت سے توقع تھی۔ وہ کشمیر کی تعریف لکھنا چاہئے تو پوری کتاب کی ضرورت ہوگی۔ کشمیر ایک سدا بہار باغ ہے جو شاہی محل کا ایک آہنی قلعہ اور درویشوں کے لئے ایک پھولوں سے لدا ہو دلفریب گوشہ ہے۔ اس کے خوبصورت مرغزار دلکش چشمے، بے شمار فوارے تعریف سے بالاتر ہیں۔ یہاں بے شمار بہتے ہوئے دریا اور آبشار ہیں جہان تک نظر جاتی ہے سبزہ زار اور پھول ہیں۔ سرخ گلاب بنفشہ اور نرگس از خود

[1] تھنہ منڈی، [2] یہ جگہ آج کل چنکس سرائے کے نام سے مشہور ہے اور سر رچرڈ ٹیمپل نے بھی ۱۸۵۹ء میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ شاہی قیام گاہ تھی۔ [3] تاریخ جہانگیر صفحہ: ۴۲۰۔ ۴۲۱

اُگے ہیں۔ میدان میں طرح طرح کے پھول اور خوشبودار گھاس ہے جس کا شمار نہیں ہوسکتا۔ روح پرور موسم بہار میں پہاڑ اور میدان پھولوں سے بھر جاتے ہیں اور دروازے، دیواریں اور صحن لالہ زار ہوجاتے جہاں ضیافت کا دستر خوان سجانے والے گلِ لالہ جگمگاتے ہیں۔ ان وسیع مرغزاروں اور خوشبودار پھولوں کا ہم کیا بیان کریں[1]۔ یہ جمال پرست بادشاہ پھول چُننے میں بھی مسرت محسوس کرتا تھا۔ ایک اور جگہ وہ یوں رطب السان ہے۔

> ''اس پھولوں سے بھری ہوئی سرزمین کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، جہاں تک نظر جاتی ہے۔ ہر رنگ کے پھول لہلہاتے ہیں۔ میری موجودگی میں پچاس قسم کے پھول چُنے گئے۔ شاید ان کے علاوہ اور بھی ہونگے جو میں نے نہیں دیکھے''[2]۔

اَچھبل کا ذکر کرتے ہوئے جہانگیر نے لکھا کہ اِسکا چشمہ (مچھی بھون، یعنی مٹن) چشمہ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اس کے گرد فلک بوس چنار درخت کھڑے ہیں جن کے سر باہم مل کر خوشنما شامیانے کی جگہ بناتے ہیں۔ ایک خوبصورت باغ میں جہاں تک نظر جاتی ہے۔ جعفری کے پھول کھلے ہیں گویا یہ بالکل جنت کا ایک ٹکڑا ہے[3]۔

پھر چشمہ ویری ناگ کا ذکر ہے جو جہلم کے سرے پر ایک پہاڑی کا دامن میں واقع ہے جہاں اپنی شہزادگی کے زمانے میں جہانگیر نے یا ایک عمارت تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ تالاب کا پانی شفاف ہے

1. تزک جہانگیری۔ راجیرس و بیوریج۔ صفحہ ۱۴۲۔۱۴۴۔ جلد دوم
2. ایضاً۔ صفحات ۱۶۲۔۱۶۳۔ 3. ایضاً صفحہ ۱۷۳ اس

اور چار گز (بارہ فٹ) گہرا ہے۔ نہر کی خوبصورتی اور چشمہ کے نیچے گھاس اُگتی ہے اُسکی سرسبزگی کی کہاں تک تعریف کی جائے۔ مختلف قسم کے پودے اور خوشبودار گھاس یہاں بہ کثرت اُگتی ہے اور اس میں ایک پودے کی ڈنڈی نظر آئی جو ہو بہو مور کی دم کی طرح مختلف رنگوں کی تھی۔ وہ چشمہ کی لہروں میں بل کھاتی تھی اور کہیں کہیں اس میں پھول بھی تھے۔ مختصر یہ کہ سارے کشمیر میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی اور جگہ نہیں جو اتنی دلفریب ہو۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں وادی کا اوپری حصہ جتنا خوبصورت ہے اُس کا نشیبی حصہ کی خوبصورتی سے کوئی مقابلہ نہیں۔ ان علاقوں میں کچھ دن قیام کرنا چاہئے اور قرب وجوار کے مناظر دیکھنے چاہیں۔ میں نے حکم دیا کہ اس چشمہ کے گرد چنار کے درخت لگائے جائیں[1]۔

ویری ناگ کے حُسن فطرت کی تعریف کرتے ہوئے جہانگیر کمراز پر مراز کی فطری برتری کی طرف صریح اشارہ کرتا ہے۔ مناظر فطرت، دریاؤں، دیہاتوں، وادیوں، پہاڑیوں، پودوں، پھولوں، پرندوں، جانوروں اور لوگوں کا جو حال اُس نے لکھا ہے وہ نہایت شستہ رواں اور خوبصورت فارسی میں ہے جسے لفظ بہ لفظ معاصر مؤرخین جیسے معتمد خان، اور کامگار نیز بعد کے مؤرخین جیسے خافی خان، سجان رائے اور دوسروں نے نقل کیا ہے اور آج بھی وہ دلچسپی اور لطف سے پڑھا جاسکتا ہے[2]۔

پرگنۂ لار کے صفاپور گاؤں خاصکر جھیل مانسبل کی بھی وہ بڑی تعریف کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس جھیل کے شمال میں درختوں سے بھری پہاڑی ہے یہ درخت جھیل میں اپنے عکس سے ایک دلفریب سماں باندھتے تھے۔ کیوں کہ

[1] تزک جہانگیری ص:۱۷۴۔ [2] تزک جہانگیری۔ جلد دوم۔ صفحہ:۱۷۶۔ راجرز وبیورج

خزاں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ خزاں کا حُسن و جمال بہار کے حُسن بوقلموں سے کچھ کم نہیں۔ جہانگیر یہاں کئی روز مرغابیوں کا شکار کرتا رہا۔ پامپور (چند ہار کریوہ) کے زعفران کے شگوفوں کی بہار دیکھنے بھی گیا۔ جہانگیر تفصیل سے بتاتا ہے کہ زعفران کے پھول کے کتنے حصے ہیں اور یہ کتنی پتیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی کاشت کیسے کی جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس وقت زعفران کی پیداوار تین ہزار دو من خراسانی ہے۔ رسم یہ تھی کہ زعفران کی نصف پیداوار حکومت وقت کو پیش کی جاتی تھی اور بقیہ نصف کا حقدار کاشتکار ہوتے تھے، جو مروجہ ضابط کے مطابق زعفران چن کرلاتے اور اپنے نصف حصہ پیداوار کے عوض نمک لیتے تھے، جو وہ اپنی مزدوری تصور کرتے تھے[1]۔

زعفران کے شگوفوں کی مہک سے سر درد ہونے کے سلسلے میں پوچھے جانے پر کارکن کشمیریوں نے نفی میں جواب دیا۔ آگے چل کر لکھتا ہے کہ کشمیری عورتوں میں صاف اور پاکیزہ لباس پہننے ک رسم نہیں۔ پٹو کا کرُتہ سلوانے ہیں جو تین چار سال تک پہنتے ہیں اور پھٹنے تک اسے پانی دیکھنے تک کی نوبت نہیں آتی۔ پاجامہ پہننا عیب سمجھتے ہیں۔ کشمیری اگرچہ دریا کے کنارے پر رہتے ہیں تاہم پانی بوند بھی اُن کے جسم کو نہیں چھوتی۔

اُبلے چاول جسکو ''بھتہ'' کہتے ہیں رکھ دیتے ہیں اور سرد ہونے پر کھاتے ہیں۔ گرم غذا کھانے کی انہیں عادت نہیں۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ اکبر کے زمانے سے پہلے کشمیر میں پست قد گھوڑا ہوا کرتا تھا جسکو اُن کی زبان گونٹ کہتے تھے۔ قد آور اور تیز رفتار گھوڑوں کا رواج یہاں تب ہوا جب اس نسل کے گھوڑے عراق ترکی سے تحفے کے طور پر بھیجے گئے اور پھر اِن سے قد آور تیز

[1] تزک جہانگیر۔ جلد دوم صفحہ: ۱۷۶۔ راجرز بیوریج۔

رفتار گھوڑوں کی نسل معرض وجود میں آئی ۔ جہانگیر اس بات کو دہراتا ہے کہ مرزا حیدر دوغلات نے کشمیر کی صنعت و حرفت کو بڑی ترقی دی۔ اُس کا یہ بھی کہنا ہے کہ کشمیر میں اہل حرفہ اور سوداگر سُنی فرقہ کے لوگ ہیں اور شیعہ لوگ جو امامیہ اور نور بخشیہ فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں سپہ گری کرتے ہیں۔ رشیوں کا ذکر کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے کہ ان میں علم اور معرفت نہیں گوشت نہیں کھاتے ، ازدواجی زندگی سے گریز کرتے ہیں ۔ زمین میوہ دار درخت لگاتے ہیں اس زمانے میں اُن کی تعداد دو ہزار بتائی جاتی ہے۔ کشمیر کے برہمن سنسکرت میں اپنی کتابیں تالیف کرتے ہیں جو بڑی معتبر سمجھی جاتی ہیں[1] ۔

کشمیریوں کے رہن سہن کے بارے میں جہانگیر کے خیالات یک رخہ اور خسروانہ ہیں کیونکہ صدیوں کی پسماندگی، جغرافیائی اور موسمی حالات، عسرت وغربت اور محکومیت سے کسی قوم کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر برے اثرات پڑنا لازمی ہیں جو چشم زدن میں زائل نہیں ہوتے۔

جہانگیر لکھتا ہے کہ اُس نے کشمیر میں سو پنکھڑیوں والا کنول کا پھول دیکھا۔ وہ اس بات کا بھی اظہار کرتا ہے کہ گوری مرگ ( گلمرگ ) کے حُسنِ لازوال نے اُسے مسحور کیا۔

شہر سرینگر کی بات کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہے کہ دریائے بہت (وتستا) پر عبور و مرور کے لئے لکڑی کے چار مضبوط پُل ( کدل ) بنائے گئے ہیں ۔ لکڑی اور غلے کے نقل و حمل کیلئے کشتیاں استعمال ہوتی ہیں۔ کشتیوں کی تعداد پانچ ہزار سات سو اور ملاحوں کی تعداد سات ہزار بتائی ہے۔ مکان تین تین چار چار سے منزلہ ہیں چھت پر مٹی ڈالی جاتی ہے۔ جس پر گل لالہ اُگتا ہے

[1] سون ادب ۔ تواریخ نویسی نمبر ۲ ۔ مضمون توزک ۔ کے ۔ این ۔ پنڈتا ۔ صفحہ ۹۱ ۔ تُزک جہانگیری ۔ راجرس ریوریج جلد ۲ ۔

جس بہار میں دیکھنے کو عجیب منظر ملتا ہے۔ پھول اَن گنت قسم کے اُگتے ہیں۔ اُستاد منصور نے سو سے اوپر پھولوں کی تصویریں بنائی ہیں۔ اکبر کے زمانے میں پیوند شاہ آلو یعنی آلو بخارو جود میں لایا گیا۔ سمر قند نام کا کشمیری سیب بہت اچھا ہوتا ہے۔ توُت کی بہتات ہے۔ دھان کی کاشت زیادہ ہوتی ہے۔ شال تبت سے لایا جاتا ہے اکبر نے اسکا نام پرم نرم رکھا تھا۔

کشمیر کے خارجی و داخلی جغرافیہ کے بارے میں بھی جہانگیر نے توزک جہانگیری میں اطلاعات فراہم کی ہیں۔ کشمیر کی وادی میں داخل ہونے کے دو راستے بتلائے گئے ہیں۔ ایک بھمبر کا، دوسرا پکھلی کا۔ بھمبر کا راستہ، نوشہرہ، راجوری، بہرام گلہ[1]۔ پوشیانہ، پیر پنچال، باڈی بزاری، ہیر پورہ (ہُر پورہ) اور قلمپورہ (کلیان پورہ) سے ہو کر سرینگر سے ملتا ہے۔ پکھلی کا راستہ پنبہ درنگ (مظفر آباد) کھٹائی اور بارہ مولہ سے ہوتے ہوئے سرینگر پہنچ جاتا ہے۔

یہاں کے باشندوں کا ذکر کرتے ہوئے جہانگیر لکھتا ہے کہ بہرام گلہ کے لوگ فارسی، ہندی اور کشمیری تینوں زبانیں بول سکتے ہیں۔ اُن کی عورتیں پٹو پہنتی ہیں اور ناک میں نتھنی ڈالتی ہیں۔

کشمیر میں مروج سازوں کے نام بھی جہانگیر نے لئے ہیں یعنی کمانچہ جنتر

---

[1] بہرام گلہ کا راستہ یونہی کھلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ اُسوقت کے دو زمیندار مہدی نایک اور حسین نایک ہیر پورہ سے بہرام گلہ تک کے راستے کے پہرے داروں کی حیثیت سے کلیدی رول ادا کرتے تھے۔ مہدی نایک کا باپ بہرام نایک حکومت کشمیر کے عہد میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اغلب ہے کہ اسی نسبت سے اس کا نام بہرام گلہ پڑا ہو۔

، قانون اور ادف' نے وغیرہ۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ کشمیری موسیقار ہندی مقامات میں کشمیر نغمے گاتے ہیں[1]۔

ہندوؤں کے نہایت ہی اہم تیوہار دسہرہ کے دھوم دھام اور عقیدت سے منانے کا ذکر بھی جہانگیر نے کیا ہے۔ یہ تیوہار ہر سال معمول کے مطابق منایا جاتا تھا[2]۔ دریائے جہلم میں مچھلی پکڑنے کے ایک خاص طریقے کا ذکر بھی جہانگیر نے کیا ہے[3]۔ جہانگیر لوکہ بھون کے اندھے ناگ اور مٹن کے مچھی بھون ناگ بھی دیکھنے گیا تھا، جسکا ذکر اُس نے اپنی توزک میں کیا ہے۔

وتستا کے جنم کے سلسلہ میں اُن دنوں ویتھ تُرواہ کے موقعہ پر دریائے جہلم کے کنارے چراغاں کئے جانے کی قدیم رسم کے بارے میں جہانگیر لکھتا ہے کہ یہ ایک قدیم رسم ہے جو اس روز (اگست کے اختتام یا یکم ستمبر پر ادا کی جاتی ہے)۔ جہانگیر بچشم خود شکارے میں بیٹھ کر اس دلربا چراغاں کا نظارہ کرتا ہے۔ شمسی سال کے اعتبار سے اُس کے وزن کئے جانے کا دن بھی اتفاق سے اُسی روز پڑتا تھا تو اُس نے اپنے وزن کے برابر سونے وغیرہ جیسی گرانقدر اشیاء مستحق لوگوں میں تقسیم کیں۔ ''وبتھ ترُواہ'' کے موقعہ پر چراغاں کرنے کی مستحسن رسم تو اب نہیں رہی لیکن (کشمیری پنڈت) لڑکیاں اپنے والدین کی طرف سے تحائف حاصل کرتی ہیں۔ شب برات کی مقدس تقریب پر غریب اور امیر سب مسلمان بھی چراغاں کرتے ہیں[4]۔ جہانگیر ایسے تیس پرندوں کی فہرست بھی فراہم کرتا ہے جو اُس کے زمانے میں کشمیر نہیں پائے گئے۔ ان میں مور، سارس وغیرہ شامل ہیں۔ جہانگیر بڑے احترام سے زین العابدین بڈشاہ

1. تزک جہانگیری۔ ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا مطبوعہ سون ادب۔ تواریخ نویسی نمبر۔ کلچرل اکادمی سرینگر تزک جہانگیری راجر و بیوریج۔ جلد دوم 2. تزک جہانگیری راجرز اور بیوریج جلد دوم صفحہ ۱۷۶ 3. ۱۷۶.........

اور اُسکے کارناموں کا بھی اجمالاً ذکر کرتا ہے۔ وہ یہاں کشمیر میں طاعون سے لوگوں کے مرے جانے کے بارے میں بھی لکھتا ہے[۵]۔اور دست بدعا ہے کہ وہ اپنے گناہ گار بندوں پر رحم کرے اور اُنہیں مصائب وآلام سے نجات بھی دے۔

جہانگیر نے اپنے دور حکومت میں کشمیر کے موسم بہار کی رنگینیوں، فیاضیوں اور قدرت کی جلوہ طرازیوں سے حتی المقدور بہرہ ور ہونے کی ہر سال کوشش کی۔ جام وجاناں کی محفلیں سجیں، جس کی شہادت یہاں کے جنت نظیر باغات کے دلربا اور روح پرور گوشے دے رہے ہیں۔ جہانگیر اپنی حیات بے ثبات کے آخری لمحات میں بھی مست خرام زندگی پر جان چھڑکتا رہا۔ بقول غالب

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر ومینا میرے آگے

مغل بادشاہوں کے سکوں سے بھی اُنکے مذہبی عقیدہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جہانگیر کے ڈھالے ہوئے سکے گول بھی ہیں اور چکور بھی۔ اُس نے چاندی کے سکے بھی ڈھلوائے اور سونے کے بھی[۱]۔ تابنا بہت کم برتا گیا ہے۔ جہانگیر ہی کے عہد میں سکہ سازی زیب وزینت کے اعتبار سے انتہا کو پہنچی۔ اُس کی حکومت کے پانچویں یا چھٹے سال میں جاری کئے گئے سکے وزن اور نفاست کے لحاظ سے دُنیا کے کسی بھی ملک کے بہترین سکوں کے مقابلہ میں رکھے جاسکتے ہیں سکوں کے ڈھلوانے میں بھی شہنشاہ کا ذوق جمال کار فرمار ہا ہے۔ سکوں کے دونوں طرف کندہ عبارت خطاطی کے اعلیٰ نمونوں کی حیثیت رکھتی ہے اس طرح یہ سکے نہ صرف تاریخ نما ہیں بلکہ اسلامی فنون کے آئینہ دار بھی۔ مغل بادشاہوں میں کشمیر کی ٹکسال سے سب سے زیادہ سکے جہانگیر ہی نے جاری کئے۔ اُسکے جاریکردہ سکوں کی تعداد چودہ ہے۔

۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) تک جہانگیری سکے بھاری تھے لیکن اُس کے بعد الٰہی طرز کے سکوں نے ان کی جگہ لے لی۔ شہنشاہ نے البروج طرز کے دو ہی سکے اپنی حکومت کے پندرھویں سال میں کشمیر سے جاری کئے۔ ان سکوں پر بُرجِ جوزا (میتھُن) کی شبیہہ بھی نظر آتی ہے۔ نور جہاں کے نام ۱۶۲۴ء (۱۰۳۴ھ) ایک مہر کا اجرا ہوا ہے۔ جس پر سطان (کرک) کی شبیہہ اُبھاری گئی ہے۔ مملکت کے دوسرے ضراب خانوں کی طرح کشمیر کی ٹکسال کے لئے بھی ایک شعر مخصوص تھا، جو یوں تھا اور روئے و پشت ضرب پر اُبھارا جاتا تھا۔

روئے زر را ساخت نورانی برنگِ مہر و ماہ

شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

کشمیر کی ٹکسال سے جاری کئے گئے جہانگیری سکوں کی تفصیل یوں ہے۔

| ۱ دھات | تاریخ وسال اجراء | روئے | پشت | وزن اور سائز |
|---|---|---|---|---|
| چاندی | ۱۰۱۹ھ | رؤے زر را<br>ساخت نورانی<br>برنگِ مہر و ماہ<br>۱۰۱۹<br>کشمیر | شاہ نورالدین جہانگیر<br>ابن اکبر بادشاہ | ۲۰۹ گرین<br>۸۵ |
| ۲ ایضاً | ۱۰۲۰ھ | ایضاً | ایضاً | ایضاً |
| ۳ ایضاً | ۱۰۲۱ھ | ایضاً | ایضاً | ۲۱۰ گرین |
| ۴ ایضاً | ۱۰۲۲ھ | نورالدین<br>جہانگیر شاہ اکبر شاہ | بشہت | |
| | ۸ | نورلدین | بہشت<br>ماہ اُردی اللہ<br>ضرب کشمیر ۱۰۲۲ھ | ۷۰ا گرین |
| | اردی بہشت | | | |

| | | | ضرب | |
|---|---|---|---|---|
| ۵ ایضاً | ۱۰۲۲ شاہ وار ۸ | ایضاً | ایضاً شہریور | ۱۷۸ گرین |
| ۶ ایضاً | ۱۰۲۲ ۸ مہر | ایضاً | مہر | ۱۷۴ گرین |
| ۷ | ۱۰۲۲ ۸ اسفندارمُذ | ایضاً | ۱۰۲۳ ۸ | ۱۷۰ گرین |
| ۸ | ۹ تیر | | ۱۰۲۳ ۹ تیر | ۱۷۵ گرین |
| ۹ | ۱۰۲۴ | | تیر | |
| ۱۰ | ۱۰ آذر | | ۱۰۲۴ | ۱۷۴ گرین |
| | ۱۰۲۶ ۱۲ فروردین | | ۱۰ آذر ۱۰۲۶ ۱۲ فروردین | |
| ۱۱ | ۱۰۲۷ ۱۳ آذر | | ۱۰۲۷ ۱۳ آذر | ۱۷۲ گرین |
| ۱۲ | ۱۰۳۱ ۱۷ فروردی | | ۱۰۳۱ ۱۷ فروردی | ۱۷۴ گرین<br>۲۰ گرین |
| ۱۳ | ۱۰۲۳ ۱۰ | جہانگیرشاہ ۱۰۲۳ | ضرب کشمیر | ۰۳۵ سائز |

باغات لگانے اور حُسن فطرت کو مزید آراستہ وپیراستہ کرنے کا شغل قدیم ہے۔ عام طور پر یہی مانا جاتا ہے کہ کشمیر میں مغل شہنشاہوں نے باغات

تعمیر کیئے۔ کشمیر میں شاہمیری دور سے پہلے بھی چھوٹے پیمانے پر ہی سہی باغات سنوارنے کا شوق موجود تھا۔ زأنہ ڈب (نوشہرہ)، زأنہ لأنک (جھیل ڈل اور وُلر میں) زینہ پورہ اور زینہ کوٹ و دیگر مقامات کو دلربا قطعہ ارضی میں تبدیل کرنے کا شوق زین العابدین بڈشاہ کے ہاتھوں پروان چڑھا۔ چک دور میں بھی اس میں اضافے ہوتے رہے۔ مرور ایام نے اکثر ایسے باغات کے نقوش مٹا دئے۔ اب صرف نام باقی ہیں۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ کہ مغل شہنشاہوں نے اپنی نظر انتخاب سے ایسے باغات تعمیر کیئے جن سے نہ صرف انہوں نے اپنے ذوقِ جمال کی کسی حد تک تشفی کی بلکہ تقریباً ساڑھے تین سو سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود جہانگیر کے مینو نظیر منتخب گوشے آج بھی ہمارے لئے راحت وسکون کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ جہانگیر کا کہنا تھا کہ کشمیر کی وادی کو ملک نہیں بلکہ ایک باغ ہی کہنا مناسب ہے۔ اُنکے باغات اُنکی ارضی محبت کی یادگار کے طور ہی نہیں بلکہ ذوقِ جمال کے اعلیٰ اقدار کی محافظ کی حیثیت سے بھی ہماری نظروں کو وسعت اور دلوں کو ایک بے نام فرحت عطا کرتے رہیں گے۔

جہانگیر نے شالیمار باغ کی بنیاد ۱۶۱۹ء میں باغ فرح بخش (The Garden of Delight) کے نام سے ڈالی۔ فیض بخش نام سے اس کی توسیع شاہ جہاں کے دور میں ۱۶۲۰ میں ہوئی لیکن اسکا اپنا پرانا نام یعنی شالیمار ہی مقبول رہا۔ آج کل یہاں روشنی اور آواز (Sound and Light) پروگرام کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے[1]۔ جو جہانگیر کی زندگی اور تاریخی حقائق پر مبنی ہے۔

باغ عیش آباد (۱۰۳۰ھ مطابق ۱۶۲۲ء) باغ بحر آرا (۱۶۲۴ء)

[1] پروگرام اب نہیں رہا لیکن آثار باقی ہیں۔

نور باغ، باغ دولت آباد، باغ ارادت خان (۱۰۳۰ھ) باغ صفا، صفا پورہ، باغ امرود، ویری ناگ، اچھ بل و دیگر مقامات اپنی منفرد تاریخی حیثیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ کچھ کا تو اب نام ونشان بھی باقی نہیں اور کئی ایک اپنی اصلی حالت برقرار رکھتے ہوئے ہمارے لئے فرحت وشادمانی کا سامان فراہم کررہے ہیں۔ ان باغات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ انسان کو جنت سے اسی لئے نکالا گیا کہ وہ اس دُنیا کو بہشت ارضی میں تبدیل کردے۔ شاید اُس نے اسی ضمن میں اپنا حقیر سا عملی حصہ ادا کردیا اور علامہ اقبال کو کہنا پڑا ۔

کوہ و دریا وُ غروبِ آفتاب

من خدا را دیدم آنجا بے حجاب

مصوری اور شبیہہ سازی اسلام میں ممنوع ہے لیکن انسان کا باطنی تخلیقی جذبہ کوئی نہ کوئی راہ پا ہی لیتا ہے چنانچہ خطاطی نے اسلامی مصوری کی جگہ لے لی۔ یہ فن شریف صفحہ قرطاس سے لیکر محلات، مساجد، مقابر اور میناروں کے سدابہار نقوش میں زندہ و پایندہ ہے۔ چونکہ مغل بادشاہ علوم وفنون کے دلدادہ تھے۔ اس لئے اُنہوں نے خطاطی کے فن کی سرپرستی کرنا اپنی سعادت سمجھی۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کا درباری خوشنویس محمد حسین زرین قلم تھا۔ جس نے ابوالفضل کے ''آئین اکبری'' کے ایک عمدہ نسخہ کو مصوّر بنایا۔ شہنشاہ اکبر نے اس کے لئے تین لاکھ روپے صرف کئے ۔ یہ نسخہ اب لندن میوزیم میں موجود ہے۔ عہد جہانگیری کا بہترین اور ممتاز کاتب محمد مراد شیرین قلم کو مانا جاتا ہے۔ خوشنویسی کا کشمیری قلم اُسی سے منسوب ہے۔ شاہجہاں نے اُس کی شہرت سُن کر اُسے اپنا درباری کاتب مقرر کیا[1]۔ شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں فارسی میں طبع آزمائی

[1] شیرین قلم۔ جلد۔۱۔ شاخ بنات۔ محمد یوسف ٹینگ۔ مطبوعہ کلچرل اکادمی سرینگر ۱۹۷۸ء

کرتے تھے۔ جہانگیر کے دور میں کشمیری زبان وادب پر سکوت طاری رہا۔
البتہ فارسی شعروادب کوفروغ حاصل ہوا جس کا بلا واسطہ مستحسن نتیجہ یہ نکلا کہ
آگے چل کر فارسی زبان کے زیر اثر کشمیری زبان کے عمومی ڈھانچے میں
دوررس تبدیلی آئی اور نہ صرف اس کے ذخیرہ الفاظ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا بلکہ
اسکی اصنافِ سخن کا دامن بھی کیفیت وکمیت دونوں لحاظ سے بہت وسیع ہوا۔
حیدر ملک چاڈورہ جسے دربارِ جہانگیری سے بڑی قربت حاصل تھی کی تاریخ
کشمیر (فارسی) جہانگیر کے عہد ہی کی دین ہے۔ اس خاموش تاریخی عمل میں
درباری عنایات سے زیادہ کشمیر کے علمی خاندانوں سے وابستہ کشمیری شعراء
وادباء کا بہت بڑ دخل ہے جن کی تخلیقی کاوشوں کی صورت میں کشمیری زبان مایوس
کن حالات میں بھی محوِ سفر رہی۔

ہر لحظ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

☆☆☆

# ہر گوپال کول خستہ

کیا بتائیں جہاں میں کیا دیکھا
ہرطرف جلوۂ خدا دیکھا
ہم نے دُنیا کو آزمادیکھا
جس کو دیکھا غرض ،فنا دیکھا
کیا بھروسہ ہے دم کا اے آدم
دم تو ہر دم کا گیاہُوا دیکھا
صحبتِ پیر زالِ دُنیا میں
آشناؤں کو ڈوبتا دیکھا
خوب ڈھونڈا جہاں میں اسے خستہ
خستگی کا نہ آشنا دیکھا

یہ سیدھے سادے اشعار ایسی زندگی اور شخصیت کے باطن کی عکاسی کرتے ہیں جسکے نقوش کشمیر کی سماجی ،سیاسی ،علمی اور اَدبی زِندگی پر ثبت ہیں ۔ میری مراد پنڈت ہر گوپال خستہ سے ہے جو کشمیر نژاد تھے اور ۱۸۷۶ء میں اپنے خاندان کے ساتھ پٹیالہ سے ،ڈوگرہ راجہ مہاراجہ رنبیر سنگھ ( ۸۵_۱۸۷۶ء )

کے عہد میں کشمیر منتقل ہوئے۔ پنڈت ہر گوپال کول نے اپنی مصنفہ تاریخ ''گلدستۂ کشمیر'' میں اپنے اور اپنے اسلاف کے بارے میں کچھ اشارے کیے ہیں۔ اسی طرح اپنے قصہ ''گلزارِ فوائد'' میں بھی اُنھوں نے کچھ باتیں اپنے بارے میں اور لکھی ہیں۔ اُن کے بھائی پنڈت سالک رام نے بھی اپنی داستانِ نثر کے دیباچے میں اس ضمن میں تفصیل سے لِکھا ہے جس کی بنا پر نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ خستہ کے آباواجداد کشمیرالاصل تھے۔ اُن کے اسلاف کا شُمار اپنے عہد کے معززین میں ہوتا تھا۔ سرینگر کے محلّہ رینہ ٹینگ (رعناواری) میں اُنکی ملکیتی اراضی تھیں۔ سِکھوں کے عہدِ حکومت (۱۸۲۰ء ۔ ۱۴۸۱ء) میں لاہور چلے جانے کے بعد بھی اُن کے تعلقات کشمیر سے قائم رہے[1]۔ خستہ کے جواں سال ہم عصر شاعر، ادیب محقق اور مؤرخ منشی محمد الدین فوق (۱۸۷۷ء ۔ ۱۹۳۵ء) مُصنف ''تاریخِ اقوامِ کشمیر'' کے بیان کے مُطابق پنڈت خستہ اور سالک کے والد پنڈت رام چندر کول لاہور اور کشمیر دونوں جگہ رہتے تھے۔ پنڈت سالک رام نے لکھا ہے کہ اُن کی رینہ ٹینگ کی جائداد ''کول میراث'' کے نام موسوم تھی۔ اُن کے دادا گاشہ کول اور پردادا مہادیو کول کشمیر کے معتبر لوگوں میں سے تھے۔ اُن کے چچا پنڈت کیلاش ناتھ کول لدھیانہ میں محکمہ بندوبست کے عہدہ دار تھے۔ پنجاب میں کافی عرصہ گزارنے کے بعد اُن کا خاندان پٹیالہ چلا گیا۔ اُن کے پٹیالہ جانے کا سبب دونوں بھائیوں کی تحریروں سے نہیں مِلتا۔ یقیناً سلسلہ روزگار ہی رہا ہوگا۔ ''گلزارِ فوائد'' کی تمہیدی عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی اسکول کی ملازمت تھی پنڈت ہر گوپال کے ساتھ سارا خاندان پٹیالہ چلا گیا تھا۔ پنڈت سالِک رام اُس وقت کم عُمر تھے اور پٹیالہ کے مہاراجہ کالج میں

[1] کشمیر کے ۲ دو بھائی ۲ دو ادیب۔ پرُوفیسر عبدُالقادر سروری۔ مطبوعہ: ۱۸۶۵۔ ص۔ ۱۔ ۶۶۔

داخل ہو گئے تھے۔

پنڈت ہرگوپال خستہؔ کی وِلادت کا سنہ دستیاب نہیں۔آنجہانی پنڈت شِو نرائن فو تیدار کے بیان کیمطابق خستہؔ یکم ماگھ ۱۹۸۰ بکرمی (جنوری ۱۹۲۲ء) انتقال کر گئے۔اُن کے انتقال پر مہاراجہ پرتاب سِنگھ نے تعزیتی تار بھیجا تھا اور کشمیر کے مُمتاز مجاہدِ آزادی اور سماجی رہنما پنڈت کشپ بندھو نے اخبار ''سماج سُدھار'' میں خستہؔ کے بارے مضمون لِکھا تھا جس کے آخر میں یہ شعر مؤثر انداز میں درج کیا گیا ۔

ہم ترے دیدار کو یُونہی ترستے رہ گئے

دیدۂ مُشتاق کے بادل برستے رہ گئے

انتقال کے وقت خستہؔ کی عُمر قریباً ۷۵ سال تھی جس کے مطابق یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۴۸ء کے آس پاس پیدا ہوئے۔گو کہ اُن کی جائے پیدائش کا کہیں ذِکر نہیں۔چونکہ اُن کا خاندان عُرصہ سے لاہور ہی میں مقیم تھا اِس لئے اُن کا جنم یقیناً لاہور ہی میں ہوگا جہاں اُن کی تعلیم و تربیت بھی ہوئی ۔ پنڈت خستہؔ کے پھر وطن مالوف کو آنے کے وہ جو کچھ بھی ہوں لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اپنے آبائی وطن کی محبت نے شِملہ کی پہاڑیوں کو دیکھ کر ضرور کروٹ لی ہوگی اور وہ کشمیر آنے کیلئے بیتاب ہوئے ہونگے۔

چنانچہ پنڈت جیالال کلم مصنِف ''اے ہسٹری اف کشمیری پنڈتس'' کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے پنجاب میں قیام کے زمانے میں برطانوی حکومت کی جانب سے پٹیالہ چلے گئے۔اپنے خاندانی تعلق کا تذکرہ کرنے کے بعد پنڈت ہرگوپال پٹیالہ میں اپنی ملازمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''بندہ کو اتفاق سے بہ بہانہ مُلازمت پٹیالہ (جو ریاست بہ ہمہ وجوہ فیض بخش اور قابلِ تعریف ہے) کوہستانِ شملہ پہنچا دیا جہاں پہاڑوں کے دیکھنے سے حُب الوطنی نے کشمیر دیکھنے کا شوق پیدا کیا'' اُن کے چھوٹے بھائی پنڈت سالِک رام نے اپنے ایک شعر میں اپنے خاندان کے کشمیر لوٹ آنے کی طرف یُوں اِشارہ کیا ہے۔

ہند کو چھوڑوں میں تیاریٔ کشمیر کروں
سرومہریٔ بُتاں کی کوئی تدبیر کروں

جیسا کہ پہلے ہی ذِکر ہو چکا ہے کہ پنڈت ہرگوپال ۱۸۷۶ء میں واردِ کشمیر ہوئے جب یہاں کے لوگوں کو شدید قحط کا سامنا ہوا۔ خستہ خود لکھتے ہیں کہ کشمیر آنے کے بعد اُنہوں نے کچھ عُرصہ یہاں سیر و سیاحت میں گزارا۔ جس کے بعد اُن کو تلاش معاش کی فِکر ہُوئی اور اِتفاقاً ڈاکٹر جیگور کی وساطت سے میجر۔ پی۔ ڈی۔ ہنڈرسن، آئی۔ سی۔ ایس افسر برائے اسپشل ڈیوٹی کشمیر سے اُن کی مُلاقات ہوئی۔ اُنہوں نے خستہ کی مدد کی اور چندے وطن میں رہنے کی صورت نِکل آئی۔ میجر ہنڈرسن کی وساطت سے کرنل ہنری جو اُن دِنوں ریذیڈنٹ تھے سے اُن کی شناسائی ہوئی۔ میجر ہنڈرسن چونکہ خستہ کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے اسلئے اُنہوں نے کرنل ہنری سے یہ سفارش کی کہ وہ کشمیر کے معاملات میں اُن سے ضرور مشورہ لیا کریں۔ سابق چیرمین قانون ساز کونسل سور گباشی شِونرائن فوتیدار (وفات۔ ۱۹۷۸ء) کے بیان کے مُطابق وہ یہاں کسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے۔ خستہ نے خود اِس امر کی طرف اشِارہ کیا ہے کہ یہاں اُسی زمانہ میں مطبع تحفۂ کشمیر کی مینجری

؎ کشمیر کے دو ادیب۔ دو بھائی۔ ص۔ ۲۵

اور ایڈیٹری بھی اُن کے سُپرد ہوئی تھی لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ خدمت زیادہ دیر تک انجام نہیں دے سکے کیونکہ اُن کی طبیعت اِس کام سے جلد اُکتا گئی اور اسے ترک کردیا۔

خستہؔ کی طبیعت کہاں ایک جگہ ٹکتی۔ دیوان اننت رام کے وسیلہ سے وہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے متوسلین میں شامل ہوئے اور "عہدۂ اخبار نویسی کل ملک وغیرہ" پر مُمتاز ہوئے۔ اُن کے فرائض میں داخل تھا کہ وہ ہر روز شام کو مہاراجہ کے دربار میں جاتے اور شہر کے اخبار سُنایا کرتے تھے۔ اپنی فہم وفراست کی وجہ سے وہ جلد ہی مہاراجہ کے منظورِ نظر ہوگئے۔ جیسا کہ عام طور ہوتا آیا ہے ایسا ہی ہرگوپال خستہؔ کے ساتھ ہوا۔ لوگ اُن کے ڈوگرا دربار میں عالی رُتبہ ہونے پر جلنے لگے۔ وہ تاک میں رہے کہ کب موقعہ مِلے اور وہ خستہؔ پروار کرسکیں۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء کے شدید قحط نے وہ دن دکھایا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے قحط کی صعوبتوں کو کچھ کم کرنے کی خاطر سرکار کی جانب سے دھان کی تقسیم کا بندوبست کیا جس کے لئے شہر سرینگر کو کئی حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پنڈت ہرگوپال کو بھی ایک حلقہ کا نگران افسر مُقرر کیا گیا۔ اُن کے خِلاف، حکومت کو درخواستیں موصول ہوئیں کہ ہرگوپال خستہؔ شالی کی تقسیم کاری میں خیانت کررہے ہیں۔ حکومت ہند کے پاس بھی درخواستیں گئیں کہ قحط زدہ لوگوں کو بوروں میں بھر کر کِشتیوں سے جھیل وُلر لے جاکر ڈبویا جارہا ہے۔ یہ بڑا ہی سخت الزام تھا۔ حکومت ہند نے مہاراجہ سے باز پُرس کی۔ اُدھر مہاراجہ کے ذہن میں خستہؔ کے مُخالفیں نے یہ بات بٹھادی کہ اِن گُمنام درخواستوں کا باعث وہی ہیں۔ چنانچہ اُن کے چھوٹے بھائی کی ریذیڈنسی میں مُلازمت کو بھی اُچھالا گیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اِن دونوں بھائیوں کی طرف سے بدظن ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن

پنڈت ہرگوپال کو مہاراجہ نے اپنے دربار میں بُلایا اور اُن سے اپنی ناراضگی بھی ظاہر کرتے ہوئے سخت وسُست بھی کہا۔ پنڈت ہرگوپال نے بڑی جُرأت کا مُظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ ''اگر سرکار، سرکار نہ ہوتے اور میں سرکار کی رعیت نہ ہوتا تو جو زبان سرکار نے میرے بارے میں استعمال کی ہے، شاید میرا جواب بھی اُسی زبان میں ہوتا۔'' مہاراجہ نہایت برافروختہ ہوئے اور تلوار میان سے نِکال لی اور غصہ میں شاید ہرگوپال پر وار کر بیٹھتے لیکن وزیر پُنوں کی دربار میں موجودگی سے حالات قابُو میں رہے۔ اُنہوں نے بڑی متانت اور سنجیدگی سے اُنہیں یاد دِلایا کہ سرکار کو اس بات پر فخر کرنا چاہیئے کہ سرکا کی رعایا میں ایسے سرفروش بھی موجود ہیں جو سرکار کے روبرو ایسی بات کہہ سکتے ہیں۔'' معاملہ کی تحقیقات ہوئی۔ مہاراجہ کو الزام سے بری قرار دیا گیا اور خستہ و سالک کو قید کی سزا ہوئی۔ ۱۸۷۹ء کے واقعات کا ذکر ''گلدستۂ کشمیر'' میں تفصیل سے ہے اور قدرے مختلف انداز سے بھی۔ جیالال کلم نے لِکھا ہے کہ ہرگوپال خستہ نے اِس مُعاملہ میں بڑی جُرائت و استقامت کا ثبوت دیا۔ قلعہ باہو، جموں میں یہ دونوں بھائی تین سال قید رہے۔ اسی زمانے میں ہرگوپال خستہ نے ''مثنوی گوپال نامہ'' لِکھی جس میں کشمیر کے قحط و دیگر سیاسی اور ذاتی احوال کے بارے میں تفصیل سے لِکھا گیا ہے۔ اِس میں مہاراجہ کے دربار کی سازِشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ مثنوی زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہوسکی، لیکن سرگباشی شِونرائن فوتیدار سے پروفیسر عبدالقادر سروری نے جو جستہ جستہ اشعار زبانی نقل کیئے اُن کا یہاں پیش کرنا دِلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

پلا ساقیا مُجھ کو بھر کر شراب ۔۔۔ کہ ہوتی ہیں اب کِشتیاں زیرِ آب
قضا را اِن ایام میں دوستو ۔۔۔ پڑا قحط کشمیر میں چارسُو

وہ تھا قحط یا تھا وہ قہر خدا کہ زیر و زبر جس سے عالم ہوا

گرفتاری اور قلعہ باہو میں قید کئے جانے کا ذکر بھی دیکھئے کس طرح کرتے ہیں۔ اس بات کا اعادہ کرنا یہاں بے جا نہیں ہوگا کہ اُس وقت کا پولیس افسر رائے رادھا کرشن تھا جو اُن کو قلعہ باہو پہنچانے میں پیش پیش تھا۔

سپاہی ہوئے پھر تو ہمراہ مرے کچھ اِدھر اُدھر، کچھ وُرے کچھ پرے
کوئی ہاتھ میں لے کے تیغِ دودم کوئی کر کے بندوقِ سنگین خم
چلا تھا نہ راہی جو فرسنگ بھی تو چلنے میں گھبرا اُٹھا اُس کا جی
کہاں اسپ و کشتی پہ ہوتا سوار کہاں ایڑیاں اب رگڑتا بُخار
کہاں ساتھ رہتے تھے نوکر مدام کہاں پڑ گیا پہرہ والوں سے کام
کہاں حکم کرتا تھا لیل و نہار کہاں ہوں میں محکوم اور تابعدار
کہاں بستر نرم بھی خار تھے کہاں خارِارہ سینہ افگار تھے

اُس زمانے میں یہاں اُردو کے عروج وارتقاء پر تاریخی تناظر میں نظر ڈالتے ہوئے اِس معاملہ یعنی خستہ کے پابجولاں کئے جانے کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے محمد یوسف ٹینگ لکھتے کہ ہیں کہ اُس دَور میں اُردو کا کشمیر میں ایک اور بڑا کارنامہ رہا کہ وہ یہاں اِنقلاب اور نجات کا پیغام لے کر بھی آئی اور اِظہار کی آواز بھی بن گئی۔ پنجاب میں اُردو صحافت پچھلی صدی کے آخری وسط میں برگ وبار لائی تھی۔ اِن اخبارات میں کچھ تو کشمیریوں کے ہاتھوں میں تھے (جیسے اخبارِ عام لاہور) کشمیر پر بھی اِن کی وجہ ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نشریات کشمیریوں کا ذہنی لمس پاکر ایک نئی اُتھل پُتھل کی بشارت دے رہی تھیں۔ چنانچہ کشمیر میں باقاعدہ سیاسی بیداری کا عنوان اُردو صحافت ہی نے تحریر کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی کشمیری پنڈتوں کے ایک طبقہ سے ٹھن گئی، جس کے

پسِ منظر میں سیاسی اور اقتصادی دونوں وجوہات کارفرما تھیں ۔ کشمیری پنڈت وادی کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ تھے ...... جموں کے حکمران خاندان نے وہاں کے نسبتاً نو آموز اقارب اور بیرون ریاست کے یقینی طور پر زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کو کشمیر کی اِنتظامیہ میں بھرتی کرنا شروع کردیا۔ کشمیری پنڈتوں کو اپنی روزی اور روٹی کے لالے پڑنے لگے ..... اِس مرحلے پر کشمیریوں کی ترجمانی ہرگوپال خستہؔ نے کی ۔ اُس نے کشمیر کے قحطِ عظیم میں رنبیر سنگھ کے انتظامیہ کی کڑی نکتہ چینی کی اور یہ آواز اُردو کے اخبار ریفارمر، خیرخواہ، اور راوی وغیرہ کے صفحات میں بُلند کی گئی ۔ اِس شوروشیون سے جموں و کشمیر کی حکومت اِس قدر رزچ ہوگئی ۔ کہ آخرِ کار خستہؔ کو باہو قلعہ میں پابہ جولاں کردیا گیا۔ یہ محض اِتفاق کی بات نہیں کہ خستہؔ کو عوام نواز آواز کا جواب بھی لکیر کے فقیر ایک کشمیری پنڈت راجہ کول عرض بیگی ویری نے دیا۔ یہ مصاحب صفت مداحی اُردو میں نہ سماسکی اسلیئے فارسی میں تحریر ہوئی ۱؎

سالک رام کے علاوہ ہرگوپال کے ہمراہ اُن کے اور تین چھوٹے بھائی جانکی ناتھ، سری کشن اور شیوناتھ بھی تھے، اُن کا ذِکر ذیل کے اشعار میں کیا گیا ہے۔

ہیں بھائی میرے تین اور خورد سال
ہوئے وہ بھی ہمراہ باحال زار

پھر مثنوی کا اِختتام اِس اُمید پر ہوتا ہے کہ خُدا کی بارگاہ میں دیر ہے اندھیر نہیں۔

خُدا خود سُنے گا تری یہ دُعا
کہ بخشے وہ بخشندہ ہے کبریا

تو خاموش رہ اس کا کیا ذکر ہے خُدا سر پہ ہے تیرے کیا فِکر ہے

۱؎ کشمیر میں اُردو.... حصہ ۲ دوم.... عبدُالقادر سہروردی مطبوعہ کلچرل اکادمی سرینگر: ص ۔۱۱۔۱۲۔

مثنوی دوسو پچاس اشعار پر مشتمل ہے اور دورانِ اسیری قلعہ باہو میں تکمیل پذیر ہوئی تھی، خستہ نے مہاراجہ پر ایک اور طنزیہ نظم" بھی لکھی تھی جسکے چند اشعار پیش کرنا یہاں باعثِ دل چسپی ہوگا۔

ستم گر اس جگہ لے کر ستم تو قیامت کو اُٹھائے گا اَلم تو
نہ کر منہ کالا تو اپنی بدی سے بدی آخر بدی ہے اور بدی ہے
شکارِ شیر آہو شاہوں سے کیا ہے مگر مور و مگس تیری غذا ہے
جو ہیں شاہ اُنکو شاہوں سے ہے کینہ تجھے لیکن گداؤں سے ہے کینہ
نہیں ہے فوج میرے پاس کوئی چڑھاؤں گا جو تجھ پہ لا کے وہ ہی

خستہ کی قلعہ باہو میں اسیری کے دوران ایک دو دلچسپ واقعات پیش آئے جن سے اُن کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ایک روز مہاراجہ رنبیر سنگھ قلعہ کے معائنہ کے لئے آئے۔ خستہ کی خیریت دریافت کرتے ہوئے اُن سے پوچھا "کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" خستہ نے جواب دیا۔ "سرکار کی عنایت سے سب کچھ ٹھیک ہے"۔ پنڈت سالک رام نے بھی ایسا ہی جواب دیتے ہوئے یہ شکایت بھی کی کہ صبح کے وقت جب وہ پوجا پاٹ میں مصروف ہوتے ہیں تو اُن پر متعین سنتری پاس بیٹھے حقہ پیتے اور بلند آواز میں گفتگو کرتے ہیں جس سے پوجا کرتے وقت اُنکے دھیان گیان میں خلل ہوتا ہے۔ مہاراجہ سنتریوں کو حکم دیا کہ سالکرام جب پوجا میں مصروف ہوں تو ذرا دور جا کر بیٹھا کریں۔ حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ کچھ دن یونہی گزر گئے۔ ایک دن جب سنتری پنڈت سالک رام کی کوٹھری کے پاس واپس لوٹے تو سالک رام کو غیر حاضر پایا۔ اس پر تہلکہ مچا۔ بڑی جستجو کے بعد پتہ چلا کہ پنڈت سالکرام نے کوٹھری میں سرنگ بنایا اور اُسی راستے سے فرار ہو گئے۔

پنڈت ہرگوپال خستہؔ نے مہاراجہ پر الزام لگایا کہ سالک رام کو قتل کیا گیا ہے۔ اور جرم کو چھپانے کے لئے سرنگ کا قصہ مشہور کیا گیا ہے۔ چنانچہ سالک کی زور و شور سے تلاش شروع ہوئی۔

ایک اور واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ پنڈت ہرگوپال ایک دن اپنی کوٹھری سے باہر برآمدے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے ایسے میں اُنہوں نے کسی شخص کو احاطہ میں داخل ہوئے دیکھا۔ وہ قریب آکر پنڈت ہرگوپال کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے لگا۔ خستہؔ بہت ہی برافروختہ ہوئے اور اُس شخص کی خوب پٹائی کی کہ اُس کو کیا حق ہے کسی کی خلوت میں مداخلت کرنے کی۔ یہ دراصل مہاراجہ رنبیر سنگھ کے سالے سادِل سنگھ تھے۔ شاہنیؔ نامی راجپوتنی یہ سارا واقعہ دیکھ رہی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ پٹنے والا کون شخص ہے۔ اسلئے اُسے ہرگوپال کی یہ جرأت دیکھ کر بڑا اچھبا ہوا اور یہ سمجھنے گی کہ یہ بڑا ہی سورما انسان ہے جو مہاراجہ رنبیر سنگھ سے جھگڑا مول لینے پر آمادہ ہے۔ راجپوتنی کے دِل میں ہرگوپال خستہؔ کا بڑا احترام پیدا ہوگیا۔ وہ اُنہیں اَوتار سمجھنے لگی اور اپنی عقیدتمندی سے اُنہیں روز روٹی لاکر دینے لگی[1]۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

جب پنڈت ہرگوپال خستہؔ قلعہ باہو (جموں) سے رہا ہوکر اور بقول جیالال کلم سیالکوٹ میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد سرینگر آئے تو مہاراجہ رنبیر کا انتقال ہوچکا تھا اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ (۱۸۸۵ء۔۱۹۲۵) گدی نشین ہوچکے تھے۔

[1] کشمیر کے دو ادیب۔ دو بھائی۔ عبدالقادر سروری۔ ۱۹۶۵۔ ص۔ ۳۵۔ ۳۹

اب کہاں قسمت آزمانے جائیں
جب کوئی خنجر آزما نہ ہوا

ازاں بعد خستہ نے اپنی زندگی سماجی بہبود واصلاح اور تعلیمی کاموں کیلیئے وقف کردی۔ اُس زمانے میں کشمیری پنڈتوں میں بھی لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کو آوارگی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اُنہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی صاحبزادی پدماوتی دیوی کو جو کم سنی میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں، اس کا صدر مدرس مقرر کیا۔ بیواؤں کی دوسری شادی کرانے کی بھی، جن میں اُن کی اکلوتی بیٹی بھی شامل تھی، جان توڑ کوشش کی۔ لیکن کشمیری پنڈت سماج نے اُن کی اس شدت سے مخالفت کی کہ اُنہیں بالآخر اپنایہ عہد آفرین اور نیک اِرادہ ترک کرنا پڑا۔ پنڈت ہرگوپال کی شادی چکو خاندان سے ہوئی تھی۔ اُن کی صرف ایک بیٹی پدماوتی تھیں۔ جن کی شادی کم عمری میں ہی ہوئی تھی اور جو بال ودھوا ہوگئی تھیں۔ پنڈت خستہ نے دولڑکے متبنیٰ لئے جن میں سے ایک کا نام شادکا پرشاد تھا اور وفات پاچکا۔ دوسرے کی بیوی بھی اولاد سے محروم تھی، اس کے لئے شِونرائن فوتیدار کو اپنی صاحب زادی پدماوتی کے لئے متبنیٰ کیا تھا جس نے آخری دم تک وفاداری اور تابعداری کے ساتھ اُنکا ساتھ نبھایا۔ البتہ لڑکیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں کڑی مخالفت کے باوجود اُنہیں بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔ بقول اِقبالؔ۔

زمانہ باتو نہ سازد، تو باز مانہ ستیز

اس طرح خستہ کی مستحسن کوششوں سے قائم ہوئے سکولوں کی تعداد سات تک پہنچ گئی۔ لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُنہیں لڑکوں کی تعلیم کا بھی خیال رہا چنانچہ اُن کی اور سرا کر ام کی کوششوں کے نتیجہ میں سرینگر میں پہلا

ادارہ ہندو ہائی سکول قائم ہوا جو بعد میں سری پرتاپ کالج کے نام سے کا پہلا اور بڑا کالج بن گیا۔ کمسن بیواؤں کی دوسری شادی کے معاملے میں کشمیری پنڈت اُن کے رفتہ رفتہ ہمنوا بن گئے۔

اہل جنوں کو چین سے بیٹھنا نصیب کہاں۔ سہہ یار نوا کدل میں خستہ کی رہائش گاہ کے سامنے ایک مولوی صاحب رہا کرتے تھے[1]۔ جو اپنی مکان کی منزل میں درس قرآن مجید دیا کرتے تھے۔ اُن کے مکان کی ایک کھڑکی کے صحن کی طرف کھلتی تھی جہاں باغ کے علاوہ، نہانے کا ایک حوض بھی تھا۔ پنڈت خستہ نے کئی بار اُنہیں وہ کھڑکی بند کرنے کو کہا۔ مولوی صاحب اس کے لئے اس وجہ سے راضی نہیں ہوئے کہ ایسا کرنے سے اُن کا کمرہ اندھیرا ہو جاتا۔ ایک دن پنڈت خستہ اُچک کر مولوی صاحب کے کمرے میں ہوئے اور اُن کے ساتھ درشتی سے پیش آئے۔ بات بڑھی اور مقدمہ چلا۔ خستہ کو بری کر دیا گیا۔ لیکن اُن کو ریذیڈنٹ کی زبانی صلاح کے مطابق ۲۴ دنوں کے اندر اندر ریاست سے باہر چلے جانے کو کہا گیا۔ پنڈت خستہ نے جلائے وطنی میں امرتسر سے دو اُردو اخبار، راوی بے نظیر، اور صبح کشمیر جاری کئے۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے اختیارات محدود کئے گئے تھے۔ پنڈت خستہ نے اپنے قلم سے رائے عامہ کو اُنکے حق میں منظم کیا اور ۱۸۹۱ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اُنکو کونسل آف ایجنسی کا پریذیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ جلاوطنی کے بعد پنڈت خستہ لوٹے تو اُن کا ایک قائد کا سا استقبال کیا گیا۔ جسمیں ہندو مسلمان سب

[1] ن ابن علی (وفات ۱۳۴۳ھ) کی ڈائری کے اندراجات کے بارے میں کشمیر میں اُردو۔ جلد ۲، میں ذکر ہوئے مرحوم عبدالقادر سروری نے پنڈت ہرگوپال خستہ کے مولوی یحیٰ سے ناروا سلوک کرنے اور مقدمہ جانے کی تفصیلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۱۸۹۸ء میں پیش آیا ہے

شامل تھے۔ پنڈت خستہ کی مساعی جمیلہ نے اُنہیں عوام میں ہر دلعزیز بنایا تھا۔ شاہی دربار میں اُنہیں عزت وتوقیر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اور مُلکی معاملات میں بھی اُن سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

شاعر اور مورُخ ہونے کے علاوہ پنڈت ہر گوپال خستہ اچھے مقرر بھی تھے۔ وہ مسلسل گھنٹوں تقریر کر سکتے تھے اور لوگوں کو اُن کی تقریر سننے سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ اُن کی ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ کٹر کشمیری تھے اور کشمیریوں کو اُنکے حقوق دِلانے کے لئے آخر دم لڑتے رہے۔ بہارِ گلشن، میں اُن کے بارے صرف اتنی عبارت درج ہے کہ آپ اُن چند بزرگوں میں سے تھے۔ جنہوں نے زندگی کا ہر لمحہ اپنے وطن اور قوم کی خدمت میں صرف کیا۔

نجی خطوط بالخصوص ادبی نوعیت کے خطوط لکھنے والے کے باطن کا آئینہ ہوتے ہیں جہاں انسان اپنا دِل کھول کے رکھ دیتا ہے خطوط کی روزن سے ہم کسی کے مزاج کے اندرون کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ خستہ کے نام اُن کے دوست پروفیسر لچھمی دھر کلہ کے خطوط اور اُن کے جواب میں خستہ کی آخری تحریروں سے اُن کی وفات کا صحیح ماہ وسال یعنی جنوری ۱۹۲۳ء کا بھی پتہ چلتا ہے۔ لچھمی دھر کلہ اور خستہ کی مراسلت مختصر سہی لیکن اُنکی زندگی کے آخری ایّام کے بارے میں ہونے کی وجہ سے بہت ہی اہم ہے وہ (لچھمی دھر کلہ) لکھتے ہیں:۔

> ''جناب ہر گوپال صاحب سے میری تحریری واقفیت کا سلسلہ ۱۹۲۳! ء سے شروع ہو کر پنڈت صاحب موصوف کے سر گباش ہونے سے کچھ ماہ بیشتر ۱۹۲۳ء ہی

!۔ کشمیر کے دو بھائی۔ دو ادیب۔ سرور تی۔ ص۔ ۴۳۔ ۴۵

میں اختتام پذیر ہوگیا۔ گویا ہمارے مابین یہ سلسلۂ تبادلۂ
خیالات قریب ایک سال کے لئے جاری رہا۔"
☆ (بہارِ کشمیر۔ لاہور اکتوبر ۱۹۲۴ء)

پنڈت کشپ بندھو، جنہیں کشمیر کے لوگوں کی اصلاح و ترقی سے دلچسپی تھی، پنڈت ہرگوپال سے سماجی بہبود کے کاموں میں مراسلت رکھتے تھے۔ اُنہوں ۱۹۲۳ء کے آغاز ہی میں پنڈت خستہ کے نام خط لکھا تھا کہ میں ماہ مارچ میں ملاقات کیلئے آرہا ہوں جس کے جواب میں پنڈت خستہ نے اپنے آخری سفر کے بارے میں ظریفانہ انداز میں پیش گوئی کرتے ہوئے لکھا:۔

"آپ مارچ کے مہینہ میں مجھ سے ملاقات کے
لئے آرہے ہیں مگر موت مارچ سے پہلے ہی میرے لئے
ڈبل مارچ کرتی ہوئی آرہی ہے۔"

پنڈت ہرگوپال کے انتقال کے کوئی سولہ برس بعد ماہِ جنوری ۱۹۴۰ء اُن کی برسی کی یادگار کے طور پر، بہار کشمیر جیتا ہے وہ، عنوان سے پچھمی دھر کلہ کا مضمون شائع ہوا تھا، جس میں اُنکے خستہ کے اُن کے نام خطوط سے اقتباسات درج کئے گئے تھے، جن سے اُن کی شخصیت کے کئی مخفی پہلو سامنے آتے ہیں[1]۔

پنڈت ہرگوپال خستہ کے ذوق عمل کا اندازہ اُن خطوط کے اقتباسات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو اُنہوں نے اُن کے تحریر کردہ آخری خطوط سے محولہ بالا مضمون میں شامل کئے ہیں۔ اُن کا (پچھمی دھر کا) کہنا ہے کہ:۔

"میں حیران تھا کہ اس عالم ضعیفی میں آٹھ آٹھ
صفحے کی تحریریں لکھنے کی دِقت کو پنڈت صاحب کیسے

[1] کشمیر کے دو بھائی۔ دو ادیب سروری۔ ص۔ ۴۳۔ ۴۵

برداشت کرتے ہوں گے۔"

پنڈت ہوگوپال کے خطوط گو دستیاب نہیں لیکن پروفیسر پچھمی دھر کلہ نے اُن کے کچھ خطوط کے جو اقتباسات پیش کیئے ہیں وہ اِس لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ اِن سے اُن کی شخصیت نظریۂ حیات اور خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ پنڈت کلہ کے اس خیال ورائے کے جواب میں کہ وہ جب کاروبار ترک کر کے کشمیر کی خدمت میں اپنی زندگی وقف کرنا چاہتے ہیں، پنڈت ہرگوپال اُنہیں لکھتے ہیں:-

"ترکِ کاروبار کرنا میرے خیال میں ویسا ہی معیوب ہے جیسا کہ عدم تعاوُن ۔ انسان کے جامہ میں دو گُن ہیں۔ جیو آتما اور مادی۔ اسلیئے دِل بایار، دست باکار، ترک سے بہتر ہے۔"

وہ کشمیر اور کشمیر سے باہر بھی، کشمیری نژاد (پنڈتوں کے) اتحاد کے حامی تھے۔ چنانچہ پنڈت کلہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"کشمیر اور کشمیریوں سے تو ہنوز کوئی اُمید نہیں۔ اُچھل پڑتے اور دب کر سو جاتے ہیں"۔

خستہ کا یہ نفسیاتی اور عمرانی مشاہد آج بھی کشمیری عوام کے حوالہ سے حرف بحرف صحیح ہے۔

"ہمارے بعض ...... بھائی بھی اپنی خوش گذرانی پر مغرور ہو کر ایسے دِل شکن اور واہی تباہی الفاظ کہہ دیتے ہیں کہ..... قومی اتفاق میں ایک خلیج پیدا ہو جاتی ہے"۔

کشمیری مسلمانوں سے بھی اُن کو شکایت تھی کہ وہ پنجابی مسلمانوں

کے بہکاوے میں آجاتے ہیں اور حُکام کی بھی پروانہیں کرتے وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ کشمیری مسلمان محکوم بھی تھے اور مظلوم بھی۔

اسی خط میں اُنہوں نے اس امر پر بھی افسوس کیا ہے کہ کشمیری پنڈتوں کی کوئی تنظیم نہیں ہے وہ کشمیر پنڈتوں کی بالخصوص قومی بہبود کے منصوبے بنارہے تھے چنانچہ ایک خط میں فرماتے ہیں۔

''اگر سالانہ جلسہ تک پرماتمانے مجھ کو صحت دی تو دو تین ریفارم پیش کروں گا۔ مدرسوں کا اجرا تعلیم نسواں کی وسعت، بیواؤں کی دستگیری...... بال وِدھوا وِواہ''

پنڈت ہرگوپال خستہ دردِ گردہ میں مبتلا تھے جس کا ذکر اُنہوں نے ایک خط میں کیا ہے جسکا اندازِ تحریر بھی قابل توجہ ہے جسے پڑھ کر'' آرزو لا انتہا فرصت قلیل''، منظر و کیفیت والا شعر بے تحاشہ، یاد آتا ہے۔ اُن کا ذوق عمل بھی قابل داد ہے بقول غالبؔ ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

''واقعات دُنیا روز بہ روز نیا سبق سکھلا رہے ہیں۔ کوئی ہمدرد نہیں سینہ کھول کر دِکھلا دوں۔ بڑھاپے اور دردِ گردہ نے نکما بنا دیا ہے۔ کام تو ہو ہی نہیں سکتا۔ قلم ہاتھ میں لیتے ہی کانپنے لگتا ہے۔ مگر اُمنگیں زیادہ تر تیز ہوتی جارہی ہیں۔''

اپنے گردو پیش پر نظر ڈالتے ہوئے وہ ذوقِ عمل، وہ لگن وہ تڑپ اور بنی نوع انسان کی بہبود کے لیئے وہ خلوص اب ناپید ہے۔ پنڈت خستہؔ کا تخاطب اگرچہ بالخصوص کشمیری پنڈت برادری کی طرف ہے، لیکن اُسے پھر بھی

محدود نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اُن کی اپنی مادرِ وطن کشمیر سے محبت کسی بھی شک شبہ سے بالاتر ہے جس کی کوکھ سے ہم سب نے جنم لیا ہے۔ یہی وہ بنیادی وجہ اور بلند آدرش ہے جسکے پیش نظر وہ وطن مالوف کو پنجاب سے لوٹ آئے اور یہاں جبر و استبداد کے خلاف اُسوقت آواز بلند کی جب یہاں کی سیاسی زندگی مفلوج ہو چکی تھی۔

اُمنگیں مری آرزوئیں مری اُمیدیں مری جستجوئیں مری
مرا دل مری رزم گاہِ حیات گمانوں کے لشکر یقین کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لُٹا دے اِسے
لُٹادے ٹھکانے لگادے اِسے

(علامہ اِقبالؒ)

اس مضمون کی تیاری میں، میں نے اُردو زبان کے ممتاز ادیب محقق اور اُستاد مرحوم پروفیسر عبدالقادر سروری کی کتاب ''کشمیر کے دو بھائی'' ''دوادیب'' کا استفادہ کیا ہے جس کی فراہمی کے لئے میں کشمیری زبان کے صاحب طرز غزل گو جناب غلام نبی ناظر کا بہت ہی مشکور ہوں۔

(س۔ر۔پ)

# کُندن لال سہگل

جموں کی سرزمین اس لحاظ سے بھی خوش بخت ہے کہ یہاں کی مٹی سے پیدا ہونے والی ممتاز شخصیات میں ایسے لوگ شامل ہیں جنہوں نے مصوری، ادب اور موسیقی جیسے فنونِ لطیفہ کے شعبوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں انسانی سماج کی قدیم ترین روایات میں موسیقی کو نہایت ہی اہم مقام حاصل ہے، جس کا اگر حیات اور کائنات کے حوالہ سے بھی مطالعہ کیا جائے تو مناسب ہوگا کیونکہ نظم و آہنگ کے بغیر اس رنگا رنگ اور وسیع زندگی کا وجود ہی ناممکن ہے پھر اگر کسی انسانی وجود کی گتھی میں اللہ کی عنایت سے موسیقی کا غالب عنصر شامل ہوا ہو تو اُس مقدور کا کیا کہنے کیونکہ ع

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست

اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ فرمانرواؤں اور حکمرانوں کی سرپرستی سے بھی اپنے وقت کے صفِ اول کے موسیقار اور گلوکار کلا کے اُفق پر چمکے لیکن یہاں بھی بُنیادی اہمیت اُن کے فانی وجود میں فن کی لامتناہی اور لافانی خداداد صلاحیتوں کو اوّلیت حاصل ہے۔ ع

ہر کسے را بہر کارے ساختند

جموں ہی کے اُدمادت شرما کے فرزند ارجمند جناب شوکمار شرما نے

کشمیر کی صوفیانہ موسیقی کے بنیادی کلاسیکی ساز سنطور کو ساری دنیا میں متعارف کرایا۔ اس طرح اُنہوں نے نہ صرف جموں وکشمیر نام کے روشن کیا بلکہ اپنی بے پناہ اختراعی اور تخلیقی صلاحیتوں کا صف اول کے سنطور نواز کی حیثیت سے ساری دنیا میں لوہا منوایا۔ صوفیانہ موسیقی کی حدود سے سنطور کو نکال کر دُنیائے موسیقی کے مسلمہ سازوں کی پُرسوز محفل میں شامل کر کے شِو کمار شرما نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

ملکہ پوکھراج جو اب پاکستانی شہری ہیں اور جو ۱۹۸۸ء میں دورۂ ریاست جموں کشمیر پر آئی تھیں، ۱۹۴۷ء سے پہلے فضائے موسیقی کو اپنی مترنم اور پُرسوز لے سے مہکاتی رہیں۔ یہاں کے شاہی دربار سے ملکہ پوکھراج کے قریبی روابط کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ چونکہ فن جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے اس لئے ملکہ پوکھراج ہمسے دور ہو کر بھی ہمارے دل کی دھڑکنوں میں موسیقی کی لہروں کی صورت موجود ہے۔ اس ضمن میں طبلہ نواز اُستاد اللہ رکھا خان، جنہیں طبلہ نوازی کے فن کے میدان میں قابل قدر خدمات کے اعتراف میں جموں وکشمیر کلچرل اکیڈیمی کی جانب سے فروری ۱۹۸۹ء میں فیلوشپ عطا کیا گیا، کا ذکر کئے بغیر یہ مضمون ادھورا رہے گا۔ یہ سبھی چوٹی کے فنکار جموں سے ہجرت کرنے کے باوصف ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہمارا سر اُنکا نام لیتے ہوئے اُونچا رہتا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب آیئے ذرا بڈیالی برہمنہ، رنبیر سنگھ پورہ جموں (نواشہر) کے اداکار، گلوکار اور مقبول ترین فلمی کلاکار کی مختصر، پُرخطر، پُرشوق وپُرمعنی

زندگی پر نظر ڈالیں جو ۱۸ر جنوری ۱۹۴۵ کو صرف بیالیس سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے لاکھوں مداحوں کی سوگوار چھوڑا۔ میری مُراد سرگباشی کندلال سہگل سے ہے جن کی زندگی موسیقی اور فن سے عبارت تھی جس کے لئے وہ بچپن ہی سے ہر چھوٹی بڑی مشکل کا گھر اور گھر سے باہر ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا جب تک اُس کے خوابوں کی دُنیا آباد ہوئی اور جب تک فلمی دنیا کے مقبول ترین ستارے کی حیثیت وہ فن کی بلندیوں کو چھونے میں کامیاب ہوا۔ وہ ازل سے لا اُبالی طبعیت اور سوز وساز لے کر آئے تھے، جس کا کُندن لال سہگل نے بھر پور اور ہر ممکنہ حد تک استفادہ کیا، یہی اَبدی مسرت کا سامان ہے جو ایک فنکار کو کسی طور چاہئے۔

ایسے فنکار بہت کم ہوتے ہیں جن کے سراُنکے جیتے جی وقت شہرت کا تاج رکھتا ہے۔ کُندن لال اُنہی معدودے چند خوش بختوں میں سے ایک ہے جس نے اپنے فن کا سورج اپنی آنکھوں سے بامِ عروج پر چمکتا دیکھا اور جو اپنی زندگی میں ہی داستان بن گیا تھا۔ ساز وآواز کا یہ زائر اپریل ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوا جب ریاست جموں وکشمیر پر، پرتاپ سنگھ کا راج تھا۔ کُندن لال سہگل کے والد تحصیلدار تھے جو ریٹائر ہونے کے بعد جالندھر چلے گئے اور وہیں بس گئے۔ ننھا سہگل بچپن ہی سے موسیقی کا رسیا تھا۔ یہیں سے اُس کی زندگی کا کٹھن سفر شروع ہوتا ہے۔ موسیقی سے لگاؤ رکھنے اور گانا بجانے والوں کو سماج میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ شاید یہی سب سے بڑی وجہ ہے موسیقی کا فن ملک بھر میں اگلے وقتوں سے مذہب اور دھرم کے سایہ میں پروان چڑھا۔ ننھے سہگل کے وقت بھی موسیقی کے بارے میں بات برملا نہیں کہی جاسکتی تھی اور لوگ چوری چھپے اپنا یہ فطری شوق پورا کرتے تھے۔ سہگل کی ماں کیسر نے اپنے بیٹے

کی مخفی صالاحیتوں کو پہچان لیا تھا۔ جس نے اُسکے فطری شوق کو جلا بخشی ۔ وہ ہیر کے گیت گنگناتی تو ننھا سہگل اُسکے سُر کے ساتھ سُر مِلا کر جیسے اپنے مقدر کو سنوارتا۔ اُسکی پڑھائی مایوس کُن تو تھی لیکن سہگل کی مشفق ماں کو پکا یقین تھا کہ اُس کا بیٹا اپنے فن سے اُن کا نام روشن کرے گا۔ موسیقی کے ازلی عاشق اور اُس کی ماں کے بے لوث محبت سے بھرپور رشتہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک موقعہ پر، پریاگ سمتی الہ آباد کے زیر اہتمام ایک میوزک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اپنے وقت کے سر برآوردہ ماہرین فن اور اساتذہ، پنڈت اومکارناتھ ٹھاکر، اُستاد فیاض خاںؒ ، ڈی ۔ وی پلسکر نارائن راؤ ویاسؒ اور وِنایک راؤ پٹوردھنؒ رونق محفل تھے ۔ جونہی کُندن لال سہگل ہال میں داخل ہوا تو معزز سامعین نے یک آواز ہو کر سہگل ! سہگل کی گونج کے درمیان اُس کا گرمجوشی اور محبت سے استقبال کیا۔ ماں کیسر اور اُس کی بیوی آشارانی بھی اُس کے ساتھ تھی ۔ سہگل نے سادہ سے ہارمونیم پر دیوداسؒ ، یہودی کی لڑکی، چاندی داس اور سٹریٹ سنگر فلموں کے وہ گانے گائے جنکو اُس نے اپنی جادو بھری پُرسوز اور مدھر آواز سے امر بنایا تھا۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے تقریب اِختتام کو پہنچ چکی تھی۔ فرمائشوں پر فرمائش آرہی تھی کاغذ کے پُرزوں پر لکھ کر فلاں گانا گاؤ، یمن گاؤ، سندھوری گاؤ ۔ پھر گاؤ ! پھر گاؤ ! سہگل سٹیج سے اُتر کر ہال میں آ گیا، تالیوں کو گونج میں مسرت سے سرشار ہو کر ماں کو، اپنے ہاتھوں پر، اپنے سر سے اُوپر اُٹھائے گھمایا یہ کہتے ہوئے ہیں کہ ’’سُن ماں سُن ! یہ لوگ تو میرے لئے آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے ہیں کہ میں اُن کے لئے گاؤں انہیں میرا رُکنا گوارا نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں گلوکار اور موسیقار ہوں‘‘۔ ماں نے ایسا کرنے سے لاکھ منع کیا لیکن وہ کہاں تھا اُس کی بات ماننے والا۔ اُس کی ماں کو ایسا لگا جیسے کہ

اُسے اپنے لاڈلے بیٹے کے بارے میں دیکھے ہوئے سپنے سچے لگنے لگے ہوں۔ اُس کے بیٹے کی مدھ بھری آواز نے دُنیا کو گرویدہ بنادیا تھا۔ اُسے کئی جوتشیوں سے بنائی ہوئی جنم کُنڈلیوں کے مطابق معلوم تھا کہ وہ تیزی سے اپنی زندگی کے انجام کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اُسے جواں مرگ ہونا ہے لیکن اُس سے پہلے اپنی سدا بہار سُنہری آواز میں موسیقی کے سربستہ رازسروں کو صدا بند کر کے امر بنانا ہے۔

سہگل کا ہر شہر میں جہاں وہ رہا ایک نہ ایک جوتشی تھا، مراد آباد میں یوگیشور شاشتری، کلکتہ میں بدری پرساد شاستری جس کی لڑکی پوربی کو سہگل نے بھجن اور ہوری گانا سکھایا، جن کے ساتھ سہگل کے ذاتی مراسم تھے۔ دہلی کے نجومی کا نام بشوا ناتھ راج گھڑیا تھا۔ جو اُن دنوں نئی سڑک کے علاقہ میں رہتا تھا بہ زعم خود مقدر کے یہ سبھی رازدان سہگل کو بہت قریب سے جانتے تھے عجیب اتفاق ہے کہ بمبئی میں جہاں سہگل نے زندگی کے آخری ایّام گذارے۔ اُس کا کوئی نجومی نظر نہیں آتا۔ شاید اس لئے کہ اُس کو معلوم تھا کہ زندگی خود بھی بلائے ناگہانی ہے۔ نجومیوں سے لینا دینا کیا۔ جیو دو گھڑی اپنی من پسند زندگی اور بس

قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم

وہ بلائے ناگہانی اور ہے!

جالندھر میں اپنے والد کا گھر چھوڑ کر رہ نوردِ عشق ہو کر مراد آباد پہنچ جاتا، جہاں کا قیام اُس کی آئندہ زندگی میں دوررس نتائج کا حامل ثابت ہو جاتا ہے۔ جہاں کا سارنگی نواز امتیاز احمد سہگل کے ساتھ پہلی ملاقاتوں کا ذکر محبت وشفقت اور فخر سے کرتا ہے اُسے عبدالکریم خان کے گاین کا سارنگی نواز کی حیثیت سے ساتھ دینا تھا۔ اُس کے لئے بھی یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی بڑی اور اہم تقریب

میں ایک بڑے کلاکار کا ساتھ دے رہا تھا، وہ بھی جب اتفاق سے عبدالکریم خان صاحب کا اپنا سارنگی نواز کسی وجہ سے شریک محفل نہ ہوسکا۔ اس پروگرام کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ مراد آباد کا فرنگی نژاد سٹیشن ماسٹر بھی یہاں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف لانے والے تھے۔ امتیاز احمد کے کہنے کے مطابق اُسے بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ سٹیشن ماسٹر کی بیوی نے سہگل کو پڑھنا، لکھنا اور بولنا بھی سکھایا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ سہگل جسکو اُس نے کئی بار ریلوے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا بھی سامعین میں شامل تھا ایک نہایت ہی دُبلا پتلا نوجوان اپنے خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہمہ تن گوش تھا۔ سہگل کرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ ہارمونیم پر بازار میں گانے والا گلوکار پہلے ہی سر کے بال جھڑ چکا ہے اور وہ وِگ کے سہارے فطرت کی اس ستم ظریفی پر خندہ زن ہے اس کے بعد ایک دن سہ پہر کو امتیاز احمد ایک خط ڈاک میں ڈالنے کیلئے ریلوے پلیٹ فارم پر گیا، جہاں اُس نے اُسی دُبلے پتلے لڑکے (سہگل) کو ڈاک کی تھیلیوں کے ڈھیرے پر بیٹھا ہوا پایا۔ یہاں بڑی تنہائی تھی اور دوسری ٹرین گھنٹوں بعد آنے والی تھی۔ مارچ مہینہ تھا جب وہ وہاں سے گزرا تو سہگل گا رہا تھا۔ اُس نے غور سے سُنا تو معلوم ہوا کہ سہگل جھنجوٹی اور ٹھمری گا رہا ہے، جسکے گائن میں عبدالکریم خان نے نام پایا۔ امتیاز احمد کا کہنا ہے کہ وہ حیران اسلئے نہیں ہوا کہ وہ اپنی دُھن میں مگن گا رہا ہے بلکہ اسلئے کہ وہ وہی گانا گا رہا تھا جسکے لئے میں نے چند روز پہلے عبدالکریم کیساتھ سارنگی پر سنگت دی تھی۔ سہگل دنیا و فیہا سے بے خبر گا رہا تھا۔ امتیاز احمد انتظار کرتا رہا جب تک سہگل گانا ختم کر چکا۔ اُس نے اُسے اپنے گھر لیا جہاں فضائے بسیط کا نظارہ کرتے ہوئے وہ اُسے پوچھنے لگا۔

''تم نے کس سے یہ فن سیکھا ہے''۔

''کسی سے نہیں۔ دُبلے پتلے لڑکے نے جواب دیا''۔

''لیکن گانا گاتے ہوئے لگتا تھا کہ تم کوفن موسیقی پر بڑی دستگاہ حاصل ہے، امیتاز احمد نے پھر کہا''۔

''یونہی نقل اُتارتا تھا، سہگل نے پھر کہا''۔

امتیاز کو اس بات پر کوئی یقین نہیں آیا۔ اُس نے اپنی سارنگی ہاتھ میں لے لی اور سہگل سے کہا کہ تم کوئی اور گانا گا سکتے ہو؟

صرف کچھ غزلیں اور بھجن۔

امتیاز نے سارنگی کو اپنے فنکارانہ انداز میں چھیڑا اور سہگل سے اصرار کرنے لگا'' کچھ تو گاؤنا!''

سہگل نے غالبؔ کی یہ غزل اپنی درد بھری آواز میں چھیڑی ؂

دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں

خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہوں[1]

اس کے بعد سہگل بغیر تیاری کے کامیابی سے گانے لگا۔ اس کے باوجود کہ وہ کسی گرو، یا گھرانے کا تربیت یافتہ نہیں تھا کیونکہ وہ تو الفاظ اور شبدوں میں چھپی موسیقی کا راز دان تھا۔ کے۔ ایل۔ سہگل کے فن اور اُس کی زندگی بامِ عروج تک پہنچانے کے دعویداروں میں بی۔ این سرکار، پنکج ملک، آر۔ سی۔ بورل دیوکی بوس اور پھنی مجمد ارشامل ہیں۔ بی۔ این۔ سرکار نیو تھیٹرز کا مالک تھا، جو ایک طرح کی فلمی کمپنی تھی اُس نے سہگل کو وہاں پر ملازم لگا یا۔

1. سہگل اُردو کیعلاوہ فارسی، پنجابی، بنگالی اور ہندی زبانوں میں پورے اعتماد کے ساتھ گاتا تھا۔

اب اصل مسلہ تو یہ تھا کہ اُس کی خداداد فنکارانہ صلاحیتوں کو کیسے معقول طریقہ سے کام میں لایا جائے۔ ایک دن آر۔سی۔ بورل نے سہگل کو نیو تھیٹرز کے آڈشن روم میں لیا۔ فرش پر بٹھا کر اُسے ہارمونیم لاکر دیا۔ سہگل نے جونہی اپنے جادو بھرے ہاتھوں سے ہارمونیم کو چھیڑا لوگ اِدھر اُدھر سے آکر اُس کے گرد جمع ہوئے۔ اُس نے پہلے بھجن گایا پھر غزل بھی گائی۔ راگ یمن اور باگیشوری سے خیال کی جانب لپکا۔ سبھی لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سُن رہے تھے۔ اس طرح نیو تھیٹرز کے ساتھ اُس کی بے پناہ فنی صلاحیتوں کے اعتراف میں اُسکا کام کرنے کا تحریری معاہدہ ہوا۔ اُس کے فن کا ستارہ اس طرح اُفق پر نمودار ہوا۔ سب سے پہلے اس کمپنی کی طرف سے تیار کی گئی فلم ''محبت کے آنسو'' کے لئے سہگل نے گانے گائے۔ اُس کے بعد ''صبح کے ستارے'' ''زندہ لاش'' اور پھر ''رامی اور چندی'' جو نہایت ہی کامیاب رہی، فلموں کو اُس نے اپنی آواز سے سوز و ساز عطا کیا۔ لیکن یہ فلم ''دیوداس'' ہی تھی، جسنے سہگل کی خوش بختی کے سارے دروازے کھول دئے اور اُس نے سدا بہار نیستان میں قدم رکھا، جہاں سے وہ پھر کبھی واپس نہیں لوٹا۔ اس ضمن میں آر۔سی۔ بورل کے پُر خلوص تعاون کو بھی کافی دخل ہے، جس نے سہگل کی گتھی میں چھپی بے پناہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے جتن کئے۔ بنگالی فلم ''دیوداس'' میں جو گانے سہگل نے گائے اُن کے بول یہ تھے۔

کہارے جے جو ڈو تھے چھے
گولاب ہوئے اُٹھک چُٹے

یہ گانے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت پنکج مُلک کو گانے تھے لیکن سہگل کو مختلف صبر آزما مراحل سے گزر کر یہ گانے تجرباتی طور گانے کو ملے۔

اُس نے ان گانوں کے مطالب صدا بند کرنے سے اسلیئے بھی سیکھے تاکہ وہ ان میں چھپی مدد بھری موسیقی کی تہہ تک جا سکے کیونکہ یہ قحبہ خانے کے مخصوص حالات کی آئینہ داری کرتے تھے شرت چندر کے مشورہ پر اسلیئے بھی سہگل کی آواز میں یہ گانے گوائے گئے کہ قحبہ خانوں میں صرف بنگالی ہی نہیں بلکہ دوسری زبانیں بولنے والے بھی آتے ہیں۔ سہگل اس طرح بنگالیوں میں بھی مقبول ہوا اور فلم بھی کامیابیوں سے ہم کنار ہوئی۔ بہت کم لوگوں کو اندازہ ہوسکا کہ گلوکار غیر بنگالی ہے اسی فلم کے ہندوستانی روپ میں سہگل نے ''دیوداس'' میں لافانی اداکار اور گلوکار کی حیثیت سے کام کیا۔

سہگل کو اپنی مشفق ماں کی وساطت سے موسیقی کا ماحول نصیب ہوا۔ نصیب کیا ہوا بلکہ ورثہ میں ملا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ وہ ابھی دس سال کے سن کو بھی نہیں پہنچ چکا تھا کہ اُس نے جموں کی معمول کی سالانہ رام لیلا تقاریب میں سیتا کا رول نہایت کامیابی سے نبھانا شروع کیا۔ سہگل کا باپ امر چند سہگل سامعین کی اگلی صف میں بیٹھ کر ننھے سہگل کی مؤثر اداکاری سے محظوظ ہوتا۔ دراز قد سر پر پگڑی باندھے، باصد کروفر بیٹے کا موسیقی اور اداکاری سے اُنس بچپن کے عارضی دور کے طور بادل ناخواستہ برداشت کر ہی لینے میں عافیت تصور کرتا تھا۔ چونکہ سہگل پڑھائی لکھائی کی طرف کم ہی دھیان دیتا تھا، اس لئے اُسے اپنے سخت گیر باپ سے نہ صرف ڈانٹ بلکہ مار بھی کھانا پڑتی تھی، جسکی وجہ سے سہگل نے اپنے باپ سے دوسرے بھائیوں کی طرح کسی نت نئی چیز کا تقاضا نہیں کیا۔ جموں کے ایک مقامی خدا ترس نیک سیرت بزرگ جناب سلمان یوسف کی اُس پر پیدائش ہی سے نظر کرم تھی، یہ اُسی کا فیضان تھا کہ سہگل موسیقی کی پُراسرار دُنیا میں کھو گیا۔ جب اُس کی ماں کیسر کو کچھ نہ سوجھی

تو وہ ننھے سہگل کا ہاتھ تھامے سلمان یوسف کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اُسے سارا ماجرا سُنایا۔ سلمان صاحب نے اُسے ذکر و ریاض میں مگن رہنے کو کہا۔ اُنہوں نے اُسے یقین دِلایا کہ سب کچھ اپنے وقت پر ٹھیک ہوگا۔ تیرہ سال کی عمر میں اُسکی آواز میں فطری تبدیلی ہوئی وہ بے سرا ہوا۔ سلمان یوسفؒ کی مہربانی جو تھی۔ سہگل خود اپنے ایک دوست علی بخاری کو بتاتا ہے کہ وہ باضابط بارہ سال کی عمر میں درویش شیخ سلمان یوسف کے حجرے میں ایک ٹھنڈی شام کو اُنہی کی نظر عنایت سے پیدا ہوا۔

اس واقعے کے تین سال بعد سہگل کے والد امر چند سہگل تحصیلدار کے منصب سے ریٹائر ہوئے اور اُن کا خاندان نواشہر (آر۔ ایس۔ پورہ) جموں سے جالندھر چلا گیا جہاں اُنہوں نے مستقل طور سکونت اختیار کی۔ امر چند سہگل نے وہاں رہ کر ٹھیکیداری بھی کی اور خوب پیسہ بھی کمایا۔ سہگل سلمان یوسف کی نظر کرم کی آس کا دامن تھامے رہا۔ وہ جالندھر کے نئے گھر کو خیر باد کہہ کر اپنی خوابوں کی دنیا آباد کرنے کی راہ ہو لیتا ہے۔ اُسے بقول حافظ معلوم تھا کہ محبت کی تعمیر میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتی، ورنہ اس دنیا میں کوئی بھی چیز رہنے والی اور پائیدار نہیں ہے۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است!

جالندھر میں سہگل خاندان پنج پیر گیٹ کے قریب آباد ہوا، جسے اب سہگل محلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دیوانے کی عجیب وضع بھی دیکھئے کہ سہگل گھر چھوڑ کے جہاں بھی گیا، وہاں جو بھی خط ڈاک کے ذریعہ ڈالتا، دوسرے شہر جا کر روانہ کرتا، تا کہ اُسکے گھر والوں کو اُسکی اصلی رہائش کے مقام کا

پتہ نہ چلے۔ اسلئے بس افواہیں اُڑتی رہیں کہ وہ بریلی میں ہے، کانپور، لکھنؤ اور شملہ پہنچا ہے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ بہار میں ہے اور کان کن مزدوروں کے ساتھ شامل ہوا ہے۔ جو اُسے فضول تلاش کرنے چلے، اُنہوں نے آکر کہا کہ وہ فلمی ستاروں اور اداکاروں کے کاروان کے ساتھ ملکر بمبئی پہنچ گیا ہے۔ معلوم تھا کہ اس صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان کے فلمی دُنیا کے تان سینؔ کی قسمت کا ستارہ آر۔سی۔ بورَل کی دور اندیشی اور وروں بینی پر مبنی مساعی جمیلہ سے چمکنے والا ہے۔ یہاں سہگل کی حالت یہ تھی کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس لئے اُس نے ''محبت کے آنسو'' صبح کے ستارے ''زندہ لاش'' جیسی فلموں میں سہگل نے کشمیری کے نام ہی کام چلایا تا کہ گھر والوں اور اپنے احباب وا قارب کی گرفت سے بچ سکے۔ یہاں پر یہ بتا دینا بے محل نہیں ہوگا کہ کلکتہ کی فلمی کمپنی نیو تھیٹرز میں سہگل کے تقرر کے وقت اُس کی عمر چھبیس سال تھی اور اُس نے اپنے روحانی پیر و مرشد شیخ سلمان یوسف کی شاگردی میں بارہ برس سے زیادہ کا عرصہ پورا کیا تھا۔ فلمی اداکاری سہگل کا پیشہ اور موسیقی اُس فانی وجود کا لافانی جوہر۔ لوگوں کو کیا وہ تو اُسے اداکار ہی کی حیثیت سے جانتے تھے جو گانا بھی گاتا تھا۔ اُن دِنوں رواج تھا جو اداکار ہیرو، ہیروئن کا رول نبھاتا وہ خود ہی گلوکار بھی ہوتا تھا۔ سہگل کی طبیعت شاعرانہ تھی اسلئے گانے سے پہلے وہ اشعار میں باندھے الفاظ میں چھپے معانی کی تہہ تک جاتا تھا، تاکہ انجانے میں اُسے نہ خود سے اور نہ شاعر سے زیادتی کی ناقابل معافی خطا سرزد ہو۔ موسیقی کا کوئی بھی شائق اور کے۔ ایل۔ سہگل کا فدوی آج بھی گراما فون کمپنی آف

(انجیل لیبل) جن کے کوڈ نمبر نیچے دِئے ہیں رکارڈ حاصل کر کے محظوظ ہوسکتا ہے۔

کوڈ نمبر ای۔اے۔ایچ۔اے ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۴ دی گولڈن وائس آف کے۔ایل۔سہگل

والیوم ۱، ۲، و ۳

ان رکارڈوں میں وہ گانے صدابند ہیں جو کے۔ایل۔سہگل نے فلموں کیلئے گائے ہیں، جن میں چندی داس، یہودی کی لڑکی، پریذیڈنٹ، کاروان حیات، دی سٹریٹ سنگر، زندگی، دُشمن فلمیں شامل ہیں۔

کوڈ نمبر۔ایچ۔اے

گانے جو صد بند ہیں:-

۱۔لاکھ صیحح پی کی بتیا

۲۔لگ گئی چھوٹ

۳۔اپنی ہستی کا اگر حسن نُمایاں

۴۔عشق مجھ کو نہ سہی وحشت ہی سہی

کوڈ نمبر۔ایل۔ایچ۔۸۔

۱۔شمع کا جلنا ہے

۲۔رحمت پہ تیری

۳۔گھر یہ تیرا سادہ نہ میرا ہے

۴۔آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک۔

کوڈ نمبر۔ایل۔ایچ۔۴۰

۱۔ہر اِک بات پہ

۲۔ وہ آ کے خواب میں

۳۔ دل سے تیری نگاہ جگر تک اُتر گئی

۴۔ بہت اس گلی میں کیئے۔

کوڈ نمبر۔ ایل۔ ایچ۔ ۲۶

۱۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

۲۔ کون بجھائے راما!

۳۔ نکتہ چیں ہے غمِ دِل

۴۔ یہ تصوف اللہ اللہ

ایک طویل رکارڈ پر سہگل او رنیج ملک کے گائے بنگالی گانے صدابند کیئے گئے ہیں۔ یہ گانے رابندر سنگیت پر مبنی ہیں اور ٹیگور کے نام نذر کیئے گئے ہیں۔ ہندوستان میوزیکل پروڈکٹس کا کوڈ نمبر ہے، ایل۔ ایچ۔ ایکس۔ ۸ کچھ گانوں کے بول یہ ہیں:۔

۱۔ آمی تومے جاتو

۲۔ اِکتکو چھونیا لاگے

۳۔ تومار بنائے گان چھلو

۴۔ آج کھیلا بھگار کھیلا

۵۔ آدن آجی کون گھرے گو

یہ رکارڈ پنکج ملک کے پانچ اور سہگل کے چھ گانوں پر مشتمل ہے۔ دوسرا بنگالی گانوں پر مشتمل رِکارڈ، ایکسٹنڈڈ پلے۔ ایل۔ اے۔ ۶۹ ہے۔ گانوں کے بول یہ ہیں۔

۱۔ اے پیے چھِ اُئن جلا

۲۔ نایبا گھمالے پریو

۳۔ جا مھن رو بونا اَمی

۴۔ بھاند ھنو مچھے گھر

کے۔ ایل سہگل کی فنکارانہ شخصیت کو پروان چڑھانے میں ہندوستانی موسیقی کی لوک اور کلاسیکی روایات کا بڑا ہاتھ ہے، جن کی جڑیں اُسکی مشفق ماں کی گود میں پیوست تھیں۔ وہ جہاں بھی گیا اُس نے اپنے شوق کی تشنگی کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ اُسکو بڑھانے کی کوشش جاری رکھی۔ اُس کا تو بقول غالبؔ یہ رویہ رہا ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں!

سہگل کی زندگی اور اُس کے فن کا جائزہ لینا اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں، خاص کر جب کہ معقول مواخذ کا فقدان ہو۔ البتہ یہ بات بلا تامُل کہی جاسکتی ہے کہ سہگل کی شخصیت اور فن میں فطری سادگی تھی جو اُسکی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ بنی کیونکہ یہی وہ بظاہر آسان چیز ہے جو بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ سہگل کو ہمیشہ اس بات کی کسک رہی کہ وہ کسی گھرانے یا بڑے اُستاد کا تربیت یافتہ شاگرد نہیں۔ اسے ایک بے بنیاد نفسیاتی اُلجھن ہی کہا جاسکتا ہے اور کچھ نہیں کیونکہ ایک موقعہ پر اُسکی ملاقات آفتاب موسیقی جناب فیاض خان صاحب سے ہوئی۔ اُس نے راگ درباری میں خیال پیش کیا۔ جناب فیاض خان صاحب نے سن کر فرمایا ''برخوردار! اب کوئی چیز نہیں جو میں تم کو سکھاؤں اور تم بڑے موسیقار بنو۔ تمہارا فن تکمیل کے آخری مرحلہ میں ہے''۔ سہگل ذیابیطس کا مریض تھا۔ اوائل عمر ہی سے پھوڑے پھنسیوں سے اُسکا سارا بدن بہت دُکھتا تھا، وہ شدید درد سے کراہتا رہتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس کو شراب نوشی نے مارا۔

آخر کار وہ جگر کے عارضہ میں مبتلا ہوا، اس طرح ہم سے ہماری دُنیائے موسیقی کا مقبول ترین گلوکار بے وقت اور جواں سالی میں جدا ہوا۔ اُس نے فن سے محبت کی۔ زندگی سے محبت کی۔ وہ انسان کو بلا لحاظ مذہب و ملت اور رنگ و نسل پیار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ موت سے بھی محبت کرتا تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ ہر شام بمبئی کے شمشان گھاٹ پر جا کر کچھ وقت وہاں گزارتا۔ شاید وہ اپنی زندگی کے انجام کو جیتے جی اپنی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر غالبؔ کا یہ شعر بھی گُنگناتا تھا ؎

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

مقدُور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

سہگل کے خاندان کے تفصیلی حالات اور اُسکے لواحقین[1] کے بارے میں مزید جانکاری حاصل کرنے کی خاطر تحقیق و جستجو کی کافی گنجائش ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سہگل کے آبائی گاؤں اور یہاں جموں میں اُسکے نام یادگاریں قائم کی جائیں تا کہ سہگل کے فن اور زندگی سے بے پناہ محبت کا مشن جاری رہے کیونکہ وہ رہ نور و عشق ہونے کے ناتے ہمارے درمیان موسیقی کے پُر اسرار اور دلربا نغموں کی صورت موجود ہے، گو کہ اُسکا جسم اس پیاری اور انوکھی دنیا سے اُٹھ چکا ہے، کیونکہ زندگی کا بھرم ایسے ہی دیوانوں سے قائم ہے بقول حافظ ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دِلش زندہ شُد زعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

[1] سہگل کے دو داماد علی اور مہندر چوپڑا، کے بس نام معلوم ہیں۔ باقی احباب خانہ کے بارے میں ابھی تک معلومات دستیاب نہیں۔

اُن کی موت کے تنتالیس سال بعد بھی ہمیں یہ توفیق کہاں نصیب کہ ہم سہگل کو ڈوگرہ تسلیم کرائیں ۔ بیرون ریاست محققوں کی نظر میں وہ تو ابھی تک پنجابی نژاد ہے۔ سہگل کے فن نے یہ سبھی حد بندیاں پھاندلی ہیں ۔لیکن جب ماں ہی اپنے بچے کو گود نہ لے تو اُس سے بڑھکر ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے۔

مصور جامنی رائے جو کے ۔ ایل ۔ سہگل کو نیو تھیٹرز کلکتہ میں ابتداء ہی جانتے تھے کے الفاظ میں وہ ایک ایسا اچھوتا اعلیٰ اور سادہ کردار تھا، جس کی توضیح کے لئے عام انسان قاصر ہے اُسے ایک ایسا پیکر مان لیجئے جو کسی مقدس پیشہ سے پھوٹ پڑا ہو دنیا و فیہا اور اپنے آپ سے بے خبر کسی لائین ڈرائنگ کی مانند"۔[۲] میں بقولِ پروین شاکر صرف اتنا کہہ سکتا ہوں ؎

خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے
موج ہوا کے ہاتھ میں اُس کا سُراغ ہے

۱۔ اُردو کے ممتاز کہانی کار اور ادیب جناب رام لعل اپنے پاکستان کے سفرنامہ "زرد پتوں کی بہار" میں لکھتے ہیں کہ پاکستان میں کے ۔ ایل ۔ سہگل کے ایک مسلمان فدوی نے سہگل کے گائے گانوں پر مشتمل سبھی گراما فون ریکارڈ اور اُن سے متعلق مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ جملہ اطلاعات پر مبنی نجی لائبریری قائم کی ہے اس طرح جس طرح اپنی والہانہ محبت کا اظہار ایک ہندوستانی غیر مسلم اپنی دوپہر کی چائے مولانا ابوالکلام کی قبر پر حاضری دیتے ہوئے روزانہ چائے نوشی سے کرتے ہیں

۲۔ اس مضمون کی تیاری میں میں نے جناب راگھو آرمین کی انگریزی کتاب "کے ۔ ایل ۔ سہگل" سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ جو کلچرل اکیڈیمی کی جموں لائبریری کی زینت ہے۔

# مِس میلنسن

کوئی بھی بیرونی قوم اس وقت تک کسی مُلک کی سرزمیں پر اپنے قدم مضبوطی سے نہیں جما سکتی جب تک نہ وہ وہاں کی آبادی کے ثقافتی اور تمدنی باطن کے تقاضوں کو سمجھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی تہذیب کے گوناگوں پہلوؤں کو جاننے اور ان کی تہہ تک جانے کی سنجیدہ کوششیں کیں۔ چنانچہ تحقیق وتدوین اور ترجموں کا کام ہاتھ میں لیا گیا۔ فلاکت زدہ، پسماندہ اور توہم پرست عوام کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے مشنری سکول (Missionary school) قائم کئے گئے جیسا کہ ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے۔ جدید وقدیم کی آپس میں ٹھن جاتی ہے۔ چنانچہ عیسائی مشنریوں کو بھی یہاں کشمیر میں کٹھ ملاؤں اور کٹر پنتھیوں کی لازمی اور شدید مخاصمت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تاریخ کے پہیوں کو پیچھے کی طرف موڑنا چاہتے تھے لیکن کامیاب کہاں ہوتے۔ رفتہ رفتہ اُن کا زور واثر کم ہوتا گیا اور یہاں عیسائی مشنریوں کے ہاتھوں جدید تعلیمی اداروں کی بنیاد پڑی۔ آج کا میلنسن سکول بھی انہی موقر اداروں میں سے ایک ہے۔ اوّلین سی۔ ایم۔ ایس سکول کی بنیاد جے۔ ایچ۔ (نوولز J.H.Knowels) کے مبارک ہاتھوں سرینگر میں ۱۸۸۰ء میں حکومتِ وقت کی ممانعت کے باوصف پڑی۔ قانون کی زد سے بچنے کے لئے مشنری ہسپتال سرینگر کے احاطے میں انتہائی نازک حالات میں سکول کا کام جاری رکھا گیا اور پھر ۱۸۹۰ء میں حکومت کی طرف سے

پابندی اُٹھائے جانے کے بعد دریائے جہلم کے کنارے فتح کدل کی ایک نادر طرز کی بڑی عمارت میں اسے منتقل کیا گیا، جس کی باقیات آج بھی یادگار زمانہ ہیں۔[1] عیسائی مشنریوں کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ عورتوں کو زیورِ تعلیم، آراستہ کیئے بغیر سماجی زندگی میں تبدیلی کے امکانات تاریک ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس امر کی طرف بھی توجہ کی۔ مِس چرچل ٹیلر، مِس سٹبّس مسِ گوڈال اور مِس فِٹ زے Miss Churchil Taylor, Miss Stubbs, Miss Goodal and Miss Fitze) کا شمار اُن ممتاز خواتین مشنریوں میں ہوتا ہے جنہوں نے کشمیر میں تعلیم نسواں کو مقبول بنانے میں نُمایاں اور کلیدی رول ادا کیا۔

مِس میلنسن کی عملی دلچسپی کی وجہ سے سی۔ ایم۔ ایس سکول ۱۹۲۲ء سے ۶۲ء کے دوران انقلاب آفرین تبدیلیوں سے ہمکنار رہوا، جب وہ اس کے صدر مدرس (Principal) کی حیثیت سے اپنے فرائض مستحسن طریقہ سے انجام دیتی رہیں[2]۔ کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ مس میلنسن نے بجاطور پر

---

[1] نئے فتح کدل پُل) کی تعمیر کے ساتھ ہی اس سکول کی پوری عمارت کو نیلام کر دیا گیا اور بعدازاں ٹھیکدار صاحب نے اینٹیں پتھر اور لکڑی کے حصول کے لئے اسے گرانا شروع کیا۔ اس طرح سکول کی بنیادیں تک کھودی گئیں اور آج اس جگہ ایک ویران سے وقطعۂ زمین کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

[2] یہاں اس بات کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا کہ گرلز سکول بھی بائز سکول کے ہی قریب محلہ ملک یار میں برلب جہلم ایک وسیع قطعۂ زمین پر تعمیر کیا گیا تھا جسے ایک زمانہ میں چک باغ اور ملک باغ بھی کہا جاتا تھا۔ سکول کی تعمیر کے وقت اس قطعۂ زمین کے مالکانہ صاحب زادہ خاندان کو حاصل تھے۔ مالکانِ زمین سے طے پایا تھا کہ سکول کی منتقلی کی صورت میں سکول کی عمارت کے ملکیتی حقوق بھی اُنہی کو حاصل ہوں گے۔ چنانچہ سکول کی عمارت ایل شیپ (L.shape) میں بنائی گئی ہے اس کے صحن میں ایک اچھا خاصا تالاب بھی تھا۔ کافی عرصہ گزرنے کے بعد مالکان زمین نے کرائے میں اضافے کی مانگ کی۔ چنانچہ معاملہ کورٹ کچہری تک جا پہنچا۔ ادھر سکول کے منتظمین کو لگا کہ اب طالبات کی تعداد بڑھتی ہی چلی جارہی ہے اور سکول کی عمارت میں حسب منشاء توسیع کی گنجائش بھی نہیں تو مذکورہ سکول کو بسکو سکول کے پاس ہی شیخ باغ منتقل کیا گیا۔ اور سکول کی عمارت مالکان زمین کو بعوض پانچہزار روپے دیدی گئی۔
مذکورہ سکول عمارت تادمِ تحریر اسی حالت میں موجود ہے سوائے عمارت کے ایک حصے کے جو برلب دریا واقع تھی۔ اور خستہ حالت میں تھی۔ چنانچہ موجودہ مالکان (صاحب زادہ صاحبان) نے اسے گرادیا اور اسکی جگہ آجکل ایک سہ منزلہ عمارت وجود میں آچکی ہے۔ اسطرح تالاب کو بھی بھر دیا گیا۔

کشمیری عورتوں کے تعلیمی اور تہذیبی ارتقاء کے لئے اہم رول ادا کیا۔ اُس کی ذات کے بغیر یہ دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ اُس کی مؤثر اور متحرک رہنمائی میں یہ مؤقر ادارہ ثقافتی اور تمدنی سرگرمیوں کا محور و مرکز رہا۔ اُس نے تعلیمی نصاب میں تیراکی، رقص، کسرت، گُل گشت، کوہ پیمائی وغیرہ جیسی مہم بازیوں کو شامل کردیا۔ کسی گُل گشت کے دوران لڑکیوں کا کہیں گھر سے باہر قیام پر آزادی سے اِدھر اُدھر گھومنے کا منظر نہایت ہی مسرت آمیز اور فرحت افزا ہوتا تھا۔ اِس طرح کوہ پیمائی کی پہلی مہم کا اہتمام ۱۹۳۸ء میں ہوا جب ۴۰ (چالیس) کے قریب طالبات نے مہادیو کوہ پیمائی مہم میں شامل ہونے کے لئے تحریری اجازت مانگی۔ گرل گائیڈ تحریک نے لڑکیوں کے ایک دوسرے کی خاطر جینے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی طرف نہ صرف راغب کیا بلکہ ان میں ایسا کرنے سے احساسِ ذمہ داری، عزتِ نفس اور ضبطِ نفس کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔

انگریزی، اُردو، فارسی، ریاضی، معلوماتِ عامہ اور مطالعہ فطرت جیسے مضامین شامل نصاب تھے ۱۹۴۴ء میں ہندی کی پڑھائی بھی شروع ہوئی اور ۱۹۴۷ء میں سائینس کی تعلیم کو رائج کیا گیا جبکہ طالباب کے کسی اور سکول میں یہ مضمون نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ کپڑے دھونے، کھانا پکانے، کے ساتھ ساتھ ٹوکریاں بنانے اور سوزن کاری و دیگر دستکاریوں کی طرف بھی توجہ دی جاتی تھی۔

یہ سب انقلابی تعلیمی، سماجی اور سیاسی لحاظ سے دوررس اقدام بے انتہا دقتوں کا سامنا کرنے کے بعد ہی ممکن ہوئے۔ ایک طرف سے عوام کی جہالت و توہم پرستی کا مقابلہ جاری تھا تو دوسری جانب ڈوگرہ حکومت کی عدم توجہی سب سے بڑی رُکاوٹ بنی تھی کیونکہ علم کی روشنی سے عوام کی سیاسی بیداری کی شروعات ہوتیں جو ہر حکمران طبقہ کے لئے ہر دور میں سب سے بڑا

خطرہ تصور ہوتی آئی ہے۔ اس لحاظ سے مِس میلنسن کا کام تعلیم نسواں کے میدان میں بالخصوص تاریخ ساز بھی تھا اور انقلاب آفریں بھی۔ ان خدمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ مِس میلنسن کے تئیں خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے بجاطور پر یوں رقمطراز ہیں:

''مِس میلنسن کی حیثیت ریاستِ جموں کشمیر میں تعلیم نسواں کے میدان میں ایک پیشرو کی ہے۔ اُس نے اکتوبر ۱۹۲۲ء سے نومبر ۱۹۶۲ء تقریباً چالیس سال تک کشمیر میں قیام کیا۔ اس عرصہ کے دوران اُس نے کشمیریوں سے والہانہ محبت کی اور اُن کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کام کیا جس کے نتیجہ میں کشمیریوں کے دلوں میں بھی اُس کی جگہ بنی رہی۔

اُس کے وُرودِ کشمیر کے وقت یہاں ایک بھی خاتون استاد کا وجود نہ تھا۔ تعلیم نسواں بالخصوص اکثریتی فرقے کی نظر میں ایک شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُس کی بے پناہ لگن جو وہ عورتوں کی فلاح کے لئے رکھتی تھی طالبات کو سکول جانے اور جدید زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کی موجب بنی۔ میری اپنی بڑی بڑی بیٹی مِس میلنسن کے سایہ عاطفت ہی میں زیور تعلیم سے آراستہ ہوئی۔

اُسے نہ صرف تعلیم نسواں کے اعلیٰ آدرش سے لگاؤ تھا بلکہ وہ خواتین کی سماج میں برتری کو بھی عزیز رکھتی تھی۔ وہ کم سن شادی کے خلاف سینہ سپر ہوئی اور عورت کو عزت و وقار کا مقام دلانے میں ہمہ تن جُٹ گئی۔

اُس نے عورت کے بارے میں رائج کئی سماج تعصّبات اور اُن مصائب کے خلاف لڑا۔ جن میں یہاں کی خواتین مُبتلا تھیں۔ یہاں کی عورتیں گھر سے باہر آکر کھلی ہوا میں سانس نہیں لے سکتی تھیں۔ مِس میلنسن ہی نے گرل کیمپوں کا اہتمام کر کے طالبات کو گھر کی چار دیواری سے باہر

نکالا۔ وہ خود بھی ریاست کے گرل گائیڈ کمشنر (Girl Guide Commissioner) کے منصب پر فائیز رہی۔

مِس میلنسن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مُنکسر المزاج تھی اور ساتھ ہی تدبر، تحمل کا پیکر بھی۔ اُس کی رگوں میں انسانی خوٗن رواں دواں تھا لیکن وہ عمل کے جوش وجذبہ سے بھی مملوٗ تھی۔ جہاں وہ نوخیز طالبات پر محبت و شفقت کی بارش کرتی تھی وہاں وہ اُن کے لئے نظم وضبط کی بھی بڑی پابند تھی۔ جب وہ پہلی بار سرینگر آئی تو فتح کدل کے گرلز سکول کی نوعیت نہایت معمولی تھی۔ اُسی کی شفقت ونگہداشت میں وہ پروان چڑھا۔ جب بھی میں مِس میلنسن کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے سامنے ایک سائیکل سوار خاتون کی شبیہ اُبھرتی ہے جو نہایت انکسار ور عاجزی کے ساتھ گھر گھر گھومتی ہے اور لوگوں کو تعلیم نسواں کی طرف راغب کرتی۔

مِس میلنسن سے اعلےٰ وادنےٰ سب کشمیری والہانہ محبت کرتے تھے اُس کے بارے میں عام طور یہی کہا جاتا ہے کہ یہاں کے ذی حشم لوگ سڑک پر جاتے ہوئے اپنی کاریں روک، نیچے اُتر کر آداب بجالاتے۔ وہ چوراہے پر تعینات پولیس سپاہی سے بھی ملتی اور اُس سے گھر کے حالات پوچھ لیتی۔ وہ کئی بار ہمارے گھر آئی۔ کیونکہ میری ایک دختر بھی اُس کے سکول میں پڑھتی تھی۔ میں بھی اُن خوش بخت لوگوں میں سے ہوں جن کو انگلستان میں مِس میلنسن سے اُسکی زندگی کے آخری ایام میں ملنے کا اِتفاق ہوا۔ وہ اپنے قیامِ کشمیر کی یادتازہ کرتی تھی اور سادہ دِل مہمان نواز کشمیریوں کے بارے میں رطب اللسان تھی۔ ہم اُسکے بڑے احسانمند ہیں۔،،

مِس میلنسن جون ۱۹۸۰ء میں اس دارِفانی کو چھوڑ کر چلی گئی لیکن

اُس کی حیاتِ مستعار کے کارنامے کشمیری عوام خصوصاً کشمیری خواتین کے دلوں پر تاابد نقش بر سنگ رہیں گے۔

ایک سے مسافر ہیں
ایک سا مقدّر ہے
میں زمین پر تنہا
اور وہ آسمانوں میں !

(پروین شاکر)

☆

کتابیات:

☆ ہسٹری آف سرینگر ۱۹۴۶ء۔ ۱۹۴۷ء ڈاکٹر محمد اسحاق خان۔

☆ کشمیر ان سنلائٹ اینڈ شیڈ، ٹِنڈل بسکو۔

☆ کرسچیئنٹی ان جموں اینڈ کشمیر، ص ۳

☆☆☆

# تعمیر انتخاب نمبر!

حالیہ ایام میں ریاست جموں وکشمیر کی سرکاری سرپرستی میں شائع ہونے والے کشمیری اور اُردو، رسائل وجرائد کے خصوصی شماروں کا اجرا ہوا۔ یہ منتخب شمارے بلاشبہ ریاست کی ادبی، ثقافتی اور تمدنی زندگی کے پچاس سالہ عرصے کو اپنے محدود دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ سمندر کو، کوزے میں بند کرنے کی یہ مستحسن کاوشیں قابل صد ستائش ہیں، جنہیں ریاست میں کشمیری اور اُردو ادب ثقافت کا جامع مگر مختصر قاموس قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں اولاً ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی زیرنگرانی دوماہی ''شیرازہ'' کشمیری اور ماہنامہ شیرازہ اُردو کا اجرا سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ثانیا نظامت اطلاعات کی جانب سے دوماہی کشمیری جریدہ ''آلو'' (جنوری۔اپریل ۱۹۹۹ء) کا جاری ہونا بھی ایک اہم ادبی اور تاریخی واقعہ ہے۔ سب سے بڑی اور قابلِ توجہ بات یہ کہ یہ سبھی جرائد عمدہ طباعت وزیبائش سے آراستہ ہیں لیکن یہاں بھی ''آلو'' اور ''تعمیر'' کے منتخب نمبر

کئی لحاظ سے بازی جیت چکے ہیں جس کے لئے نظامت اطلاعات اور انکے فاضل مدیران جناب محی الدین ریشی اور جناب غلام رسول بڈانہ (آزاد) قابل صد مبارک ہیں نظامت اطلاعات کے موجودہ ناظم اور صائب الرائے سربراہ جناب کے۔ بی جنڈیال (آئی۔اے۔ایس) بالخصوص اس لئے لائق صد ستائش وسپاس ہیں کہ اُنکی نگرانی میں کشمیری دوماہی ''آلو'' اور اُردو دوماہی رسالہ ''تعمیر'' کو احیائے نو نصیب ہوا اور انکی اعتباریت ومعنویت میں نامسائد اور حوصلہ شکن حالات میں قابل ذکر اضافہ ہوا۔ اللہ کرے کہ انکا یہ کاروبار شوق پائندہ ودرخشندہ رہ کر یہ روح پرور اور حیات افزا روایت قائم دائم رہے۔

زیر نظر تعمیر کا انتخاب نمبر اگست۔ستمبر ۱۹۹۹ء کا خصوصی شمارہ ہے جس کی ضخامت چارسو بائیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جو کسی بھی لحاظ سے کم نہیں بلکہ وقیع اور وسیع بھی ہے

مضامین کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جو اسطرح ہیں۔

۱۔ کشمیر کی تاریخ وتہذیب

۲۔ کشمیر کی مذہبی اور صوفیانہ روایات

۳۔ کشمیر میں اُردو، زبان وادب

۴۔ تخلیقی ادب، شاعری، افسانہ، انشائیہ

۵۔ ریاست کی علاقائی زبانیں اور ادب

۶۔ فن اور شخصیت

۷۔ فن اور ثقافت

۸۔ جموں وکشمیر میں تعمیر وترقی

ابتدائیہ: اے وادیٔ کشمیر اور تعمیر ایک جائیزہ عنوانات کے تحت آنے والے رشحات نوین لیکن اولین باب کی حیثیت سے اہم ہیں جسمیں نہایت ہی عمدہ طریقہ سے نہ صرف تعمیر کی وقیع ادبی خدمات کو بڑے اچھے پیرایے میں اُجاگر کیا گیا بلکہ زیر تبصرہ انتخاب نمبر کے مدعا و مقصد کو مختصر، جامع اور تیکھے انداز میں محترم قارئین کے سامنے رکھا گیا ہے۔ جنتِ ارضی کشمیر کے حُسن فراواں کی نقاب کشائی مخمور سعیدی نے اپنی نظم ''اے وادیٔ کشمیر'' میں کی ہے۔ جس کا انتخاب برمحل بھی ہے معتبر بھی۔ مضامین کے تنوع کے اعتبار سے تاریخ، ثقافت و ادب کی مبادیات، مذہبی وروحانی روایات، لسانیات، جمالیات، صحافت، شاعری، افسانہ نگاری، انشاء پردازی، ریاست کی لسانی اور تہذیبی اکائیوں، شخصیات، فنون لطیفہ اور تعمیر و ترقیات کو اس انتخاب نمبر میں بڑی چابکدستی سے سمونے کی کوشش کی گئی ہے اس انتخاب میں ریاست اور بیرون ریاست کے معتبر اہل قلم فاضل مقالہ نگار، نقاد، سخن ور اور سخن شناس، شعراء، اور ادباء کی تحریرات وارشادات پڑھنے کو یکجا ملیں گی۔ نظر انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ اُس محنت شاقہ کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے جس کے مختلف مرحلوں سے ارکان ادارت کو گزرنا پڑا ہوگا۔ نامساعد حالات میں مضامین، مقالات، شعری وادبی تخلیقات کا انتخاب، نئے مطلوبہ مضامین کے حصول کے لئے قلمی معاونین کی تلاش، تزئین و آرائش و دیگر طباعتی مراحل سبھی ژرف نگاہی، ثابت قدمی اور طمانیت قلب کے متقاضی ہیں ورنہ عُجلت بے جا میں یہ سارا مستحسن کام ضرور بگڑ جاتا۔ انتخاب مضامین میں تینوں خطوں جموں، کشمیر اور لداخ کو حتی المقدور نمائندگی دی گئی ہے۔ تینوں خطوں کی اہم لسانی تہذیبی، ادبی جغرافیائی اور

معاشرتی اکائیوں کا یکجا کرنے کا کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

ایسی مؤلفانہ کوششیں کبھی بھی حرف آخر کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ان میں ہمیشہ ترمیم واضافے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔یہی بات زیر نظر خصوصی شمارے پر بھی صادق آتی ہے جس کا اعتراف مؤقر ادارے نے اپنے ابتدائیہ میں نہایت ہی بلیغ انداز میں کیا ہے۔رسا جاودانی،عبدالاحد آزاد،ریاست میں مصوری کی روایات لوک ادب،لوک گیت جیسے دیگر چند ایسے اہم مضامین اِس انتخاب میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔جس کی شاید سب سے بڑی وجہ یہ رہی ہو کہ یہ انتخاب بہر صورت تعمیر کے تینتالیس سالہ اشاعتوں کا انتخاب تھا جسمیں شاید یہ اور اس جیسے دوسرے مضامین گذشتہ اشاعتوں میں شامل نہ رہے ہوں۔پھر بھی اُمید کی جانی چاہیے کہ ان جیسی دوسری کوتاہیوں کا ازالہ بھی تعمیر کے آنے والے شماروں میں ضرور کیا جائے گا جس سے اس رسالہ کی ساکھ میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔یہ بات ضرور ہے کہ معتبر قلمی معاونین کی کمی ہے لیکن کوشش جاری رکھی جائے تو کبھی نہ کبھی آبدار موتی ہاتھ آہی جاتے ہیں۔اس ضخیم انتخاب میں ریاستی کلچر کے مقامی رنگوں کو برقرار رکھا گیا ہے اور زیادہ تر قلمی معاونین ہماری اپنی ریاست کے باشندے ہیں جس سے اِسکی انفرادی اعتباریت میں اضافہ ہوتا ہے اور اِسے بیرون ریاست ہمارے ایک معتبر ادبی،ثقافتی اور تہذیبی سفیر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے گو کہ اِسکا پیکر الفاظ کی خاموش مگر بولتی تصویروں اور لہروں میں پوشیدہ ہے۔

موجودہ عہد تکنیکی اعتبار سے رو بہ ترقی ہے اور ہر شعبہ میں خصوصی مہارت کو ترجیح دی جاتی ہے۔جس سے کم وقت میں کم محنت کا ثمرہ زیادہ ہوتا ہے

مطلب یہ کہ قلیل جسمانی محنت کے ساتھ ساتھ ماہرانہ اہلیت اور ذہنی قابلیت پر زور دیا جاتا ہے جس کے پیش نظر ایسے تخلیقی، ثقافتی، ادبی اور صحافتی منتخبات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جس کے لئے آنے والے محقق اور تہذیب شناس مرتبین و منتظمین کو دُعائیں دینگے جنکی عمدہ کاوشوں سے ایسے نمائندہ انتخاب کی ترتیب واشاعت ممکن ہوگئی ہو۔ بقول علامہ اقبالؒ ۔

ہر لحظ نیا طور نئی برقِ تجلےٰ
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

توقع ہے کہ تعمیر کا یہ انتخاب نمبر نہ صرف اُردو، ادبی حلقوں بلکہ کشمیری تہذیب، ثقافت اور ادب شناسوں میں مقبول ہوگا۔

☆☆☆

☆چمن لال چمن : مونوگراف ۱۹۹۸ء

☆پرتھوی ناتھ پُشپ : مونوگراف ۱۹۹۹ء

☆انگریزیس منز ہمکال ہندوستانی افسانہ : انگریزی میں ہندوستانی ہم عصر افسانہ: ترجمہ ترتیب ۱۹۹۹ء۔ ۱۸۔ مے مشہِ نہ زاہ۔ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ سوانحی ادبی مقالات: ۱۹۹۹ء۔ ۱۹۔ پوت نظر۔ بازیافت ۲۰۰۰ء ۔ ۱۹۔ ۲۷: اُردو، کشمیری فرہنگ مشترکہ ترجمہ وترتیب: ۸ جلدیں ۔ ۲۔ ۷۔ ۱۹۶۷ء ۔ ۲۸۔ کشمیری۔ کشمیری ڈکشنری جلد: ۱۔ ۲۹۔ ۳۱۔ وبتھہ آگُر : وتستا کا منبع: ۳۔ سالنامہ: برائے مرازادبی سنگم۔ ۳۰ نوُرِ آگُر ۔ نور کا ماخذ ومرکز۔ برائے مرزاادبی سنگم۔ ۳۳۔ ۴۲۔ دوماہی شیرازہ کشمیری جون ۹۴ء تاجون ۱۹۹۶ء ۔ بارہ شمارے : ۴۳۔ ۴۴ سون ادب (ہماراادب) سالنامے۔ ۴۴۔ شیرین قلم کتابت البم اکیڈیمی اسکے علاوہ اُس نے درجنوں اُردو مقالات مختلف رسایل وجرائد کیلئے لکھے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے ہندوستانی ادب انسائیکلوپیڈیا کے لئے انگریزی میں نوشتے تحریر کئے ہیں۔ پوپر حکومت کرالہ کے عالمی قاموس کے لئے بھی نوشتے لکھ چکا ہے اور ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے کشمیری مشاورتی بورڈ کا دس سال ممبر رہ چکا ہے۔ ریاست کی کئی ادبی اور ثقافتی تنظیموں کوشُر مرکز، کلچرل لیگ، کلچرل آر گنائزیشن، کاشُر محفل یاری پورہ اور مرازادبی سنگم وغیرہ کے ساتھ وابستہ رہ چکا ہے۔ دوبار (۱۹۸۹ء۔ ۱۹۸۱ء) قومی مُشاعرے میں کشمیری زبان کی نمائندگی کرچُکا ہے۔ اڑیہ زبان کے ادبی رسالے ورنہ مالا اور پنجابی ساہتیہ سبھا جموں دیگر رضا کار تنظیموں نے اُنہیں اعزازی خلعت عطا کئے ہیں۔

مئی ۱۹۶۷ء میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی ملازمت اختیار کرنے سے پہلے وٹرنری سٹاک اسٹنٹ کی حیثیت سے فرائض منصبی انجام دے چکا ہے۔ اکیڈیمی میں تیس سالہ ملازمت کے دوران کئی ذمہ دار عہدوں پر کام کرنے کے بعد ۱۹۹۶ء میں ایڈیٹر کشمیری کی حیثیت سے سبکدوش ہوا۔ آج بھی ناسائند حالات کے باوجود تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی اور زبان وادب کے مطالعہ کا مقدس شغل جاری رکھے ہوئے ہے۔ اللہ کرے ذوقِ نظر اور زیادہ!۔

# RASH – HAATI – AIYAAM

## A COLLECTION OF URDU ARTICLES

## ON AND ABOUT

## KASHMIRI LITERATURE AND CULTURE

**BY**

**SYED RASOOL POMPUR**

**55 – SICOP ROAD BIJBEHARA**
**KASHMIR - 192124**

Printed at J.K. Offset Printer, 315, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-110006